فتاویٰ
یوسف القرضاوی
(جلد اول)
علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی

فتاویٰ

یوسف القرضاوی

مصنف

علامہ یوسف القرضاوی

مترجم

سیّد زاہد اصغر فلاحی

البدر پبلی کیشنز

23 راحت مارکیٹ' اُردو بازار' لاہور

فون: 042-37225030-37245030-0300-8485030

☆ نام کتاب — فتاویٰ یوسف القرضاوی

☆ مصنف — علامہ یوسف القرضاوی

☆ مترجم — سیّد زاہد اصغر فلاحی

☆ ناشر — علی سعید

☆ اشاعت — جنوری 2012ء

☆ مطبع — علی اعجاز پرنٹرز لاہور

☆ ہدیہ — -/300 روپے

فہرست

قرآنی آیات

احادیث

عقائد

طہارت اور نماز

زکوٰۃ اور صدقات

روزہ اور صدقۃ الفطر

حج اور عمرہ

تیوہار اور عید

قسموں اور منتوں کے مسائل

عورت اور خاندانی مسائل

اجتماعی معاملات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

علامہ یوسف القرضاوی عالمِ اسلام کی نمایاں اور قد آور شخصیت ہیں۔ ہمارے اس دور کے چند ممتاز اور معروف علماء دین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کی علمی کاوشوں کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی مقبولیت عطا کی ہے۔ ان کی تصنیفات کے ترجمے دنیا کی بڑی زبانوں میں پڑھے جا رہے ہیں۔ ان کے علم میں گہرائی اور نظر میں وسعت پائی جاتی ہے۔ وہ دورِ جدید کے حالات، مسائل اور پیچیدگیوں سے واقف ہیں اور اسلام کی روشنی میں ان کا حل پیش کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیا ہے اور علمی سطح پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام بہترین نظامِ حیات ہے۔ وہ ہمارے تمام مادی، اخلاقی اور روحانی تقاضوں کو بہتر طریقہ سے پورا کرتا ہے۔ وہ دنیا اور آخرت کی فلاح کا ضامن ہے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اسلامی تعلیمات کی تشریح کی ہے، بلکہ ان کی معنویت اور معقولیت کو ثابت کیا ہے۔

ان کا ایک میدان فقہ بھی ہے۔ وہ کسی فقہی مکتبِ فکر کے پابند نہیں ہیں۔ وہ پورے فقہی ذخیرہ سے استفادہ کرتے ہیں اور جس فقہی رائے کو کتاب وسنّت سے ہم آہنگ پاتے ہیں، اسے ترجیح دیتے ہیں۔ اس کے اختیار کرنے اور اسے پیش کرنے میں انہیں کوئی تامّل نہیں ہوتا۔ کہیں کہیں ان کے ہاں اجتہادی رنگ بھی نظر آتا ہے۔ فقہی مسائل میں ان کے ہاں تشدد نہیں ہے۔ ان کا رجحان یہ ہے کہ شریعت نے کسی مسئلہ میں آسانی یا سہولت فراہم کی ہے تو اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ سختی اور تنگی کی راہ نہ اختیار کی جائے۔ ان کی تحریریں اس خیال کی تردید کرتی ہیں کہ دین ناقابلِ عمل ہے۔ انہوں نے یہ ثابت

کرنے کی کوشش کی ہے کہ دین میں حالات وظروف کی پوری رعایت ہے اور ہر دَور میں اس پر آسانی سے عمل ہوسکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ہر جدید رجحان کا ساتھ دیتے ہیں۔ انہوں نے غلط افکار اور غیر فطری رجحانات پر جرح وتنقید کی ہے اور ان کے اثراتِ بد کو نمایاں کیا ہے۔

پیشِ نظر کتاب ان کے فتاویٰ کی پہلی جلد ہے۔ میں نے یہ کتاب جستہ جستہ دیکھی ہے۔ ان کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ اپنا نقطہ نظر بہت صاف اور واضح الفاظ میں پیش کرتے ہیں، اس لئے اس کے سمجھنے میں کوئی دقّت محسوس نہیں ہوتی۔ ان کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ جو بات کہتے ہیں بالعموم دلائل کے ساتھ کہتے ہیں۔ کہیں کہیں انہوں نے صرف اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے۔ دلائل نہیں دیئے ہیں۔ ہوسکتا ہے انہوں نے اپنی دوسری تصنیفات میں دلائل دیئے ہوں۔ اس کا بھی امکان ہے کہ انہوں نے کبھی دلائل کی ضرورت نہ محسوس کی ہو۔

فقہی رایوں میں اختلاف کی گنجائش رہتی ہے۔ علاّمہ قرضاوی کی رایوں سے بھی اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود کتاب بڑی قدر وقیمت کی حامل ہے۔ اس کی حیثیت ایک مستند عالمِ دین کے فتاویٰ کی ہے۔ ان کا نقطہ نظر اور ان کے دلائل بہر حال قابلِ غور ہیں۔

ہمارے سامنے کتاب عربی سے ترجمہ ہو کر آئی ہے۔ اصل کتاب سے ترجمہ کے موازنہ کا موقع نہیں ملا لیکن ترجمہ آسان زبان میں اور رواں ہے۔ اردو داں طبقہ کے لئے اس سے استفادہ میں کوئی دقت نہیں محسوس ہوگی۔ مرکزی مکتبہ اسلامی نے یہ کتاب شائع کر کے ایک مفید خدمت انجام دی ہے۔ مترجم اور ناشر دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں۔

خاکسار

سیّد جلال الدّین عمری

۳۱ر جولائی ۱۹۹۰ء

عرض مترجم

علاّمہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی قد آور شخصیت سے کون واقف نہیں ہے۔ موصوف علمِ حدیث وفقہ کے ایک پُر بہار عالم ہیں۔ وہ ایک طویل مدّت سے دوحہ (قطر) میں افتاء کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

اس طرح سے یہ دیارِ قطر کی خوش نصیبی ہے کہ علاّمہ قرضاوی ایک زمانے سے یہاں مقیم ہیں اور یہاں عوام وخواص کو ان سے علمی استفادے کا بھرپور موقع مل رہا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں بھی ان خوش نصیبوں میں شامل ہوں۔

قطر ٹی وی کافی عرصہ سے ایک پروگرام بعنوان ''ھدی الاسلام'' پیش کر رہا ہے، جس میں علاّمہ لوگوں کے فقہی مسائل کا جواب پیش کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے، علمی حلقہ کے زبردست اصرار پر علاّمہ نے ان سوالات کو مرتّب کر کے کتابی صورت میں بعنوان ''فتاویٰ معاصرۃ'' (ہم عصر فتوے) پیش کیا ہے۔ بقول ان کے' انہوں نے اس کتاب میں ان اہم مسائل کو بھی شامل کر لیا ہے جو ھدی الاسلام میں نہیں پوچھے گئے تھے بلکہ اس پروگرام سے قبل دیگر موقعوں پر پوچھے گئے تھے۔ جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے اس میں بیشتر سوالات وہ ہیں جو عصرِ جدید کے دماغ میں آتے رہتے ہیں اور پوچھنے والے ان کا جواب عہدِ جدید کے تقاضوں اور ماحول کے لحاظ سے چاہتے ہیں۔ علاّمہ قرضاوی کا منطقی طرزِ جواب جدید ذہنوں کے لئے کافی حد تک تسلی بخش ہے۔ اس کتاب کے دو اجزاء ہیں پہلے جز کا ترجمہ پیشِ خدمت ہے۔ امید ہے کہ جلد ہی دوسرے جز کے ترجمہ کا کام بھی شروع کردوں گا انشاء اللہ جیسا کہ علاّمہ نے خود ہی مجھ سے اس کی خواہش

ظاہر کی ہے۔

اس موقع پر میں ایک اہم بات ان اسباب کے بارے میں بتانا چاہوں گا جن سے مجھے اس کتاب کے ترجمہ کی تحریک ملی۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے علامہ قرضاوی کو جتنا پڑھا اور جتنا سنا ہے' میں نے انہیں ہر مسئلہ میں انتہائی معتدل اور ہر قسم کے اِفراط وتفریط سے پاک رائے کا حامل پایا ہے۔ علامہ کی ہر رائے انتہائی مدلّل اور منطقی ہوتی ہے۔ ان کا استدلال براہِ راست قرآن اور حدیث سے ہوتا ہے۔ اسلاف کے اقوال سے اپنی رائے کو تقویت تو پہنچاتے ہیں، لیکن انہیں بطورِ دلیل نہیں پیش کرتے۔ علامہ تمام مسائل میں صرف قرآن اور حدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ مسلکاً حنفی ہونے کے باوجود نہ مکمل طور پر فقہ حنفی کی طرف ان کا رجحان ہے اور نہ دوسرے مسالک سے اجتناب ہے۔ جو رائے قرآن وحدیث سے قریب تر ہوتی ہے اس کو اپناتے ہیں۔ ان کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ مسائل کے حل کے وقت سوال کرنے والے کے حالات اس کی پریشانیوں اور دورِ حاضر کے جملہ احوال ومسائل کی رعایت ضرور کرتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ بیسویں صدی کے انسان کو دسویں صدی کے حالات کے لحاظ سے جواب دیں اور یہ سب کچھ اللہ کے رسول ﷺ کی اقتدا میں ہے کہ خود حضور ﷺ مسائل کے حل کے موقع پر موجودہ حالات اور خود سوال کرنے والے کے حالات کی ضرور رعایت کرتے تھے۔ مثال کے طور پر اس اعرابی کا قصہ پڑھ لیجئے جس نے ماہِ رمضان میں روزے کی حالت میں اپنی بیوی سے جماع کرلیا تھا۔ اس نے اپنا مسئلہ حضور ﷺ کے سامنے پیش کیا اور یہ بھی بتایا کہ نہ تو وہ کسی قسم کا کفارہ ادا کرنے کی پوزیشن میں ہے اور نہ ہی مسلسل ساٹھ روزے رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ حضور ﷺ نے اس کی حالت کی رعایت کرتے ہوئے اسے کفارہ اور ساٹھ روزوں دونوں سے چھوٹ دے دی' بلکہ ہنستے ہوئے وہ کھجوریں بھی دے ڈالیں جو کسی نے ہدیہ کے طور پر حضور ﷺ کو پیش کی تھیں۔

علامہ قرضاوی کے جوابات میں نہ تشدد کا رنگ شامل ہوتا ہے اور نہ سہل پسندی کی

روش۔ علامہ نے ہر مسئلہ میں اعتدال کا موقف اپنایا ہے۔ جس مسئلہ میں قرآن وحدیث نے تاکید کی ہے وہاں علامہ کا موقف بھی سخت ہے اور جہاں گنجائش کی صورت ہے وہاں رخصت سے فائدہ اٹھانے میں دریغ نہیں کرتے۔ کیونکہ یہی حضور ﷺ کی سنت تھی اور اس پر حضور ﷺ کا عمل تھا۔ حضور ﷺ فرماتے تھے

مَا خُيِّرْتُ بَيْنَ أَمْرَيْنِ إِلَّا اخْتَرْتُ أَيْسَرَهُمَا۔

مجھے جب بھی دو باتوں کے درمیان اختیار دیا گیا میں نے ہمیشہ ان میں کا آسان پہلو اختیار کیا ہے۔

اعتدال پسندی کے متعلق حضور ﷺ کا فرمان ہے:

خَيْرُ الْأُمُوْرِ أَوْسَطُهَا

بہترین بات وہ ہے جو معتدل ہو۔

حضور ﷺ کی ان تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے علامہ قرضاوی ہر مسئلہ میں معتدل اور قدرے نرم اور قابلِ عمل پہلو کو ترجیح دیتے ہیں۔ جواب دیتے وقت موجودہ دور کے حالات اور ضرورتوں کی بھی رعایت کرتے ہیں۔ ان اوصاف کی وجہ سے ان کے فتووں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کی زبردست افادیت کے پیشِ نظر بعض احباب نے مجھ سے اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ میں انہیں اردو داں طبقہ کے لئے اردو میں منتقل کروں۔ میں بھی ان ہی خطوط پر غور کر رہا تھا۔ چنانچہ اللہ کا نام لیا اور اس ضخیم کتاب کو اردو میں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ مجھے توقع ہے کہ برصغیر کے مسلمان اس کاوش سے کماحقہٗ استفادہ کر سکیں گے۔

ترجمہ کے وقت میں نے چند باتوں کی رعایت ضروری سمجھی ہے، مثلاً یہ کہ ترجمہ نہایت مختصر مگر مکمل ہو، زبان سلیس مگر آسان اور عام فہم ہو تاکہ استفادہ کا دائرہ کار عوام تک پہنچ سکے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ ترجمہ برصغیر کے مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہو گا اس لئے میں نے ان مسائل کا ترجمہ حذف کر دیا جن کا تعلق برصغیر کے مسلمانوں سے

نہیں ہے یا جو سوالات بالکل عام قسم کے ہیں اور ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو قابلِ ذکر ہو۔ تاہم ان سوالات کی تعداد نہایت قلیل ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ ترجمہ قارئین کے لئے مفید ثابت ہو اور یہ کاوش میرے لئے باعثِ اجر و ثواب ہو۔

والسّلام

سیّد زاہد اصغر فلاحی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

ان الحمد لِلّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونعوذ باللّٰہ تعالٰی من شرور انفسنا وسیأت اعما لنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہٗ ومن یضلل فلا ھادی لہ واشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریك لہ واشھد ان محمدًا عبدہ ورسولہ.

رب اشرح لی صدری ویسرلی امری واحلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی اللھم یا معلّم اٰدم وابراھیم علمنا ما ینفعنا وانفعنا بما علمتنا وزدنا علما "سبحانك لاعلم لنا الا ما علمتنا، انك انت العلیم الحکیم، اللھم ارنا الحق حقًا وارزقنا اتّباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ

اما بعد!

اللہ کے فضل وکرم سے میں ایک مدتِ دراز سے فتویٰ نویسی کی خدمت انجام دے رہا ہوں۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے میں نے خطبہ جمعہ اور تدریس کا کام شروع کر دیا تھا۔ چوں کہ خطبات اور دروس کے بعد بالعموم لوگ مجھ سے مختلف قسم کے فقہی سوالات کیا کرتے تھے اور میں اپنی حیثیت وبساط کی حد تک ان کے جوابات دیا کرتا، اس وجہ سے اسی زمانے سے مجھ میں فقہی مسائل سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اگر چہ میں نے ازہر یونیورسٹی کے اصول الدّین فیکلٹی سے فراغت حاصل کی ہے، جس میں فقہ اور اصولِ فقہ کی باقاعدہ تعلیم نہیں ہوتی ہے، تاہم شرعی وفقہی امور میں درک پیدا کرنے کی لگن مجھ میں ہمیشہ رہی

ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اصول الدّین فیکلٹی میں تاریخ وفلسفہ اور اسلامی تہذیب وثقافت کی تعلیم میرے لئے کافی نفع بخش ثابت ہوئی۔

میں اسے اللہ کی نعمت تصوّر کرتا ہوں کہ میں شروع ہی سے کسی ایک مسلک کی تقلید، شخصیت پرستی اور مسلکی تعصب کا شکار نہیں رہا۔ حالانکہ میری تعلیم حسبِ روایت حنفی مسلک کی بنیاد پر ہوئی ہے۔ تقلید وتعصّب سے میرے دور رہنے کا سبب کچھ تو وہ اسلامی ماحول تھا، جس میں میری نشوونما ہوئی اور کچھ محترم حسن البنّاء شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم وتربیت۔ اس لئے کہ انہوں نے اپنی کتاب ''رسالتہ التعالیم'' میں تقلید وتعصّب سے آزاد رہنے کی تعلیم دی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سلفِ صالحین ہر بات کو کتاب وسنّت کی میزان پر تولتے تھے جو بات کتاب وسنّت کے مطابق ہوتی تھی اسے قبول کر لیتے تھے اور جو اس کے خلاف ہوتی تھی اسے رد کر دیتے تھے۔ ان کے اتباع وتقلید کا محور کتاب وسنّت تھے نہ کہ کوئی مسلک یا مکتبِ فکر۔ اس کے علاوہ برادر محترم الشیخ سیّد سابق کی معرکہ آرا کتاب ''فقہ السنۃ'' سے بھی مجھے اس اسلوب کو اختیار کرنے کی ترغیب ملی۔ اس لئے کہ مؤلّف نے تمام مسائل میں مذاہب اربعہ کی طرف رجوع کرنے کے بجائے قرآن وسنّت کو اساس بنایا ہے۔

کثرتِ مطالعہ اور طویل تجربے کے بعد میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کسی بھی فقہی مسئلے کے حل کے لئے قرآن وسنّت کی طرف براہِ راست رجوع کرنے سے نرم، لچک دار اور آسان حل نکل آتے ہیں۔ اس کے برعکس کسی بھی مسلک کی طرف رجوع کرنے سے مشکل اور متشدد پہلو سامنے آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فقہاء کرام نے مسائل کے حل میں حتّی الامکان احتیاط کی روش اختیار کی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ زیادہ احتیاط سے نرمی اور آسانی کی فضا برقرار نہیں رہتی اور اس کی جگہ مشقّت اور تنگی لے لیتی ہے۔

حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (سورہ الحج:۷۸)
اور اس نے دین کے معاملے میں تم پر کوئی سختی نہیں قائم کی ہے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ میں نے کالج کے زمانے ہی سے اپنے علاقے کے علماءِ کرام سے بعض مسائل میں اختلاف کرنا شروع کر دیا تھا' حالانکہ وہ سب عظیم المرتبت علماء تھے اور شافعی مسلک پر سختی سے عمل پیرا تھے۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ نجاست اور طہارت کے باب میں شافعی مسلک کچھ متشدد ہے۔ اس باب کے بعض مسائل میں شافعی مسلک سے اختلاف کرتے ہوئے میں نے علاقے کے لوگوں کے سامنے اپنا موقف پیش کیا، میں نے ان سے کہا کہ ہر وہ جانور جس کا گوشت حلال ہے، اس کا پیشاب اور گوبر بھی پاک ہے اور یہ کہ عورت کے چھو جانے سے وضو نہیں ٹوٹتا ہے۔ ظاہر ہے کہ میری یہ رائے شافعی مسلک کے خلاف تھی لیکن میں نے قرآن وسنّت کی واضح دلیلوں کے ساتھ اپنی بات پیش کی، شروع میں لوگوں نے کافی شور مچایا کہ ایک کم عمر نوجوان شخص اکابر علماء کی مخالفت کرتا پھر رہا ہے۔ لیکن جب میرے موقف میں لوگوں کو نرمی کا احساس ہوا اور ان کی بعض پریشانیاں دور ہوئیں تو دھیرے دھیرے لوگ میری طرف مائل ہونے لگے۔

پچاس کی دہائی میں' میں نے قاہرہ کی جامع مسجد زمالک میں خطبہ دینا شروع کیا۔ جمعے کی نماز کے بعد پابندی سے میں لوگوں کے درمیان بیٹھتا تھا، وہ مجھ سے فقہی سوالات کرتے تھے اور میں ان کے جواب دیتا تھا۔ اس دوران میرے بعض فتوے پابندی سے مختلف جرائد ومجلّات میں شائع ہوتے رہے۔ ان جرائد ومجلّات میں ''منبر الاسلام'' اور ''نور الاسلام'' کے نام سرِ فہرست ہیں۔

میں مستقل مزاجی کے ساتھ یہ ذمہ داری نبھاتا رہا اور گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ میرے علم اور تجربے میں بھی وسعت پیدا ہوتی گئی۔ چنانچہ میں نے اپنی کتاب ''الحلال والحرام فی الاسلام'' اور اس کے بعد ''فقہ الزکاۃ'' تصنیف کی۔ اب اللہ سے دعا

ہے کہ اس سلسلے کی تیسری کتاب ''تیسیر الفقہ'' بھی مکمل کرنے کی مجھے توفیق عطا فرمائے۔ الحمد للہ اس کے بعض اجزاء کی تکمیل ہو چکی ہے۔

قطر آنے کے بعد مجھے ریڈیو اور ٹی وی ہر دو سے ایک ایک پروگرام پیش کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اس پروگرام میں بھی لوگ مجھ سے فقہی سوالات کرتے اور میں ان کے جواب دیا کرتا اور اللہ کا فضل ہے کہ یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ ریڈیو قطر پر ''نور وھدایۃ'' کے نام سے پروگرام نشر ہوتا ہے اور ٹی وی پر 'ھدی الاسلام' کے نام سے۔ ان دونوں پروگراموں کی جس قدر پذیرائی ہوئی، اس پر میں اپنے مالک و خالق کا شکر گزار ہوں۔

ان دونوں پروگراموں کی زبردست مقبولیت کی وجہ سے متعدّد خیرخواہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں ان فتووں کو کتابی شکل دے کر عام لوگوں کے سامنے پیش کروں تاکہ سبھی ان سے مستفید ہو سکیں۔ ایک زمانے تک میں لوگوں کی اس خواہش کو عملی جامہ نہ پہنا سکا جس کی متعدّد وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ کیسٹ پر ریکارڈ شدہ پروگرام کو کاغذ پر منتقل کرنا کافی طویل اور محنت طلب کام ہے۔ دوسری یہ کہ ریڈیو اور ٹی وی پر جواب دینے کی زبان کچھ اور ہوتی ہے اور کتابی زبان کچھ اور۔ جو کچھ میں نے کہا اسے کتابی زبان دینا' ظاہر ہے اس کے لئے کافی وقت اور محنت درکار تھی۔

بہرحال اللہ کا نام لے کر میں نے یہ کام شروع کیا۔ مکرّر سوالات و جوابات کو حذف کیا' ان کی ترتیب درست کی۔ عبارتیں سنواریں اور مجموعی طور پر اسے قابلِ تصنیف بنایا۔ اس میں بعض وہ فتوے بھی شامل کئے جو پہلے مجلّات اور رسائل میں شائع ہو چکے تھے یا جو شائع ہونے سے رہ گئے تھے۔ اس پوری جدوجہد کے بعد یہ کتاب تیار ہوئی ہے جو آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ پہلی جلد ہے اور اللہ کی مدد شاملِ حال رہی تو اس کی دوسری جلد بھی جلد ہی پیش کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ کتاب تمام قارئین کے لئے نفع بخش ثابت ہو۔ آمین

فتوے کا طریقۂ کار

فتوے کے سلسلے میں، میں نے جو طریقۂ کار اختیار کیا ہے یا بہ الفاظِ دیگر جن اصول وقواعد کو میں نے ملحوظ رکھا ہے، وہ درج ذیل ہیں:

۱۔تقلید وتعصب سے آزادی

میں نے کبھی کسی خاص مسلک کی اندھی تقلید نہیں کی ہے۔اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فقہاء کرام کا احترام میرے دل میں نہیں ہے یا ان کی علمی حیثیت کا میں معترف نہیں ہوں۔ان کے مسلک کی اندھی تقلید نہ کرنا ان کی شان میں گستاخی نہیں ہے، بلکہ خود ان کی تعلیم پر عمل کرنا ہے۔اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک نے یہی تعلیم دی ہے کہ ہم نہ ان کی تقلید کریں اور نہ غیروں کی بلکہ ہم ان ماخذ ومصادر سے استفادہ کریں جہاں سے انہوں نے استفادہ کیا ہے یعنی قرآن اور حدیث سے۔

تقلید سے آزاد ہونے کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ غیر مقلد بھی علم واجتہاد کے اسی درجے پر فائز ہو جس پر سلفِ صالحین تھے۔البتہ چند شرائط لازمی ہیں:

الف: کسی مسئلے میں کسی رائے کو بغیر کسی مضبوط دلیل کے اختیار نہ کرے۔یہ کہنا کافی نہیں ہوگا کہ فلاں عالمِ دین نے ایسا فرمایا ہے۔

ب: اس کے اندر اتنی استطاعت ہو کہ مختلف آرا کا موازنہ کر سکے اور دلیل کی بنیاد پر کسی ایک رائے کو ترجیح دے سکے۔ترجیح کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کون سی رائے قرآن وسنّت سے زیادہ قریب اور مصالحِ عامہ کے اعتبار سے زیادہ نفع بخش ہے۔

ج: اجتہادِ کلی پر قادر نہ بھی ہو تو کم از کم اجتہادِ جزئی پر قادر ہونا ضروری ہے۔یعنی جو مسئلہ درپیش ہے، اس میں اجتہاد پر قادر ہو اور اس بات کی اہلیت ہو کہ درپیش مسئلے کو اس سے مشابہ دوسرے مسائل پر قیاس کر سکے۔اس میں قرآن وحدیث کی کوئی صریح دلیل نہ ہو تو عمومی دلیل کی طرف نظر کر سکے۔

۲- یَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا

(حدیث شریف) یعنی آسانی پیدا کرو، مشکل نہیں۔

میں نے مسائل کے حل میں تشدد اور سختی کا راستہ چھوڑ کر تخفیف اور نرمی کا راستہ اختیار کیا ہے۔ اس کے دو سبب ہیں:

الف: پہلا سبب یہ کہ اسلامی شریعت کا مزاج تخفیف اور آسانی کا ہے۔ اس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ بندوں کو زیادہ سے زیادہ آسانی حاصل ہو اور تنگی و سختی سے چھٹکارا ملے۔ اس سلسلے میں دلیل کے طور پر قرآن و حدیث سے متعدّد حوالے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً قرآن وضو اور تیمّم کے حکم کے بعد کہتا ہے:

مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ (المائدہ:۶)

اللہ تم پر زندگی کو تنگ نہیں کرنا چاہتا۔

سورۃ بقرہ میں مریض اور مسافر کے لئے روزے سے رخصت کے احکام کے بعد قرآن کا ارشاد ہے:

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ:۱۸۵)

اللہ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے، سختی کرنا نہیں چاہتا۔

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ۝ (النساء:۲۸)

اللہ تم پر پابندیوں کو ہلکا کرنا چاہتا ہے، کیوں کہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

سورہ حج میں اللہ کا ارشاد ہے:

هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِى الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ (الحج:۷۸)

اس نے تمہیں (اپنے کام کے لئے) چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔

یہ آیتیں ان آیتوں کے علاوہ ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے غلو فی الدین اور حلال چیزوں کوحرام کرنے سے منع فرمایا ہے۔

اس موضوع پر درج ذیل احادیث کوبطورِ دلیل پیش کیا جا سکتا ہے:

یسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا ○ (بخاری)

آسانی پیدا کرو، تنگی نہ پیدا کرواور لوگوں کو خوش خبری کی باتیں بتاؤ' بدکانے والی باتیں نہ بتاؤ۔

دوسری حدیث ہے:

انما بعثتم میسّرین ولم تبعثوا معسرین

بلاشبہ تم لوگوں کو آسانیاں پیدا کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔اس لئے نہیں بھیجا گیا ہے کہ تم تنگی پیدا کرو۔

جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عبادت میں غلو کا راستہ اختیار کیا تھا، ان کے موقف کو غلط قرار دیتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ میری سنت نہیں ہے اور فرمایا:

فمن رغب عن سنتی فلیس منی

جس نے میری سنّت سے روگردانی کی وہ مجھ میں سے نہیں۔

ب: دوسرا سبب یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں اُمتِ مسلمہ جن مشکل حالات سے دوچار ہے اوراس کا اسلام پر قائم رہنا جتنا مشکل ہے، اس سے سبھی واقف ہیں۔اس دور میں ایسے وسائل بکثرت ہیں جو مسلمانوں کو غیر اسلامی وغیر اخلاقی طرزِ زندگی گزارنے کی ہر ممکن ترغیب دیتے ہیں۔اس سخت ماحول کے پیشِ نظر علماء وفقہاء کو چاہیئے کہ وہ عوام کے سامنے دین کی باتوں کو حتی الامکان آسان بنا کر پیش کریں، مراعات اور رخصت کے پہلو کو اجاگر کریں' تاکہ دین کی طرف رغبت پیدا ہو۔اس سے بددلی نہ نہ ہو۔امامِ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلے میں امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا ایک بہت مشہور مقولہ نقل کیا ہے:

انما العلم الرخصة من الثقة اما التشديد فيحسنه كل احد

بلاشبہ علم تو یہ ہے کہ معتبر لوگوں سے رخصت حاصل ہو۔ رہا سختی پیدا کرنا تو یہ کام ہر شخص بہ خوبی انجام دے سکتا ہے۔

امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں درحقیقت عالم وہ ہے جو اللہ کے بندوں کے لئے آسانی کی صورتیں نکالے۔ شرط یہ ہے کہ وہ متدیّن اور ثقہ عالم ہو۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم وسلفِ صالحین رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی نہج رہا۔ مشہور تابعی عمر بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے دوسو سے زائد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی معیّت حاصل ہوئی، میں نے ان سے زیادہ ہدایت یافتہ اور ان سے بڑھ کر تشدد سے پرہیز کرنے والی قوم نہیں دیکھی۔ یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب سے زیادہ ہدایت یافتہ تھے اور تشدد کی طرف کم سے کم مائل۔ حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب اسلام پر چلنا بہت آسان تھا۔ آج جبکہ اسلام پر قائم رہنا نہایت مشکل فریضہ ہے' ہم اس بات کے زیادہ حقدار ہیں کہ تشدد کی طرف کم سے کم مائل ہوں۔

تخفیف اور آسانی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم کسی ایسے موقف کو اپنا لیں جو قرآن وسنّت کے صریح خلاف ہو یا خواہ مخواہ کسی نصِ صریح میں تاویلیں کریں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے بینک کے فوائد (Interest) کو حرام قرار دینے میں کسی تخفیف سے کام نہیں لیا کیونکہ بینک کے فوائد سود ہیں اور سود کی حرمت قرآن وسنّت سے ثابت ہے۔ اسی طرح سگریٹ نوشی کو حرام قرار دیتے ہوئے میں نے کسی تخفیف اور نرمی کا خیال نہیں کیا اس لئے کہ قرآن وسنّت کے نصوص اس کی حرمت کے حق میں ہیں۔

علی العموم، جب میرے سامنے دو جائز حل ہوں، ان میں سے ایک قدرے سخت اور دوسرا نرم ہو تو میں نے ہمیشہ نرم پہلو کو ترجیح دی ہے' کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی سنّت رہی ہے۔

۳۔ لوگوں کو ان کی سمجھ اور ان کی اپنی زبان میں مخاطب کرنا

جن اصولوں کو میں نے اختیار کیا ہے ان میں ایک اصول یہ بھی ہے کہ میں لوگوں

کو اس زبان میں مخاطب کروں جسے وہ بہ آسانی سمجھ سکیں۔ وہ اندازِ گفتگو اختیار کروں، جس سے وہ مانوس ہوں۔ مشکل، مبہم اور سخت الفاظ سے ہمیشہ اپنی زبان کو محفوظ رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۭ (ابراہیم:۴)

اور ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر اس کی قوم کی زبان میں تاکہ وہ انہیں ہر بات کھول کھول کر بتائے۔

اس سلسلے میں درج ذیل باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے:

الف: لوگوں کی عقلوں کو منطقی انداز میں مخاطب کیا جائے۔ مبالغہ آرائی کے ذریعے ان کے جذبات کو بھڑکانے کی کوشش نہ کی جائے۔ اسلام کا سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید کی صورت میں ہے اور یہ معجزہ انسانی عقلوں کو خالص علمی اور منطقی انداز میں مخاطب کرتا ہے۔

ب: باتوں میں خواہ مخواہ کا تکلّف، تصنّع اور پیچیدگی شامل نہ ہو۔ ایسی عبارتیں اور ایسا اسلوب اختیار کیا جائے جسے سامعین بہ آسانی سمجھ سکیں۔ ان کی عقل اور سمجھ کی رعایت ہو۔ اگر کم پڑھے لکھے لوگ ہیں تو ان کے ساتھ بالکل آسان زبان میں گفتگو ہو۔ اور اگر سامعین تعلیم یافتہ ہوں تو ان کے معیار کے مطابق زبان بھی معیاری اور ادبی ہونی چاہئے۔

ج: کسی فقہی حکم کو بتانے کے ساتھ ساتھ اس کی عِلّت اور مصلحت بھی بتانی چاہئے تاکہ لوگ اس حکم کو انشراحِ قلب کے ساتھ قبول کرسکیں۔ اس کے دو سبب ہیں:

پہلا سبب تو یہ ہے کہ یہی قرآن وسنّت کا اسلوب ہے۔ قرآن نے حیض کی حالت میں عورتوں سے اعتزال کا حکم دیا تو اس کی علت یہ بیان کی کہ ''هُوَ اَذًى'' یعنی یہ ناپاک چیز ہے۔ نماز فرض کی تو اس کی مصلحت بتائی کہ ''اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ'' نماز فحش کاموں اور برائیوں سے روکتی ہے۔ روزہ فرض کیا تو اس کی مصلحت

بتائی "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" تا کہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو۔ احادیث سے بھی اس کی بے شمار مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں اعتراض کرنے والوں اور شک پیدا کرنے والوں کی کوئی کمی نہیں۔ اب لوگ کسی شرعی حکم کو اس کی مصلحت جانے بغیر انشراحِ قلب کے ساتھ قبول نہیں کر پاتے ہیں۔ بعض تو ایسے ہیں کہ مصلحت نہ جاننے کی صورت میں اس حکم ہی کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان کے سامنے احکام کی علت و مصلحت بیان کی جائے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیا جائے کہ مومن کی شان تو یہ ہونی چاہئے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ جو حکم دیں اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے خواہ اس کی علت و مصلحت معلوم نہ ہو۔ اور اسے یقین ہو کہ اللہ کا کوئی حکم مصلحت سے خالی نہیں ہے۔

۴- ایسے مسائل سے اجتناب جو نفع بخش نہ ہوں

میں نے جن اصولوں کا لحاظ کیا ہے ان میں یہ اصول بھی ہے کہ ایسے مسائل جو نہ میرے لئے نفع بخش ہوں نہ دوسروں کے لئے ان کے جواب نہ دوں۔ مثلاً ایسے سوالات جن کا مقصد لڑائی جھگڑے کی فضا پیدا کرنی ہو یا دینِ اسلام میں شک وشبہ پیدا کرنا ہو یا ان غیبی باتوں کے بارے میں سوالات جن کی تشریح نہ اللہ نے کی ہے نہ اس کے رسول ﷺ نے اور نہ ہی اس کے جان لینے میں ہمارا کوئی دینی فائدہ ہی ہے۔ میں اس قسم کے سوالات کے جواب نہیں دیتا کیونکہ میری نظر میں یہ غیر نفع بخش سوالات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بنی اسرائیل کی جو برائیاں بتائی ہیں ان میں ایک برائی یہ بھی تھی کہ وہ بہت زیادہ سوال کرنے والی قوم تھی، بلاوجہ سوال کرتی اور ایسے سوال کرتی جس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے جب انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تو انہوں نے ایسے ایسے سوال کئے جن کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور نتیجہ یہ ہوا کہ خود مشکلوں میں پڑ گئے۔ سورہ بقرہ میں یہ قصہ تفصیل کے ساتھ درج ہے۔

خلیفۂ راشد عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا کہ اہلِ صفین کی جنگ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ آپ نے ٹالنے کے انداز میں جواب دیا کہ وہ ایسا خون ہے جس سے میرے ہاتھ کو اللہ تعالیٰ نے پاک رکھا۔ اب میں اپنی زبان کو اس کے تذکرے سے کیوں آلودہ کروں؟

اسی طرح بے مقصد سوالات میں یہ سوال کرنا بھی ہے کہ اللہ کے نزدیک ابوبکر رضی اللہ عنہ افضل ہیں یا علی رضی اللہ عنہ؟ یا ان دونوں میں خلافت کا زیادہ حقدار کون تھا؟ عائشہ رضی اللہ عنہا افضل ہیں یا فاطمہ رضی اللہ عنہا؟ وغیرہ وغیرہ۔

۵- فتوے میں اعتدال کی راہ اختیار کرنا

فتویٰ دینے میں، میں نے ہمیشہ اعتدال کی راہ اختیار کی ہے۔ ایسی رائے کو اختیار کیا ہے جو اِفراط وتفریط سے پاک ہو۔ عموماً دو قسم کے افراد اِفراط وتفریط کا شکار ہوتے ہیں۔

۱- پہلی قسم ان افراد کی ہے جو عہدِ جدید کی روز افزوں ترقیوں اور بدلتے ہوئے حالات اور ضرورتوں کے پیشِ نظر اسلامی شریعت کے بہت سارے قوانین میں تبدیلی چاہتے ہیں ان کی خواہش ہے کہ شریعت کے ہر قانون کو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق بنایا جائے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ سود پرانے زمانے میں حرام تھا کیونکہ اس زمانے میں سود لینے والا طاقت ور ہوتا تھا اور سود دینے والا کمزور۔ اور اسی استحصال کی وجہ سے سود حرام قرار پایا۔ آج اس ترقی یافتہ دور میں حالات مختلف ہو چکے ہیں۔ آج سود لینے والا ایک کم حیثیت شخص ہوتا ہے، جو بینک میں اپنی جمع پونجی کو Fixed Deposit کر کے اس پر سود لیتا ہے اور بینک جو کہ سود دینے والا ہے وہ اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقت ور اور مال دار ہوتا ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک اس عمل سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ کسی کا بھی استحصال نہیں ہو رہا ہے۔ اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ سود کی حرمت ختم ہو جانی چاہئے۔

ان کے اس مطالبے کو نہ عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ قرآن وسنّت کے دلائل، کیونکہ

قرآن وحدیث نے واضح طور پر سود کو قیامت تک کے لئے حرام قرار دیا ہے، اس میں کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لوگوں کو یہ غلط فہمی بھی نہیں ہونی چاہئے کہ سود صرف استحصال کی وجہ سے حرام ہے، اس کی حرمت کے متعدّد اسباب ہیں جن میں سے بعض اقتصادی ہیں، بعض اجتماعی اور بعض اخلاقی۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ آج سود لینے والا کمزور اور کم حیثیت شخص ہوتا ہے اور سود دینے والا طاقت ور ہوتا ہے۔ کیونکہ بینک میں پیسہ جمع کرنے والے صرف کم حیثیت کے نہیں ہوتے بلکہ اکثریت ان لوگوں کی ہے جو کروڑوں اور اربوں کے مالک ہیں۔

۲- دوسری قسم ان افراد کی ہے جو پہلی قسم سے یکسر مختلف ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو تشدد اور اپنے سخت موقف کی وجہ سے اکثر چیزوں کو حرام تصوّر کرتے ہیں۔ ان کی زبان پر ہر وقت حرام حرام کا وِرد رہتا ہے۔ حد درجہ احتیاط اور شک کی بنا پر ان کے یہاں حرام چیزوں کی فہرست کافی لمبی ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک عورت کا سروس کرنا حرام ہے، گانا حرام ہے، موسیقی حرام ہے، تصویر بنانا حرام ہے، ٹی وی حرام ہے، شیئر مارکیٹ حرام ہے۔ الغرض اس دور کی ساری زندگی ان کی نظر میں حرام ہے۔ انہیں اس بات کا احساس نہیں کہ لفظِ حرام کس قدر غیر معمولی لفظ ہے۔ قرآن، سنّت اور سلفِ صالحین نے سختی کے ساتھ اس بات کی تنبیہ کی ہے کہ ہم صرف اس چیز کو حرام تصوّر کریں جسے قرآن وسنّت نے واضح انداز میں حرام قرار دیا ہو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۝ (یونس: ۵۹)

کہو، ذرا بتاؤ تو سہی جو رزق اللہ نے عطا کیا ہے پھر اس میں تم نے اپنی مرضی سے حرام اور حلال بنا ڈالا کہو، کیا اللہ نے تمہیں اس بات کا حکم دیا تھا یا تم اللہ پر بہتان تراش رہے ہو۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ (النحل:۱۱۶)

اور یہ جو تمہاری زبانیں جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ حرام تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھو۔

۶-فتوے کو مطلوبہ توضیح وتشریح کے ساتھ پیش کرنا

میں فتویٰ دیتے وقت محض اختصار کی خاطر یہ کہنے پر اکتفا نہیں کرتا کہ یہ حرام ہے اور یہ حلال۔ یہ جائز ہے اور وہ ناجائز۔ بلکہ اس وقت میں اپنے آپ کو مفتی کے علاوہ مربّی و معلّم بھی تصوّر کرتا ہوں۔ میری ذمے داری صرف حکم بتانا نہیں' بلکہ اس حکم سے متعلق تمام تفصیلات وتشریحات پیش کرنا بھی ہے، تاکہ سوال کرنے والا مطمئن ہو جائے اور انشراح قلب کے ساتھ وہ اس فتوے کو قبول کرے۔ اس تشریح وتوضیح کی خاطر میں درج ذیل باتوں کو پیشِ نظر رکھتا ہوں۔

۱-فتویٰ بغیر دلیل کے پیش نہیں کرتا۔ اس لئے کہ دلیل کے بغیر فتوے کی کوئی تاثیر نہیں۔

۲-دلیل کے ساتھ ساتھ حکم کی علّت و مصلحت بھی بتاتا ہوں۔ موجودہ زمانے میں یہ طریقۂ کار اور بھی ضروری ہے، اس لئے کہ لوگ اب بغیر علّت و مصلحت جانے کسی حکم کو تسلیم نہیں کرتے۔

۳-بسا اوقات یہ اسلوب کافی مفید ہوتا ہے کہ پوچھے گئے مسئلے میں دینِ اسلام کا حکم بتانے کے ساتھ ساتھ دوسرے ادیان کا حکم بھی بتا دیا جائے اور ان دونوں کے درمیان موازنہ کیا جائے' تاکہ اسلام کے حکم کی اہمیت ومنفعت اجاگر ہو سکے۔

۴-پوچھے گئے مسئلے کا جواب اگر پوچھنے والے کے لئے کچھ انوکھا سا ہو تو بہتر ہوگا کہ جواب دینے سے قبل ایک تمہید باندھی جائے' تاکہ سوال کرنے والے کا ذہن اس انوکھے جواب کے لئے سازگار ہو سکے۔

۵-بسا اوقات سوال کرنے والا کسی ایسے مسئلے کے بارے میں سوال کرتا ہے، جو اس

کی نظر میں حلال ہے یا اس کی خواہش ہوتی ہے کہ یہ چیز حلال ہو، حالانکہ اسلام کی نظر میں وہ چیز حرام ہوتی ہے۔ مفتی کو چاہئے کہ اس چیز کی حرمت بتانے کے بعد اس کی کوئی متبادل صورت بھی بتائے، جو اسلام کی نظر میں حلال ہو۔ مثلاً اگر مفتی بینک کے فوائد کو سود قرار دے کر حرام بتاتا ہے، تو اسے چاہئے کہ پوچھنے والے کو کوئی متبادل طریقہ بھی بتائے جس کے ذریعے وہ سود سے محفوظ رہ کر بینک سے تجارت کر سکے۔ مثلاً مضاربت کی بنیاد پر۔ یا اگر کوئی شخص زکوٰۃ کی رقم کسی ایسے شہر میں مسجد بنانے کے لئے دینا چاہتا ہے، جہاں پہلے ہی سے اتنی مسجدیں ہیں کہ مزید کی ضرورت باقی نہیں رہتی تو اسے بتانا چاہئے کہ مسجد بنانے کے لئے زکوٰۃ کی رقم دینا اگرچہ جائز ہے، لیکن بہتر ہوگا کہ زکوٰۃ کی رقم وہاں دی جائے، جہاں اس کی زیادہ ضرورت ہے مثلاً وہاں جہاں اللہ کی راہ میں لوگ جہاد کر رہے ہوں۔

۶- بسا اوقات مفتی کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ پوچھے گئے مسئلے کے حکم کو دوسرے متعلق احکام کے ساتھ مربوط کر کے پیش کرے، تاکہ اس حکم کی حقانیت اس پر واضح ہو سکے۔ مثلاً جب یہ بتائے کہ وراثت میں بیٹی کا حصہ بیٹے سے آدھا ہوتا ہے، تو اسے یہ بھی بتانا چاہئے کہ شریعت کی رُو سے نان ونفقہ کی ذمے داری مردوں پر ہوتی ہے اور شادی کے موقع پر مہر کی رقم بھی مردوں ہی کو ادا کرنی ہوتی ہے۔ ان ذمے داریوں کی وجہ سے لڑکا لڑکی کے مقابلے میں دوگنا حصہ لیتا ہے۔

۷- کبھی کبھی مفتی کو چاہئے کہ وہ سوال کا جواب دینے سے احتراز کرے۔ جیسے اگر سوال لغو قسم کا ہو یا بے مقصد اور غیر مفید ہو۔ مثال کے طور پر یہ سوال کرنا کہ قرآن مخلوق ہے یا نہیں؟ یا یہ سوال کرنا کہ اللہ تعالیٰ عرش پر جلوہ افروز ہے تو کس طرح؟ یا اللہ کی دوسری صفات سے متعلق سوال کرنا۔ ان مسائل میں میرا موقف وہی ہے جو سلفِ صالحین کا ہے، لیکن خواہ مخواہ ان مباحث میں پڑنا وقت کا ضیاع ہے۔ اور یہ ہرگز عقلمندی کی بات نہ ہوگی کہ ہم دوسرے اہم فرائض کو چھوڑ کر ان مباحث میں اُلجھے رہیں۔ اس قسم کے سوالات کا بہترین جواب خاموشی ہے۔

چند اہم باتیں

طویل مدت سے افتاء کا فریضہ انجام دینے کے دوران، مجھ پر چند حقائق واضح ہوئے ہیں:

۱- مجھے لاکھوں کی تعداد میں خطوط موصول ہوئے۔ مرد وعورت، جوان وبوڑھے اور عوام وخواص سب نے اپنے اپنے مسائل میرے سامنے پیش کیے۔ ان خطوط کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ آج بھی ہمارے معاشرے میں دین ومذہب کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ لوگوں کے دلوں میں مذہب کی حیثیت ثانوی ہرگز نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو اتنی کثرت سے لوگوں کے خطوط میرے پاس نہ آتے، جن سے دین کے احکام جاننے کی ان کی بے چینی عیاں ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک خوش آئند بات ہے۔ اس لئے دعوتِ دین کا فریضہ انجام دینے والوں کو اس اُمت سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، بلکہ انہیں پُر امید رہنا چاہئے کہ یہ سرزمین ایک نہ ایک دن ان شاء اللہ اسلام کی سرزمین ہوگی۔

اس ذیل میں، میں ان متدیّن حضرات سے جن کے اندر مذہبی تشدد کے جراثیم پائے جاتے ہیں اور جو ذرا ذرا سی بات پر لوگوں کو کافر کہتے پھرتے ہیں، ان سے گزارش کروں گا کہ انہیں اپنے رویے پر نظر ثانی کرنی چاہئے' کیونکہ ابھی بھی اس اُمت کی اکثریت اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور کتاب پر یقینِ کامل رکھتی ہے اور دینی احکام جاننے کے لئے بے چین نظر آتی ہے۔

۲- دوسری حقیقت جو میرے مشاہدے میں آئی وہ یہ کہ مردوں کے مقابلے میں عورتیں اپنے دین کا زیادہ اہتمام کرتی ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ مردوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ نرم دل اور الفت ومحبت کا پیکر ہوتی ہیں اور ان کا یہ وصف انہیں دین سے زیادہ قریب کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرے پاس مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے زیادہ خطوط آتے ہیں، جن میں دینی احکام کے متعلق ان کے سوالات ہوتے ہیں۔ ان میں یہ خوف زیادہ پایا جاتا ہے کہ کہیں کسی غلطی کی وجہ سے آخرت میں ان کی گرفت نہ

ہو جائے۔ مجھے یقین ہے کہ مغربی تہذیب کی ہزار دعوتوں اور جاذبیتوں کے باوجود ہمارے معاشرے کی عورتوں کی اکثریت، اس کے دام میں نہیں آسکتی۔ آپ خود مشاہدہ کرلیں کہ پردے کے خلاف ہزار جنگ کے باوجود اس معاشرے میں پردے والی خواتین کی کمی نہیں اور روز بروز پردے کی طرف رجحان میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔

۳- اس حقیقت کا بھی انکشاف ہوا کہ کوئی بھی عالمِ دین یا مفتی اس معاشرے کی تعلیم و تربیت میں بہت کامیاب ہوسکتا ہے بہ شرطے کہ اسے خود اسلامی تعلیمات کا بخوبی علم و ادراک ہو اور ان کو احسن طریقے سے لوگوں کے سامنے پیش کرے اور لوگوں کے ساتھ اس کا سلوک ایسا خیر خواہانہ ہو کہ لوگ اسے اپنا بھائی یا باپ تصوّر کرنے لگیں۔ اس کا رویّہ کسی پولیس والے کی طرح سخت نہ ہو، بلکہ اسے ایک ماہر طبیب کی طرح ہونا چاہئے کہ لوگ اس کے سامنے اپنا مرض اطمینان کے ساتھ پیش کرسکیں اور ساتھ ہی انہیں یقین ہو کہ طبیب ان کا کامیاب علاج کرے گا۔

اللہ کا شکر ہے کہ میرے اور عوام النّاس کے درمیان تعلّق کی نوعیت اخوّت و محبت کی ہے۔ میں نے اپنے دل و دماغ، گھر اور آفس سب کے دروازے ان کے لئے کھول رکھے ہیں۔ میں اطمینان اور توجّہ کے ساتھ ان کے مسائل سنتا ہوں اور ان مسائل کو حل کرنے میں ان کی خاطر خواہ مدد کرتا ہوں۔ بارہا لوگوں نے اپنے خطوط میں اپنے ان رازوں سے بھی مجھے آگاہ کیا ہے، جو اَب تک صرف ان تک محدود تھے اور ایسا کرنے کے بعد انہوں نے مجھ پر اطمینان کیا کہ میں ان کے رازوں کا افشا نہیں کروں گا۔ بلاشبہ لوگوں کا مجھ پر یہ اعتماد میرے لئے بڑی قیمتی دولت ہے، جس کا کوئی بدل نہیں۔ ان رازوں کی بدولت اس معاشرے کی بہت سی ایسی خرابیوں کا علم ہوا جن تک عام نگاہیں نہیں پہنچ پاتی ہیں لیکن یہ خرابیاں معاشرے کے لئے ناسور کی حیثیت رکھتی ہیں۔ میرے نزدیک ان برائیوں اور خرابیوں کو ختم کرنے کی اسلام کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہے۔

اپنے ربّ کا محتاج

یوسف القرضاوی

پہلا باب

قرآنی آیات

سورج کی گردش

سوال: ماہرینِ فلکیات دعویٰ کرتے ہیں کہ زمین سورج کے اردگرد گھومتی ہے اور سورج اپنے مرکز پر ٹھہرا ہوا ہے۔ حالانکہ قرآن کی رُو سے زمین اور سورج دونوں ہی محوِ گردش ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِىٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى (لقمان:۲۹)

اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔ سب ایک وقتِ مقرر تک چلے جا رہے ہیں۔

ماہرینِ فلکیات کے دعوے اور قرآنی فکر کے درمیان تطبیق کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟

جواب: موجودہ صدی اور اس سے قبل بھی ماہرینِ فلکیات یہ دعوے کرتے رہے ہیں کہ سورج اپنے مرکز پر ثابت وقائم ہے اور زمین اس کے اردگرد گھومتی ہے۔ ان کا یہ دعویٰ قرآنی نظریے کے بالکل خلاف ہے۔ قرآن نے متعدد آیات میں سورج کی گردش کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالشَّمْسُ تَجْرِىْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ (یٰسین:۳۸)

اور سورج، وہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے، یہ زبردست علیم ہستی کا

باندھا ہوا حساب ہے۔

معلوم ہوا کہ قرآن اس نظریے کے حق میں ہے کہ سورج متحرّک ہے، غیر متحرّک یا ثابت نہیں۔ ماہرینِ فلکیات اب تک جو سورج کے ثابت ہونے کا نظریہ پیش کرتے رہے' اس کی غلطی اب خود جدید سائنسی تحقیقات نے ثابت کر دی ہے۔ جدید سائنسی تحقیقات کی رُو سے زمین سورج کے گرد گردش کرتی ہے اور سورج بھی اپنے محور پر محوِ گردش ہے۔ اس لحاظ سے قرآنی نظریے اور سائنسی نظریے کے درمیان کوئی تعارض نہیں پایا جاتا۔

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ زمین کی گردش کا نظریہ قرآن کی رُو سے صحیح نہیں ہے' کیونکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس نے پہاڑوں کو زمین میں میخوں کی طرح پیوست کیا ہے' تاکہ زمین میں حرکی واضطرابی کیفیت پیدا نہ ہو سکے۔

یہ اعتراض بالکل بے بنیاد ہے۔ پہاڑوں کے زمین میں میخوں کی طرح پیوست ہونے سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ زمین متحرّک نہیں ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ ایک کشتی سمندر میں تیر رہی ہے' سمندر کی طاقتور لہروں میں گھر کر ہچکولے کھاتی ہے۔ کسی نے کشتی کو ان ہچکولوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اس پر بڑی وزنی چیزیں رکھ دیں۔ اس وزن کے دباؤ کی وجہ سے کشتی میں اضطرابی کیفیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ ہچکولوں سے محفوظ ہو جاتی ہے' لیکن اس کے باوجود وہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتی ہے۔ زمین کی مثال بھی کچھ ایسی ہی ہے۔

آسمان کی حقیقت

سوال: اسی طرح ماہرینِ فلکیات کا نظریہ ہے کہ آسمان درحقیقت مختلف رنگوں کا مجموعہ ہے۔ ان رنگوں کے باہمی ملاپ سے جو رنگ سب سے آخر میں وقوع پذیر ہوتا ہے، وہ ہے نیلا رنگ اور یہی وہ رنگ ہے جسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اس کے برعکس قرآن آسمان کی حقیقت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بلندی پر

تعمیر کیا ہے۔

قرآن کہتا ہے:

اَفَلَا یَنظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ۝ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ۝ (الغاشیہ: ۱۷، ۱۸)

کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اٹھایا گیا؟

سوال یہ ہے کہ جب آسمان رنگوں کا مجموعہ ہے اور کوئی ٹھوس چیز نہیں تو اس کی بلندی چہ معنی دارد؟

جواب: درحقیقت قرآن کی اس آیت میں سرے سے کوئی ایسی بات نہیں، جو ماہرینِ فلکیات کے نظریے سے ٹکراتی ہو۔ صرف یہی آیت نہیں' بلکہ تمام قرآن میں کوئی ایسی آیت نہیں، جو ٹھوس تحقیق پر مبنی، جدید سائنسی نظریات سے ٹکراتی ہو۔

ہم مسلمانوں کو چاہئے کہ ہم ان جدید علوم کا احترام کریں جن کی بنیاد تجربے اور مشاہدے پر ہوتی ہے۔ اسلام نہ صرف یہ کہ ان علوم کی حمایت کرتا ہے' بلکہ وہ ہم مسلمانوں کو ان میں سبقت لے جانے کا درس دیتا ہے۔ افسوس اس کے باوجود ہم مسلمان مغربی تہذیب وثقافت کو تو فوراً ہضم کر لیتے ہیں لیکن ان کے علوم اور تحقیقات سے دور ہی دور رہتے ہیں، حالانکہ علم وہنر کی شناخت نہ کسی سرزمین سے وابستہ ہے اور نہ کسی مذہب وملّت سے۔ علمی استفادہ کہیں سے بھی کیا جا سکتا ہے قطع نظر اس سے کہ جس سے علم حاصل کیا جا رہا ہے وہ کافر ہے یا مسلم۔

اس لئے اگر ماہرینِ فلکیات تحقیق وتجربہ کے بعد آسمان کے سلسلے میں یہ نظریہ قائم کرتے ہیں، تو اس میں ایسی کوئی بات نہیں جو قرآنی تعلیمات سے متصادم ہو۔ بلکہ الحمد اللہ اس کے برعکس قرآن میں ایسی بہت ساری چیزیں ہیں، جن کی تصدیق ماہرین اور سائنس دانوں نے اپنی تحقیقات سے کی ہے۔

بارش کی حقیقت

سوال: جدید سائنسی تحقیقات کی رُو سے بارش دراصل اس بھاپ کا نتیجہ ہے جو سمندروں اور دریاؤں سے اٹھتی ہے اور اوپر کی طرف جاتی ہے، حالانکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس نے بارش کو اوپر سے نیچے کی طرف برسایا، کیا ان دونوں نظریات میں کوئی تناقض نہیں ہے؟

جواب: میرے محترم بھائی! ان دونوں میں کوئی تناقض نہیں ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ ''اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً'' یعنی خدا نے آسمان سے پانی برسایا۔ عربی زبان میں ''اَلسَّمَاءَ'' کا مفہوم صرف آسمان ہی نہیں ہوتا' بلکہ اس کا مفہوم بلندی بھی ہوتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے بلندی کی طرف سے پانی برسایا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ بارش اوپر ہی کی طرف سے نیچے کو آتی ہے۔ یہ بارش اس بھاپ کا نتیجہ ہوتی ہے جو سمندروں اور دریاؤں سے اٹھتی ہے۔ ہم جس زمین پر بستے ہیں اس کا دو تہائی حصہ پانی سے گھرا ہوا ہے۔ جب اس پانی پر سورج کی شدید اور طاقت ور کرنیں پڑتی ہیں تو پانی کھول اٹھتا ہے اور پانی کا ایک حصہ بھاپ بن کر اوپر کی جانب اٹھتا ہے۔ اوپر جا کر یہ بھاپ یا تو پہاڑوں کی چوٹیوں سے ٹکراتی ہے یا پھر یخ بستہ فضاؤں سے۔ ان دونوں صورتوں میں یہ بھاپ بارش کی شکل میں زمین کی طرف آ گرتی ہے۔ یوں اگر غور کریں تو بارش کی بنیاد زمین ہے نہ کہ آسمان۔ یہی بات سورۃ النازعات میں اس طرح بیان کی گئی ہے:

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ۝ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَ هَا وَمَرْعٰهَا ۝

(النازعات: ۳۰،۳۱)

اس کے بعد زمین کو اس نے بچھایا۔ اس کے اندر سے اس کا پانی اور چارہ نکالا۔

زمین ہی سے زمین کا پانی نکالا' حالانکہ پانی کا بیشتر حصہ بارش کی صورت میں آسمان کی طرف سے آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بارش بھی زمین کا ایک حصہ ہے۔

قرآن کی اس آیت کے نزول سے قبل بھی عرب کی جاہلی شاعری میں یہ تصوّر پایا جاتا تھا۔

دوسری بات یہ کہ لفظ ''أَنْزَلَ'' کا مفہوم صرف نازل کرنا نہیں ہوتا' بلکہ اس میں تخلیق کا پہلو بھی ہے۔ متعدد قرآنی آیات میں لفظ أَنْزَلَ اسی مفہوم میں مستعمل ہے۔ مثلاً

وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ (الحدید ۲۵)

اور لوہا اتارا (یعنی اس کی تخلیق کی) جس میں بڑا زور ہے۔

اور مثلاً:

اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ (الزمر:۶)

اور اسی نے تمہارے لئے مویشیوں میں سے آٹھ نر و مادہ پیدا کیے۔

جہنّم کہاں ہے؟

سوال: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (آل عمران:۱۳۳)

دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے، جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر جنت کا حجم تمام آسمان و زمین کے حجم کے برابر ہے تو پھر جہنم کا محلِ وقوع کہاں ہے؟

جواب: حقیقت یہ ہے کہ ہم کائنات کے جس مختصر سے جزء میں بستے ہیں، وہ محض آسمان و زمین پر ہی مشتمل نہیں ہے، بلکہ ان آسمانوں سے پرے بھی کائنات کی لامحدود وسعتیں ہیں جو اللہ کی ملکیت ہیں اور جن تک نہ ہماری عقل کی رسائی ہو سکی ہے اور نہ جدید علمِ سائنس ہی ان پر اپنی کمندیں ڈال سکا ہے۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں رکوع سے اٹھتے وقت ہمیں یہ دعا پڑھنے کی تاکید فرمائی ہے:

اللھم ربنا لك الحمد مِلئ السموات والارض ومِلئ ما شئت من شيء بعد۔ (مسلم)

اے اللہ تیرے ہی لئے ساری تعریفیں ہیں آسمانوں اور زمین کے برابر، اور ان کے علاوہ ان تمام چیزوں کے برابر جنہیں تو چاہے۔

جدید سائنسی تحقیقات ابھی اس وسیع وعریض کائنات کے محض بعض حصہ پر سے پردہ اٹھا سکی ہیں اور اس مختصر سے حصے کی ساخت کو لاکھوں کروڑوں نوری سال سے پیمائش کرتی ہیں۔ ہماری زمین اور بعض تاروں کے درمیان اتنی طویل مسافت ہے کہ اسے طے کرنے کے لئے کروڑوں نوری سال درکار ہیں۔

چنانچہ اگر جنت ان آسمان وزمین کو محیط ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے بعد جہنم کے لئے کوئی جگہ نہیں بچتی، بلکہ اللہ کی کائنات تو اس قدر وسیع ہے کہ اس میں جنت وجہنم دونوں سما جائیں اور اس کے بعد بھی ہزاروں چیزوں کے لئے جگہ باقی بچی رہے۔

یہ کوئی نیا سوال نہیں ہے۔ حضور ﷺ سے بھی بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اور بعض اہلِ کتاب نے یہی سوال کیا تھا۔ آپ ﷺ نے جواباً ان سے ہی سوال کر ڈالا کہ جب دن آتا ہے تو رات کہاں ہوتی ہے؟ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے جواباً فرمایا کہ جب رات آ کر ہر چیز کو تاریک کر دیتی ہے تو پھر دن کہاں ہوتا ہے؟ سوال کرنے والے نے جواب دیا کہ دن وہاں ہوتا ہے جہاں اللہ کی مرضی ہوتی ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ پھر جہنم بھی وہیں ہے جہاں اللہ کی مرضی ہے۔

حافظ ابنِ کثیر اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں:

۱- ایک مفہوم تو یہ ہو سکتا ہے کہ طلوعِ سحر کے بعد ہمارے رات کو نہ دیکھ پانے سے یہ بات لازم نہیں ہوتی کہ رات کا وجود کہیں نہیں ہے۔ ہر چند کہ اس کا مکانِ وجود ہمیں نہیں معلوم ہے۔

۲- جب رات دنیا کے ایک طرف ہوتی ہے تو دوسری طرف دن ہوتا ہے۔ اسی طرح جنت اس کائنات کے ایک طرف واقع ہے یعنی اعلیٰ علیین میں اور جہنم اس کائنات کے دوسری طرف واقع ہے یعنی اسفل السافلین میں۔

وہ کون سی بستی ہے؟

سوال: ذیل کی آیت کی تشریح مطلوب ہے:

وَحَرَٰمٌ عَلَىٰ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَٰهَآ أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ۝ (الانبیاء:۹۵)

اور ممکن نہیں ہے کہ جس بستی کو ہم نے ہلاک کر دیا ہو وہ پھر پلٹ سکے۔

یہ کن بستی والوں کا تذکرہ ہے؟ کہاں تھی وہ بستی؟ یہ کیوں ہلاک کیے گئے؟

جواب: اس آیت میں کسی متعین اور مخصوص بستی کی طرف اشارہ نہیں ہے۔ بلکہ اس آیت میں بستی سے مراد ہر بستی کے مکین ہو سکتے ہیں۔ اس آیت کا مفہوم و مقصود یہ ہے کہ ہر وہ بستی جس کو اللہ نے نیست و نابود کر دیا، اب ایسا نہیں ہے کہ وہ دوبارہ اٹھائی نہیں جائے گی۔ بلکہ اس کے برعکس سزا و جزا کی خاطر ہر بستی کو قیامت کے دن دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ محض دُنیوی عذاب آخرت کے عذاب کو ٹال نہیں سکتا۔ یہی مفہوم ایک دوسری آیت میں ہے:

وَ كَأَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ أَمْرِ رَبِّهَا وَ رُسُلِهِ فَحَاسَبْنَٰهَا حِسَابًا شَدِيدًا وَّ عَذَّبْنَٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ۝ فَذَاقَتْ وَبَالَ أَمْرِهَا وَ كَانَ عَٰقِبَةُ أَمْرِهَا خُسْرًا ۝ أَعَدَّ ٱللَّهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا

(الطلاق:۸،۱۰)

کتنی ہی ایسی بستیاں ہیں جنھوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی، تو ہم نے ان کی سخت باز پرس کی انہیں شدید عذاب سے دوچار کیا تو انہوں نے اپنے کیے کا مزہ چکھ لیا اور ان کا انجام تو گھاٹا ہی گھاٹا ہے کہ اللہ نے ان کے لئے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

ایسی نافرمان بستیاں دنیا میں بھی عذاب الٰہی سے دوچار ہوں گی اور دُنیوی عذاب ان کے اُخروی عذاب کو ٹال نہیں سکتا۔ وہاں بھی اللہ نے ان کے لئے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

ہارون سے مراد کون ہے؟

سوال: مندرجہ ذیل آیتِ کریمہ میں ہارون سے مراد کون ہے؟

يَٰٓأُخۡتَ هَٰرُونَ مَا كَانَ أَبُوكِ ٱمۡرَأَ سَوۡءٖ وَمَا كَانَتۡ أُمُّكِ بَغِيّٗا ۝ (مریم:۲۸)

اے ہارون کی بہن! نہ تیرا باپ کوئی بُرا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی کوئی بدکار عورت تھی۔

کیا اس آیت میں ہارون سے مراد وہ ہارون ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کے بھائی اور نبی تھے، حالانکہ مریم علیہا السلام اور ہارون علیہ السلام کے درمیان سینکڑوں سال کا فاصلہ ہے۔ یا اس سے مراد کوئی دوسرا ہارون ہے؟

جواب: اس آیتِ کریمہ میں ہارون سے مراد وہ ہارون بھی ہو سکتے ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کے بھائی اور اللہ کے نبی تھے۔ اس صورت میں ہارون کی بہن کا مطلب حقیقی بہن نہیں، بلکہ ان کی دینی بہن ہے۔ کیوں کہ بالفعل ہارون علیہ السلام اور مریم علیہا السلام کے درمیان سینکڑوں سال کا فاصلہ ہے اور وہ دونوں حقیقی بھائی بہن ہو ہی نہیں سکتے۔ لوگوں نے جو انہیں ہارون کی بہن کہہ کر پکارا تو ان کا مقصد یہ تھا کہ اے وہ عورت جو اس نبی صالح کی ذریّت میں سے ہے اور جسے ہیکلِ سلیمانی کی دیکھ بھال اور عبادتِ الٰہی کی بنا پر اس نبی صالح سے ایک خاص نسبت ہے تو آخر وہ کس طرح اس بدکاری کی مرتکب ہو سکتی ہے؟ یہ بات تو سبھی کو معلوم ہے کہ ہیکل سلیمانی کی دیکھ بھال کا شرف ہارون علیہ السلام کی اولاد کو حاصل تھا اور مریم علیہا السلام نے بھی اپنی زندگی ہیکلِ سلیمانی کی دیکھ بھال کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ اسی نسبت سے کہنے والوں نے انہیں ہارون کی بہن کہہ دیا۔

ہارون سے مراد مریم علیہا السلام کا ہم عصر کوئی دوسرا عابد وزاہد شخص بھی ہوسکتا ہے۔ گویا کہ زہد وعبادت کی نسبت کے پیشِ نظر لوگوں نے انہیں ہارون کی بہن کہہ کر پکارا ہو۔

مُسندِ احمد، صحیح مسلم اور ترمذی وغیرہ میں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اہلِ نجران کی طرف بھیجا اور وہ سب عیسائی تھے۔ ان عیسائیوں نے مغیرہ بن شعبہ سے ''یَا اُخْتَ هَارُوْنَ'' پر اعتراض کیا کہ وہ ہارون کی بہن کیسے ہو سکتی ہیں حالانکہ ان کے درمیان سینکڑوں سال کا فاصلہ ہے۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے اور ان لوگوں کا اعتراض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم نے انہیں یہ بات نہیں بتائی کہ اس زمانہ میں لوگ اپنے بچوں کا نام انبیاء وصالحین کے نام پر رکھتے تھے؟ اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ ہارون سے مراد موسیٰ علیہ السلام کے بھائی نہیں ہیں جیسا کہ اہلِ نجران نے سمجھا بلکہ ہارون سے مراد مریم علیہا السلام کا ہی ہم عصر کوئی نیک اور عابد وزاہد شخص ہے جس کا نام ہارون تھا۔

آیت اِنَّ الْمُلُوْكَ......

سوال: درج ذیل آیت کی توضیح وتشریح مطلوب ہے:

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَ جَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَ كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ○ (النمل: ۳۴)

بادشاہ جب کسی ملک میں گھس آتے ہیں تو اسے خراب اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔ یہی کچھ وہ کیا کرتے ہیں۔

جواب: اگر اس آیت کا یہ مفہوم لیا جائے کہ بادشاہ، خواہ کوئی بھی ہو بس بادشاہ ہو، جب کبھی کسی بستی میں فاتح ہو کر داخل ہوتا ہے تو وہ اسے تباہ وبرباد کر دیتا ہے اور شرفاء کو ذلیل وخوار کرتا ہے، تو یہ ایک غلط مفہوم ہوگا۔

اس آیت کے سیاق وسباق پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ آیت ملکۂ سبا بلقیس کے قصے کے ضمن میں نازل ہوئی ہے۔ ہُد ہُد نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو جب

یہ خبر دی کہ:

اِنِّیْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَ اُوْتِیَتْ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِیْمٌ ○ (النمل:۲۳)

میں نے وہاں ایک عورت دیکھی جو اس قوم کی حکمراں ہے۔ اس کو ہر طرح کا سروسامان بخشا گیا ہے اور اس کا تخت عظیم الشّان ہے۔

تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کے پاس ایک خط روانہ کیا، جس میں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی اور بغیر کسی سرکشی کے مکمل اطاعت قبول کر لینے کا حکم دیا۔ چنانچہ ملکہ بلقیس نے اپنی مملکت کے اکابرین کو مشورے کی خاطر جمع کیا کہ سلیمان علیہ السلام کو کیا جواب دینا چاہئے۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہمارے پاس زبردست طاقت موجود ہے۔ ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور اس سلسلے میں ملکہ جو بھی اقدام کریں گی وہ سب کے لئے قابلِ قبول ہوگا۔ اس پر ملکہ سبا نے کہا: اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَةً......الخ۔

ملکہ سبا ان لوگوں پر یہ واضح کر دینا چاہ رہی تھی کہ بادشاہ جب کسی دوسری مملکت میں فاتح وغالب کی حیثیت سے داخل ہوتا ہے تو اس بستی کا یہ انجام ہوتا ہے کہ فاتح بادشاہ اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا ہے، اسے تباہ وبرباد کر ڈالتا ہے اور مملکت کے شریف شہریوں کی عزت کو خاک میں ملا دیتا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ واقعتہً جب کبھی استعماری قوتیں کسی ملک میں داخل ہوئیں تو انہوں نے اسے زیروزبر کر ڈالا اور وہی انجام کیا جس کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سارے بادشاہ ایسے ہی ہوتے ہیں اور فتح ونصرت کے بعد وہ دشمن ملکوں کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں۔ کیوں کہ بادشاہوں میں اچھے بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی۔ بادشاہت جب اچھوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے تو تعمیر واصلاح فی الارض کا ذریعہ بنتی ہے اور جب بُروں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے تو تباہی وبربادی کا سبب بن جاتی ہے۔

قرآن میں ان دونوں قسم کے بادشاہوں کا تذکرہ ہے۔ اچھے بادشاہوں میں قرآن نے طالوت، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السّلام کا تذکرہ کیا ہے۔ یوسف علیہ السلام کو جب خدا کی طرف سے بادشاہت عطا ہوئی تو انہوں نے یوں شکرادا کیا:

رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ۚ

(یوسف:۱۰۱)

اے میرے رب! تو نے مجھے حکومت بخشی اور مجھ کو باتوں کی تہ تک پہنچنا سکھایا۔

سورۃ الکہف میں بادشاہ ذوالقرنین کا تذکرہ موجود ہے جو ایک نیک سیرت بادشاہ تھا۔ بادشاہ یا حکمراں اگر صالح ہو تو وہ بلاشبہ افضل النّاس ہوتا ہے، جیسا کہ حدیثِ نبوی ہے:

لیوم من امام عادل خیر من عبادۃ ستین سنۃ۔ (طبرانی)

انصاف پسند حکمراں کا ایک دن ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر اور افضل ہے۔

قرآن میں ان بادشاہوں کا بھی تذکرہ ہے جنھوں نے زمین میں فسادات برپا کیے۔ مثلاً نمرود بادشاہ جو ابراہیم علیہ السلام کا ہم عصر تھا اور اپنے آپ کو خدا کہلواتا تھا، اس نے ابراہیم علیہ السلام کے لائے ہوئے دینِ اسلام کی راہ روکنے کے لئے جو کچھ کیا اور ابراہیم علیہ السلام پر جو ظلم وستم کیے تاریخ کی کتابیں اس پر شاہد ہیں۔ اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کا ہم عصر بادشاہ فرعون جس کا تذکرہ قرآن میں بار بار آیا ہے وہ برملا کہتا تھا:

یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرِیْ ۚ (القصص:۳۸)

اے اہلِ دربار! میں تو اپنے سوا تمہارے کسی خدا کو نہیں جانتا۔

اسی طرح سورۃ الکہف میں اس ظالم بادشاہ کا تذکرہ موجود ہے جو ہر اجنبی کی کشتی پر غاصبانہ قبضہ کر لیتا تھا:

وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّأْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ○ (الکہف:۷۹)

اور آگے ایک ایسے بادشاہ کا علاقہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا۔

بادشاہت اور حکمرانی فی نفسہٖ بری چیز نہیں ہے۔ اس کے بھلے یا بُرے ہونے کا انحصار اس شخص پر ہے جس کے ہاتھوں میں یہ نعمت آئی ہے۔ اگر اس نے اس نعمت کو نعمت جان کر تعمیر و ترقی اور اصلاح کے لئے استعمال کیا تو یہ سب کے لئے باعثِ نعمت ہے جیسا کہ حدیث ہے:

نعم المال الصالح للمرء الصالح۔ (احمد)

پاک مال اگر نیک آدمی کی ملکیت میں ہو تو کیا ہی بھلی چیز ہے۔

ورنہ یہی نعمت سب کے لئے باعثِ عذاب بن جاتی ہے اور یہی اس آیت کا مقصود ہے جس کی تشریح و توضیح آپ نے پوچھی ہے۔

قصۂ ذوالقرنین کی تفصیل

سوال: سورۃ الکہف میں بادشاہ ذوالقرنین کے واقعے کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ط قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ○ (الکہف:۸۶)

حتیٰ کہ جب وہ غروبِ آفتاب کی حد تک پہنچ گیا تو اس نے سورج کو ایک کالے پانی میں ڈوبتے دیکھا اور وہاں اسے ایک قوم ملی۔ ہم نے کہا اے ذوالقرنین! تجھے یہ مقدرت حاصل ہے کہ ان کو تکلیف پہنچائے اور یہ بھی کہ ان کے ساتھ نیک رویّہ اختیار کرے۔

سوال یہ ہے کہ وہ کون سا کیچڑ آلود چشمہ ہے جس میں سورج ڈوب رہا تھا؟ اور وہ کون سی قوم تھی جن سے ذوالقرنین کی ملاقات ہوئی؟

جواب: بادشاہ ذوالقرنین کا تذکرہ سورۃ الکہف میں درج ہے۔ اس قصے کو بیان کرتے ہوئے قرآن نے ہمیں نہ یہ بتایا ہے کہ ذوالقرنین کون تھا اور نہ تفصیل کے ساتھ اس واقعے ہی کا تذکرہ کیا ہے کہ مشرق و مغرب میں وہ کہاں کہاں گیا اور کن کن قوموں سے ملاقات کی۔ اسی سورۃ میں دوسرے واقعات بھی منقول ہیں اور ان میں بھی ناموں اور تفاصیل سے کوئی تعرض نہیں ہے۔ اس کی حکمت تو اللہ ہی کو بہتر معلوم ہے تاہم قرینِ قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں قصوں اور واقعات کے تذکرے کا مقصد محض تاریخی حقائق کا اندراج نہیں ہے' بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ سننے اور پڑھنے والے ان سے عبرت حاصل کریں۔ جیسا کہ اللہ فرماتا ہے:

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۝ (یوسف:۱۱۱)

بے شبہ ان کے قصوں میں سامان عبرت ہے عقل والوں کے لئے۔

اس سورۃ میں ذوالقرنین کا واقعہ بھی عبرت آموز ہے۔ وہ ایک ایسا بادشاہ تھا، جسے اللہ نے زمین پر حکمرانی عطا کی، اسے ہر طرح کے اسباب و وسائل سے مالا مال کیا، ہر چہار جانب اس کی فتح و نصرت کے ڈنکے بجنے لگے اور قومیں اس کی مطیع و فرماں بردار ہوئیں، تاہم اس سب کے باوجود اس کے دل میں گھمنڈ پیدا نہ ہوا، ہمیشہ عدل و انصاف پر قائم رہا اور اللہ کے قائم کردہ حدود سے کبھی تجاوز نہیں کیا۔ جیسا کہ اس نے اس قوم کو مخاطب کر کے کہا تھا:

أَمَّا مَن ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهُ ثُمَّ يُرَدُّ إِلَىٰ رَبِّهِ فَيُعَذِّبُهُ عَذَابًا نُّكْرًا ۝ وَأَمَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُ جَزَاءً الْحُسْنَىٰ

(الکہف: ۸۷، ۸۸)

جو ان میں ظلم کرے گا ہم اس کو سزا دیں گے پھر وہ اپنے رب کی طرف پلٹایا جائے گا اور وہ اسے اور زیادہ سخت عذاب دے گا اور جو ان میں سے ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا اس کے لئے اچھی جزا ہے۔

رہا یہ سوال کہ وہ کون سا چشمہ تھا جہاں سورج ڈوب رہا تھا اور کن قوموں سے ذوالقرنین نے ملاقات کی، اس بارے میں قرآن خاموش ہے۔ اس کے تذکرے میں اگر کوئی دینی یا دُنیوی فائدہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ ہمیں ضرور بتاتا۔ قرآن میں جو کچھ اس واقعے کی تفصیل موجود ہے وہ یہ کہ ذوالقرنین مغرب کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہ مغرب کے انتہائی سرے پر پہنچا تو وہاں سورج کو ایک چشمے میں غروب ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ واقعتہً سورج اس کیچڑ والے چشمے میں ڈوب رہا تھا' بلکہ یہ محض ایک منظر کشی ہے کہ دیکھنے والے کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ سورج اس چشمے کی آغوش میں دھیرے دھیرے جا رہا ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ کوئی ایسی جگہ ہو جہاں دریا کا گدلا پانی سمندر میں آکر گرتا ہو یا حقیقتاً وہ ایک ایسا چشمہ ہو جہاں کیچڑ کی بہتات ہو۔ مقصد بہر حال غروبِ شمس کی منظر کشی ہے اور اس پورے واقعے کا مطلوب و مقصود ایک ایسے بادشاہ کی تصویر کشی ہے، جو اس سرزمین کے ایک بڑے علاقے کا واحد مضبوط و مستحکم بادشاہ ہوتے ہوئے بھی عدل وانصاف کا پیکر تھا۔ یہ سامانِ عبرت ہے عقل والوں کے لئے۔ اس موقع پر میں یہ بتانا چاہوں گا کہ ہمارے لئے یہی بہتر ہے کہ ہم اسی پر اکتفا کریں، جس پر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے۔ خواہ مخواہ ایسے سوالات نہ کریں جس کا کوئی دینی یا دُنیوی فائدہ نہ ہو۔

سورۃ توبہ میں بسم اللہ نہ لکھنے کی حکمت

سوال: سورۂ توبہ بغیر بسم اللہ کے کیوں نازل ہوئی ہے؟

جواب: اس سلسلے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ ان میں سب سے قرینِ قیاس رائے میری نظر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کی وجہ بتاتے ہوئے فرمایا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم موجبِ رحمت وامان ہے اور سورہ توبہ امان کے خاتمے اور جہاد کا اعلان ہے۔ (زادالمسیر: علاّمہ جوزی)

چوں کہ مشرکین نے مسلمانوں کو دھوکا دیا اور معاہدے کی خلاف ورزی کرتے

ہوئے مسلمانوں کے خلاف یہودیوں کا ساتھ دیا اس لئے نہ کوئی معاہدہ باقی رہا اور نہ کوئی اخلاقی جواز کہ مشرکین کے ساتھ معاہدہ کو برقرار رکھا جائے۔ اسی لئے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اس معاہدے کے خاتمے کا اعلان کرتے ہوئے ان مشرکین کے خلاف علمِ جہاد بلند کر دیا۔ اگر اس سورۃ کی ابتدا بھی بسم اللہ سے ہوتی تو اللہ تعالیٰ کی شان کریمی ورحیمی ان کے لئے یک گونہ باعثِ رحمت وامان بنتی جب کہ اس سورۃ کا آغاز ہی امان کے خاتمے کے اعلان سے ہے اور مسلمانوں کو اس بات کا حکم ہے کہ وہ مشرکین پر اپنی تلواریں کھینچ لیں:

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ (التوبہ:۵)

تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور انہیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لئے بیٹھو۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذاتی قرآنی نسخے

سوال: ''الصدّیق ابوبکر'' نامی کتاب کے صفحہ نمبر ۳۱۶ پر سورہ بقرہ کی یہ آیت یوں لکھی ہے:

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَى (البقرہ:۲۳۸) ''وَصَلَاةِ الْعَصْرِ''

یعنی ''وَصَلَاةِ الْعَصْرِ'' کے اضافے کے ساتھ۔ اس کی تاویل یہ پیش کی گئی ہے کہ قرآن کے وہ نسخے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھے ان میں یہ آیت ''وَصَلَاةِ الْعَصْرِ'' کے اضافے کے ساتھ درج ہے۔ حالانکہ قرآن کے وہ نسخے جو ہم سب کے درمیان موجود ہیں ان میں یہ اضافہ مفقود ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس قرآن کے ذاتی نسخے موجود تھے۔ ان ذاتی نسخوں میں وہ تفسیر، تشریح یا حاشیے کے طور پر کچھ نوٹ چڑھا لیا کرتے تھے۔ اب ظاہر

ہے کہ یہ تشریحی کلمات قرآن کا جزو نہیں تھے بلکہ ان کی حیثیت محض تفسیر یا تشریح کی تھی۔ چنانچہ اس آیت میں بھی ''وَصَلَاةِ الْعَصْرِ'' کا اضافہ قرآن میں اضافہ نہیں، بلکہ اس کی حیثیت محض تفسیر کی ہے۔ آپ ﷺ نے بھی متعدد احادیث میں ''اَلصَّلٰوةِ الْوُسْطٰی'' کی تشریح صَلَاةِ الْعَصْرِ بتائی ہے۔

عہد صحابہ رضی اللہ عنہم سے ہی علماء وفقہاء کے درمیان اس امر میں اختلاف رہا ہے کہ اَلصَّلٰوةِ الْوُسْطٰی سے کون سی نماز مراد ہے۔ آیا یہ فجر کی نماز ہے؟ یا ظہر کی یا عصر کی؟ صحیح احادیث کی رُو سے اس سے مراد عصر کی نماز ہے۔ گمانِ غالب یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی اپنے ذاتی نسخے میں ''اَلصَّلٰوةِ الْوُسْطٰی'' کی تفسیر کے لئے ''وَصَلَاةِ الْعَصْرِ'' کا نوٹ چڑھا لیا۔ اس زمانہ میں اصل متن اور حاشیہ وتفسیر کو الگ الگ لکھنے کا کوئی قاعدہ موجود نہیں تھا۔ جیسا کہ آج کل یہ قاعدہ پایا جاتا ہے۔ مثلاً قوسین کا استعمال کر کے یا الگ الگ رنگوں کی روشنائی استعمال کر کے وغیرہ وغیرہ۔

قرآن کا وہ نسخہ جو اَب ہمارے درمیان موجود ہے اور جسے نسخۂ عثمانی بھی کہا جاتا ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کی ترتیب وکتابت کے موقع پر یہ امر ملحوظ رکھا کہ اس قسم کے تمام حواشی اور تفسیری کلمات حذف کر ڈالے جائیں اور قرآن کو اسی صورت میں پیش کریں جس صورت میں حضرت جبرائیل علیہ السلام رسولِ اکرم ﷺ کے پاس لائے تھے اور اس بات پر تمام صحابہ رضی اللہ عنہم اور ائمہ نے اتفاق کیا۔

اس طرح کے توضیحی کلمات کے اضافے کی اور بھی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ذاتی نسخے میں ''فصیام ثلاثة ایام متتابعات'' درج ہے، ''متتابعات'' کے اضافے کے ساتھ۔ ظاہر ہے کہ یہ اضافہ انہوں نے محض تفسیر کی خاطر کیا ہے' کیونکہ نبی ﷺ سے انہوں نے ان روزوں کے بارے میں یہی سنا کہ ان روزوں کو پے در پے ہونا چاہئے۔

قرآن کی مختلف قرأتیں

سوال: میں مسجد میں جماعت کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ میں نے تھوڑے سے وقت

کو غنیمت جانا اور قرآن کی تلاوت میں مشغول ہو گیا۔ میں جب سورہ روم کی اس آیت پر پہنچا:

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً (الروم:۵۴)

اللہ ہی تو ہے جس نے ضعف کی حالت سے تمہاری پیدائش کی ابتدا کی۔ پھر اس ضعف کے بعد تمہیں قوت بخشی۔ پھر اس قوت کے بعد تمہیں ضعیف اور بوڑھا کر دیا۔

تو میں لفظ ''ضُعف'' کی ضاد پر ضمہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ کہیں یہ طباعت کی غلطی تو نہیں؟ چونکہ قرآن کا یہ نسخہ ہندوستان میں شائع ہوا تھا اس لئے میرے شک کو تقویت ملتی تھی۔ وہ نسخے جو عرب ملکوں میں شائع ہوتے ہیں ان میں لفظ ''ضعف'' کی ضاد پر فتحہ ہے نہ کہ ضمہ۔ قرآن تو ایک ایسی کتاب ہے جس میں کسی تحریف وتبدیلی کا امکان نہیں کیوں کہ اس کی حفاظت خود اللہ نے اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ پھر آخر ان دونوں نسخوں میں اختلاف کیوں ہے؟

جواب: سب سے پہلے تو میں اپنے دینی بھائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہیں کتاب اللہ سے غایت درجہ عقیدت اور شوقِ تلاوت ہے یہ بات بھی قابلِ تحسین ہے کہ انہوں نے لاعلمی کے موقع پر فوراً اہلِ علم کی طرف رجوع کیا تا کہ ان کا شک دور ہو۔ یہی ہر مسلمان کا شیوہ ہونا چاہئے۔

میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ جس بات نے آپ کو حیرت زدہ کر رکھا ہے وہ طباعت کی غلطی ہرگز نہیں ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں دونوں قرأتیں صحیح ہیں یعنی لفظ ضعف میں ضاد کو فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا جا سکتا ہے اور ضمہ کے ساتھ بھی۔ قرآن کی سات مشہور قرأتوں میں سے پانچ قرأتوں کے مطابق حرف ضاد پر ضمہ ہے اور بقیہ دو یعنی عاصم اور حمزہ نے اسے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ قراء کہتے ہیں کہ قریش کی زبان میں یہ لفظ

ضمہ کے ساتھ ہے اور بنو تمیم کی زبان میں فتحہ کے ساتھ۔(۱)

عرب ممالک میں عاصم کی قرآت زیادہ مشہور ہے اور اسی پر عمل ہے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے ہندو پاک میں بھی عاصم ہی کی قرأت پر عمل ہے۔ اس اعتبار سے قرآن کا وہ نسخہ جس کی طباعت ہندوستان میں ہوئی ہے اس میں لفظ ضَعف کو فتحہ کے ساتھ ہونا چاہئے۔ لیکن وہ نسخہ جو آپ کے ہاتھوں میں ہے اس میں لفظ ضُعف ضمہ کے ساتھ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حفص نے جو کہ عاصم کے شاگرد ہیں اسے ضمہ کے ساتھ ہی پڑھا ہے۔ ابن الجزری کہتے ہیں کہ حفص سے دونوں قرأتیں منقول ہیں۔(۲) حفص نے ضمہ والی قرأت کو ترجیح ایک مرفوع حدیث کی بنیاد پر دی ہے۔ حدیث کا مفہوم یوں ہے کہ عطیہ عوفی کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے لفظ ضَعف کو فتحہ کے ساتھ پڑھا۔ تو انہوں نے مجھے ٹوکا اور اسے ضمہ کے ساتھ پڑھنے کی ہدایت کی۔ مزید فرمایا کہ میں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسے فتحہ کے ساتھ پڑھا تھا تو انہوں نے بھی مجھے ٹوکا تھا اور ضمہ کے ساتھ پڑھنے کی ہدایت کی تھی۔(۳)

تاہم اس حدیث کی سند ضعیف ہے کیوں کہ عطیہ عوفی کو علماءِ حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے۔ ہندوستانی نسخے میں ضمہ والی قرأت کی ترجیح کا ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قریش کی زبان میں یہ لفظ ضمہ کے ساتھ ہے۔ عرب کی تمام زبانوں میں قریش کی زبان کو جو فضیلت حاصل ہے وہ سب پر عیاں ہے۔

آسمان و زمین کی تخلیق چھ دنوں میں

سوال: قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ

(الاعراف:۵۴)

درحقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔

ان چھ دنوں سے کیا مراد ہے؟ میں نے بعض تفسیر کی کتابوں میں پڑھا ہے کہ چھ دنوں کا مطلب ہے چھ دور (Periods) ہمیں نہیں معلوم کہ اللہ نے آسمان وزمین کی تخلیق چھ دنوں میں کی ہے یا چھے ادوار میں؟ آپ سے وضاحت مطلوب ہے۔

جواب: بے شبہ ان چھ دنوں سے مراد وہ دن نہیں ہیں جن کی پیمائش چوبیس گھنٹے سے ہوتی ہے۔ کیوں کہ چوبیس گھنٹوں پر محیط دن کی تخلیق بھی تو آسمان وزمین اور شمس وقمر کی تخلیق کے بعد ہی ہوئی ہے۔ زمین اور سورج کی تخلیق سے قبل ایسے دن کا تصور غیر معقول ہے۔ جو چوبیس گھنٹے پر محیط ہو۔

آسمان وزمین کی تخلیق اللہ تعالیٰ نے چھ دنوں میں کیسے کی' اس کی پوری تفصیل سورۃ حٰمٓ السجدۃ آیت نمبر ۹ تا ۱۲ میں درج ہے۔

عین ممکن ہے کہ چھ دن سے مراد چھ دور ہوں۔ ان میں سے ہر ایک دور کتنی مدت پر محیط ہے' اس کا علم تو صرف اللہ کو ہے۔ عربی زبان میں اس کی گنجائش ہے کہ لفظ ''یوم'' سے مراد دور یا وقفہ لیا جائے۔ عربی زبان میں ''یَوم'' اس گھڑی یا وقت کے متعیّن حصے کو کہتے ہیں جو وقت کے دوسرے حصے سے مختلف اور نمایاں ہو۔ چنانچہ ''ایّام العرب'' کا مفہوم ہے عربوں کی مشہور جنگیں۔ اللہ کے نزدیک لفظ یوم سے کیا مراد ہے ملاحظہ کیجئے:

وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ۝ (الحج:۴۷)

اور تیرے رب کے ہاں کا ایک دن تمہارے شمار کے ہزار برس کے برابر ہوا کرتا ہے۔

قیامت کے سلسلہ میں اللہ فرماتا ہے:

فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍ۝ (المعارج:۴)

ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔

مختصر یہ کہ عربی زبان میں لفظ یوم کا مفہوم محض چوبیس گھنٹے کا دن نہیں' بلکہ اس کا مفہوم اس سے وسیع تر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی تخلیق چھ دنوں میں کی' حالانکہ وہ اس بات پر قادر تھا کہ اپنی زبان سے ''کن'' کہے اور سب کچھ آپ ہی آپ تیار ہو جائے۔ اس کی کیا مصلحت ہے یہ تو اللہ ہی کو بہتر معلوم ہے۔ غالب گمان یہ ہے کہ اس میں اللہ نے بندوں کے لئے یہ سبق رکھا ہے کہ ہر کام کو ٹھہر ٹھہر کر خوش اسلوبی سے کیا جائے، جلد بازی اور عجلت میں نہیں۔

حواشی و حوالہ جات

(۱) تفسیر القرطبی ج ۱۴۔ ص۔ ۴۶۔ ۴۷

(۲) النشر فی القراء ت العشر۔ ابن الجزریالجزری۔ ص۔ ۳۴۵

(۳) ابوداؤد، ترمذی اور امام احمد نے اس کی روایت کی ہے۔ مسند احمد میں اس حدیث کا نمبر ۵۲۲۷ ہے۔

دوسرا باب

احادیث

عورت کی سربراہی

سوال: کیا وہ حدیث صحیح ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا ہے:

لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمْ اِمْرَأَةً۔

وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی، جس نے کسی عورت کو اپنا سربراہ مقرر کرلیا۔

وہ حضرات جو عورتوں کی برابری کے قائل ہیں اس حدیث کو نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث ایک دوسری حدیث سے ٹکراتی ہے جس میں حضور ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

خذوا نصف دينكم عن الحميراء يعني عائشة۔

اے لوگو! اپنے دین کی نصف باتیں حمیراء یعنی عائشہ سے حاصل کرو۔

جواب: جہالت ایک بڑی مصیبت ہے۔ اگر خواہشِ نفس اس پر مستزاد ہو تو کریلا اور نیم چڑھا کے مصداق مکمل تباہی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ (القصص: ۵۰)

اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا جو خدائی ہدایت کے بغیر، بس اپنی خواہشوں کی پیروی کرے۔

ایسے لوگ جن میں جہالت اور نفسانی خواہشوں کی پیروی دونوں یکجا ہوں، کچھ بعید نہیں کہ وہ صحیح حدیث کو ضعیف قرار دیں اور ضعیف کو صحیح۔

پہلی حدیث جس میں عورت کی سربراہی کو فلاح کے منافی قرار دیا گیا ہے' بالکل صحیح ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب حضور تک یہ خبر پہنچی کہ فارس والوں نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا بادشاہ مقرر کرلیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی، جس نے کسی عورت کو اپنا سربراہ مقرر کرلیا۔ یہ حدیث صحیح بخاری، ترمذی اور مُسند احمد وغیرہ میں درج ہے اور تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ مرد کے مقابلے میں عورت سربراہی کی حق دار نہیں ہے۔

رہی دوسری حدیث' جس میں نصف دین کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حاصل کرنے کی ہدایت ہے تو اس کے بارے میں حافظ ابنِ حجر فرماتے ہیں کہ نہ اس کی سند معروف ہے اور نہ کسی معتبر حدیث کی کتاب میں اس کی روایت موجود ہے۔ البتہ ابنِ اثیر نے اپنی کتاب ''النہایۃ'' میں اس کا تذکرہ کیا ہے' لیکن یہ بتائے بغیر کہ اس کی روایت کس نے کی ہے۔

یہ تو رہا اس کی سند پر کلام۔ اگر اس کے متن اور موضوع پر غور کریں تو عقل اس کو قبول کرنے سے قاصر ہے۔ کیوں کہ:

۱- رسولِ اکرم ﷺ اس بات کی ہدایت کیسے کرسکتے ہیں کہ ہم نصف دین صرف ایک صحابیہ سے اخذ کریں اور باقی نصف دین بقیہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم سے۔ جن کی تعداد سینکڑوں اور ہزاروں میں ہے اور ان میں سے کتنے ہیں جو علم کے لحاظ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے برتر ہیں۔ پھر یہ کہ کون سا نصف دین عائشہ رضی اللہ عنہا سے اخذ کریں اور کون سا بقیہ نصف صحابہ رضی اللہ عنہم سے؟

۲- حدیث میں عائشہ رضی اللہ عنہا کے لئے ''حمیرا'' (ننھی سرخ لڑکی) کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس میں بیوی کے لئے محبت اور ناز نخرے کا عنصر موجود ہے۔ عقل اس بات سے انکار کرتی ہے کہ حضور ﷺ نے ایک ایسے موقع پر اس لفظ کا استعمال کیا ہو جہاں وہ لوگوں کو دین کی اہم بات بتا رہے ہوں اور واقعہ یہ ہے کہ علماءِ اسلام نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے نصف

دین تو کیا اس کا چوتھائی حصہ بھی نہیں لیا۔ کیونکہ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ اسلامی تعلیمات کی نشر واشاعت میں سینکڑوں اور ہزاروں صحابہ رضی اللہ عنہم وصحابیات رضی اللہ عنہن نے حصہ لیا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس سینکڑے کی ایک اکائی ہیں۔

تاریخی حقائق سے ہٹ کر عقل کی کسوٹی پر بھی اگر اس حدیث کو پرکھا جائے تو عقل اس کے منافی ہے۔ اگر نصف دین عائشہ رضی اللہ عنہا کی تعلیم پر موقوف ہے تو پھر ابو بکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ، ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جیسے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کا اس دین کی تعلیم میں کیا حصہ باقی رہتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی احادیث کی تعداد تو اس سے کہیں کم ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں۔

ہمیں چاہئے کہ شخصیات کے فضائل کے سلسلے میں جو احادیث ہم تک پہنچیں، انہیں قبول کرنے میں نہایت احتیاط سے کام لیں، کیوں کہ یہی وہ موضوع ہے جس میں حدیث گھڑنے والوں نے سب سے پہلے حدیث گھڑی۔ کسی شخصیت کی محبت وعقیدت میں غلو کر جانے والوں نے فضیلت ثابت کرنے کے لئے سینکڑوں کی تعداد میں حدیثیں گھڑی ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت ثابت کرنے کے لئے وہ کچھ بہت کافی ہے جو سورہ نور میں اور صحیح احادیث میں موجود ہے۔ اس کی چنداں ضرورت نہیں کہ ان کی فضیلت ثابت کرنے کے لئے گھڑی ہوئی حدیثوں کا سہارا لیں۔

اہلِ خانہ کی نوحہ خوانی کی وجہ سے میّت کا عذاب میں مبتلا ہونا

سوال: مطالعے کے دوران ایک حدیث میری نظر سے گزری کہ:

اِنَّ الْمَیِّتَ لَیُعَذَّبُ بِبُکَاءِ اَھْلِهٖ عَلَیْهِ۔

اہلِ خانہ کی آہ وبکا کی وجہ سے میّت کو عذاب دیا جاتا ہے۔

یہ حدیث اس لئے سمجھ میں نہیں آئی کہ اسلام کا اصولی حکم یہ ہے کہ ہر شخص صرف اپنے کئے کی سزا بھگتتا ہے۔ تو پھر مردہ شخص دوسروں کی نوحہ خوانی کی پاداش میں کیوں کر عذاب کا مستحق ہو؟ اگر یہ حدیث صحیح ہے تو اس کی توضیح وتشریح مطلوب ہے۔

جواب: اس حدیث کی بات یہ ہے کہ بے شبہ صحیح حدیث ہے۔ بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت کے ساتھ موجود ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا جب عمر رضی اللہ عنہ کو نزع کی حالت میں دیکھ کر رونے لگیں تو عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں رونے پیٹنے سے منع فرمایا اور ساتھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پیش کی۔ بخاری و مسلم میں اسی مفہوم کی دوسری احادیث اتنے تواتر کے ساتھ منقول ہیں کہ اس حدیث کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

البتہ علمائے کرام نے اس حدیث اور اسلام کا وہ اصول جس کا آپ نے تذکرہ کیا ہے، دونوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ حافظ ابنِ حجر نے علمائے کرام کی اس کوشش کا اپنی کتاب فتح الباری میں احاطہ کیا ہے۔ اسے ذیل میں' میں اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہوں:

۱- یہاں اس حدیث میں عذاب سے مراد اس کا لغوی مفہوم ہے یعنی مجرد تکلیف اور دکھ۔ نہ کہ آخرت یا قبر کا عذاب۔ یعنی جب میّت کے اقربا نوحہ خوانی کرتے ہیں تو اس عمل سے میّت کو تکلیف ہوتی ہے۔ اقربا کے اس عمل کی خبر میّت کو ملتی رہتی ہے جیسا کہ ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَعْمَالُ الْعِبَادِ تُعْرَضُ عَلٰی اَقْرَمَائِهِمْ مِنْ مَوْتَاهُمْ.

بندوں کے اعمال ان کے مردہ رشتہ داروں پر پیش کیے جاتے ہیں۔

ابو جعفر الطبری رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ جیسے جیّد علماء نے یہ تاویل پیش کی ہے۔(۱)

۲- عذاب سے مراد یہاں فرشتوں کی ڈانٹ پھٹکار ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث نقل کی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ میّت زندوں کی آہ و بکا سے عذاب میں مبتلا رہتی ہے۔ کیونکہ بین کرنے والے جب چیخ چیخ کر مرنے والے کو دہائی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہائے تو ہی میرا سہارا تھا، تو ہی میرا مددگار

تھا۔ تو فرشتے ڈانٹ کر طنزاً مردے سے پوچھتے ہیں کہ کیا واقعی تو ہی اس کا سہارا تھا؟ کیا واقعی تو ہی اس کا مددگار تھا؟ حالانکہ حقیقی مددگار تو اللہ تعالیٰ ہے۔

اسی مفہوم کا ایک واقعہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب المغازی میں تذکرہ کیا ہے، جس کے راوی نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ پر نزع کی کیفیت طاری ہوئی تو ان کی بہن چیخ پکار کرنے لگیں اور کہتی جاتی تھیں کہ ہائے میری حفاظت کرنے والا، ہائے یہ اور ہائے وہ، عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ جب ذرا ہوش میں آئے تو فرمایا کہ تو نے جن جن چیزوں کے ذریعے مجھے دہائی دی' وہی ساری چیزیں مجھ سے کسی نے پوچھیں (یعنی فرشتوں نے) کہ کیا تم واقعی ایسے ہی ہو؟

۳- امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ اس حدیث میں آہ و بکا سے مراد ہر آہ و بکا نہیں ہے' بلکہ صرف بین کرنا اور نوحہ خوانی کرنا ہے۔ اسی طرح میّت سے مراد ہر میّت نہیں ہے' بلکہ وہ میّت ہے جس کے گھر میں نوحہ خوانی ایک رواج کی حیثیت رکھتی ہو۔ میّت اپنی زندگی میں سب کچھ دیکھتی رہی لیکن اس نے اپنے گھر والوں کو اس عمل سے کبھی منع نہیں کیا۔ چنانچہ اس غفلت کی پاداش میں اسے عذاب دیا جائے گا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی رائے کی حمایت میں چند آیات اور احادیث پیش کی ہیں۔ مثلاً:

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ قُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا (التحریم:۶)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہونگے۔

اور حدیثِ نبوی ہے:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ۔ (بخاری و مسلم عن ابنِ عمر رضی اللہ عنہ)

تم میں ہر ایک شخص ذمے دار ہے اور اپنی رعیّت کے سلسلے میں جوابدہ ہے۔

اس آیت اور حدیث کا تقاضا یہ ہے کہ میّت کو اس جرم کی پاداش میں عذاب ہو کہ اس نے اپنے گھر والوں کی تربیت میں کوتاہی کی اور انہیں نوحہ خوانی کے ایسے غیر اسلامی

رواج سے منع نہیں کیا۔

۴- اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے جسے علامہ مناوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''الفیض'' میں ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میت سے مراد وہ شخص ہے جو جاں بلب ہو، نزع کی کیفیت میں ہو۔ اس حالت میں نوحہ کرنے والے جب چیخ پکار کرتے ہیں تو اس کی تکلیف کی شدت میں اضافہ کرتے ہیں۔

یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جب یہ حدیث سنی تو انہوں نے بھی یہ کہہ کر اس حدیث کو ماننے سے انکار کر دیا کہ یہ حدیث اسلامی اصول اور قرآن کے منافی ہے۔ انہوں نے حدیث کی روایت کو راوی کی بھول چوک پر محمول کیا۔ مسلم کی روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ نہیں فرمایا بلکہ یہ فرمایا ہے کہ:

اِنَّهٗ لَيُعَذَّبُ بِمَعْصِيَتِهٖ اَوْ بِذَنْبِهٖ وَاِنَّ اَهْلَهٗ لَيَبْكُوْنَ عَلَيْهِ.

میت اپنے گناہوں کی پاداش میں عذاب کی حق دار ہوتی ہے۔ اور اس کے گھر والے اس پر روتے ہیں۔

البتہ علماءِ کرام حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس موقف سے متفق نہیں ہیں۔ غلطی سے پاک ذات تو صرف اللہ کے رسول کی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی غلطی ہو سکتی ہے۔ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ، امام قرطبی اور ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ جیسے اکابر علماء نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس موقف کو صحیح احادیث کے مخالف قرار دیا ہے۔

جلد بازی شیطان کا کام ہے

سوال: دو مقولے ہیں جنہیں ہم عام طور پر لوگوں کی زبانوں سے سنتے ہیں اور وہ دونوں مقولے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ پہلا مقولہ یہ ہے کہ ''جلد بازی شیطان کا کام ہے'' اور دوسرا یہ کہ ''سب سے بھلی نیکی وہ ہے جو جلد کر لی جائے'' کیا یہ دونوں مقولے حدیثِ نبوی ہیں۔ اگر ہیں تو ان دونوں کے درمیان مطابقت کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

اگر حدیث نہیں ہیں تو ان میں سے صحیح کونسا ہے اور غلط کونسا؟

جواب: پہلا مقولہ تو ایک حدیثِ نبوی کا جزو ہے۔ پوری حدیث یوں ہے:

اَلْاَنَاۃُ مِنَ اللّٰہِ وَالْعُجْلَۃُ مِنَ الشَّیْطٰنِ۔(۲)

ٹھہر ٹھہر کر عمدگی سے کام کرنا اللہ کی صفت ہے اور جلد بازی شیطان کی صفت ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جلد بازی کو ہر زمانے میں اور ہر قوم نے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے۔ اس کے برعکس ٹھہر ٹھہر کر خوش اسلوبی کے ساتھ کام نمٹانے کی تعریف ہر زمانے کے ذی شعور لوگوں نے کی ہے۔ اس مفہوم کا حامل ایک مشہور مقولہ ہے:

فی التأنی السّلامة وفی العجلة الندامة۔

سوچ بچار کر ٹھہر ٹھہر کا کام کرنے میں سلامتی ہے اور جلد بازی میں ندامت ہے۔

ابنِ قیم فرماتے ہیں کہ جلد بازی کو شیطان کی طرف منسوب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جلد بازی میں جو فیصلہ کیا جاتا ہے اس میں ہلکا پن، غصہ اور طیش شامل ہوتا ہے جو بندے کو وقار، بُردباری اور ثبات سے دور کرتا ہے' چنانچہ اس کے نتائج ہمیشہ بُرے ہوتے ہیں۔

ایک حدیثِ نبوی ہے:

یُسْتَجَابُ لِلْعَبْدِ مَالَمْ یَسْتَعْجِلْ۔ (۳)

بندے کی دعا قبول ہوتی ہے اگر وہ جلدی نہ مچائے۔

رہا دوسرا مقولہ تو وہ کوئی حدیث نہیں ہے۔ البتہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے اسی مفہوم کا ایک قول مروی ہے، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ:

لَا یَتِمُّ الْمَعْرُوْفُ اِلَّا بِتَعْجِیْلِہٖ۔

بھلا کام اسی وقت پورا ہوتا ہے جب اسے جلد از جلد کرلیا جائے۔

اس قول میں بھلائی کے کام کو جلد کرنے کی ترغیب ہے۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں جلدی کرنا اور اس کی طرف تیزی سے لپکنا ایک پسندیدہ اور قابلِ تعریف صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی ایسے لوگوں کی تعریف فرمائی ہے:

أُولَٰئِكَ يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُونَ ○ (المومنون:٦١)

یہ لوگ بھلائیوں میں جلدی کرتے ہیں اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک دوسری آیت ہے:

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ۚ (البقرۃ:١٤٨)

بھلائیوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاؤ۔

چنانچہ یہ دوسرا مقولہ اپنے معنی ومفہوم کے اعتبار سے بالکل درست ہے اگر چہ یہ حدیث نہیں ہے اور اس مقولے اور مذکورہ حدیث کے درمیان معنی ومفہوم کے اعتبار سے کوئی تناقض بھی نہیں ہے کہ مطابقت کی ضرورت ہو۔

علمائے کرام نے ٹھہر ٹھہر کر کام کرنے کو قابلِ تعریف اور جلد بازی کو قابلِ مذمت تین شرطوں کے ساتھ ٹھہرایا ہے:

١- پہلی شرط یہ ہے کہ وہ کام جس کا کرنا مقصود ہو اگر اطاعت الٰہی اور بھلائی اور نیکی کے دائرے میں آتا ہے تو اس میں سبقت لے جانے کی کوشش کرنا اور اس میں جلد بازی کرنا' نہ صرف قابلِ تعریف ہے' بلکہ یہی مطلوب ومقصود ہے۔ نبی ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہدایت کی تھی کہ اے علی رضی اللہ عنہ! تم تین چیزوں میں کبھی تاخیر نہ کرنا۔ نماز جب اس کا وقت ہو جائے، جنازہ جب سامنے لاکر رکھ دیا جائے اور کنواری لڑکی کا نکاح جب اس کا بَر مل جائے۔ (٤)

مشہور عالمِ دین ابوالعیناء کو کسی نے جلد بازی سے منع کیا تو آپ نے جواب دیا کہ اگر ایسی ہی بات ہے تو موسیٰ علیہ السلام کبھی اللہ سے یہ نہ کہتے کہ:

وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ○ (طٰہٰ:۸۴)

اور اے رب میں تیرے پاس جلدی چلا آیا تا کہ تو راضی ہو جائے۔

۲- وہ جلد بازی قابلِ مذمّت ہے، جو بغیر غور و فکر اور تدبّر کے ہو۔ کسی کام میں غور و فکر اور مشورہ کر لینے کے بعد اس میں ٹال مٹول سے کام لینا کوئی تعریف کی بات نہیں۔ یہ تو سستی اور کاہلی کی علامت ہے۔ قرآن فرماتا ہے:

وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ (آل عمران:۱۵۹)

اور دین کے کام میں ان کو بھی شریکِ مشورہ رکھو۔ پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو۔

۳- ٹھہر ٹھہر کر کام کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ انسان اتنی تاخیر کر دے کہ مقصد ہی فوت ہو جائے یا مطلوبہ کام کا وقت ہی نکل جائے۔ اس لئے کہ وقت نکل جانے کے بعد کفِ افسوس ملنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا۔

ایسا کیوں ہے؟

سوال: ایک صحیح حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ ہر دن جب سورج طلوع ہوتا ہے تو دو فرشتے اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! اپنی راہ میں خرچ کرنے والوں کو برکت و فضل عطا فرما اور بخل کرنے والوں کو بربادی۔ لیکن حقیقتِ حال یہ ہے کہ اس دُنیوی زندگی میں عملی طور پر بہت سارے ایسے افراد ملیں گے جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں لیکن پھر بھی ان کی تنگ دامانی نہیں جاتی اور بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو بخل سے کام لیتے ہیں اور دادِ عیش دے رہے ہیں، ایسا کیوں ہے؟

جواب: آپ نے جس حدیث کا مفہوم پیش کیا ہے، وہ ایک صحیح حدیث کا مفہوم ہے اور بخاری و مسلم میں اس طرح موجود ہے:

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم مَا مِنْ يَوْمٍ يُصْبِحُ الْعِبَادُ فِيْهِ اِلَّا مَلَكَانِ يَنْزِلَانِ فَيَقُوْلُ اَحَدُهُمَا اَللّٰهُمَّ

اَعْطِ مُنْفِقًا خَلْفًا وَيَقُوْلُ الْاٰخرُ اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُمْسِكًا تَلْفًا۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر دن جب شروع ہوتا ہے تو دو فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک دعا کرتا ہے کہ اے اللہ خرچ کرنے والے کو برکت عطا فرما اور دوسرا بددعا کرتا ہے کہ اے اللہ بخیل کے حصے میں بربادی رکھ دے۔

اسی مفہوم میں متعدّد احادیث وارد ہوئی ہیں۔ قرآن میں بھی متعدّد آیات اسی مفہوم کو پیش کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ (سبا:۳۹)

جو کچھ تم خرچ کر دیتے ہو اس کی جگہ وہی تم کو اور دیتا ہے۔

سوال کرنے والے بھائی کو اس حدیث کو سمجھنے میں جو غلط فہمی ہوئی ہے وہ یہ کہ انہوں نے برکت اور بربادی کو مال و دولت کی حد تک محدود کر دیا۔ جب کہ برکت کا مفہوم محض مال و دولت میں اضافہ اور بربادی کا مفہوم محض مال و دولت میں خسارہ نہیں ہے، بلکہ اس کا مفہوم اس سے وسیع تر ہے۔ برکت کی بے شمار صورتیں ہو سکتی ہیں۔ برکت کبھی صحت و تن درستی کی شکل میں ملتی ہے تو کبھی نیک اولاد کی شکل میں۔ کبھی مال و دولت کی فراوانی کی صورت میں برکت ہوتی ہے تو کبھی معنوی برکت عطا ہوتی ہے مثلاً ہدایت کی توفیق، سکونِ قلب اور لوگوں میں عزت و مقبولیت وغیرہ وغیرہ۔ ان سب پر مستزاد وہ اجر ہے جو اللہ نے ان کے لئے آخرت میں تیار کر رکھا ہے۔ برکت کو محض چند سکّوں میں محصور کر لینا ایک زبردست غلط فہمی ہے۔ یہ سبھی جانتے ہیں کہ ذہنی سکون سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ○ (یونس:۵۸)

اے نبی! کہو کہ یہ اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ یہ چیز اس نے بھیجی،

اس پر تو لوگوں کو خوشی منانی چاہئے، یہ ان سب چیزوں سے بہتر ہے جنہیں لوگ سمیٹ رہے ہیں۔

اسی طرح بربادی کا مفہوم محض مال و دولت میں خسارہ نہیں ہے۔ بربادی کبھی بیماری کی صورت میں آسکتی ہے تو کبھی غیر صالح اولاد کی صورت میں۔ کبھی لوگوں میں نفرت کی صورت میں اور کبھی ذہنی خلفشار کی صورت میں۔ کبھی انسان کو ایسی بے چینی اور خلش لاحق ہو جاتی ہے جو ہزار نعمت کے باوجود مستقل اسے اندر ہی اندر گھلائے جاتی ہے۔ ان سب پر مستزاد وہ عذاب ہے جو اللہ نے اس کے لئے آخرت میں تیار کر رکھا ہے۔

بھلی بات بولو ورنہ خاموش رہو

سوال: حدیثِ نبوی ہے کہ بھلی بات کہو یا خاموش رہو۔ تو کیا اس حدیث کی روشنی میں زیادہ بولنا حرام ہے؟

جواب: حضورﷺ نے بے شمار حدیثوں میں زبان کی تباہ کاریوں سے خبردار کیا ہے۔

ان میں ایک حدیث یہ بھی ہے:

مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا اَوْلِيَصْمُتْ۔ (۵)

جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے تو اسے چاہئے کہ بھلی بات کہے یا خاموش رہے۔

ایک دوسری حدیث ہے۔

رَحِمَ اللّٰهُ اِمْرَءًا قَالَ خَيْرًا فَغَنِمَ اَوْ سَكَتَ فَسَلِمَ۔ (۶)

اللہ کی رحمت ہو اس شخص پر جس نے بھلی بات کہی اور اجر و نعمت کا حق دار ہوا یا خاموش رہا تو محفوظ رہا۔

بے شبہ زیادہ بولنا اور بے وجہ بولتے رہنا انسان کے لئے باعثِ تباہی اور گناہوں

کا سبب ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ان گناہوں کی تعداد بیس بتائی ہے، جو زبان کے غلط استعمال سے سرزد ہوتے ہیں۔ شیخ عبدالغنی نابلسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس تعداد کو ۷۰ تک پہنچا دیا ہے۔ ان میں سے اکثر گناہِ کبیرہ کے قبیل سے ہیں۔ مثلاً جھوٹ، غیبت، چغلی، جھوٹی گواہی، جھوٹی قسم، لوگوں کی عزت کے بارے میں کلام کرنا اور دوسروں کا مذاق اڑانا وغیرہ وغیرہ۔

اس لئے بہتر یہی ہے کہ انسان حتی المقدور خاموشی کا راستہ اختیار کرے تاکہ ان گناہوں سے محفوظ رہے۔ خاموش رہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے ہونٹوں کو سی لے اور زبان پر تالا ڈال لے۔ بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو اس بات کی زیادہ سے زیادہ سے کوشش کرنی چاہئے کہ وہ اپنی زبان کو کسی بھلی اور معروف بات کے لئے کھولے ورنہ اسے بند رکھے۔

جو لوگ زیادہ بولتے ہیں ان سے اکثر خطائیں سرزد ہو جاتی ہیں اور ان خطاؤں کے سبب وہ لوگوں میں مذاق اور استہزاء کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ اسی لئے بندۂ مومن جب بھی کوئی بات کرے اسے اس بات کا احساس ہونا چاہئے کہ خدا کے فرشتے اس کی ہر بات نوٹ کر رہے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے:

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝ (ق:۱۸)

کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لئے ایک حاضر باش نگراں موجود نہ ہو۔

مکھی کے ایک پر میں شفا

سوال: حدیثِ نبوی ہے:

اِذَا وَقَعَ الذُّبَابُ فِيْ اِنَاءِ اَحَدِكُمْ فَلْيَغْمِسْهُ فَاِنَّ فِيْ اَحَدِ جَنَاحَيْهِ دَاءٌ وَفِي الْآخِرِ شِفَاءٌ.

جب تم میں سے کسی کے برتن میں مکھی پڑ جائے تو چاہئے کہ اسے دوبارہ ڈبو

دے کیونکہ اس کے ایک پر میں بیماری ہے اور دوسرے میں شفا۔

کیا یہ صحیح اور متفق علیہ حدیث ہے؟ اگر کسی نے اس حدیث کا انکار کیا ہو تو وہ خارج از اسلام تصور کیا جائے گا؟ عصرِ حاضر میں بعض ڈاکٹر حضرات اس حدیث کی صحت پر کلام کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض اس کا مذاق اڑاتے ہیں کیوں کہ جدید طب کی رُو سے مکھی وبائی امراض پھیلانے کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ ابھی تک کسی نے مکھی کو علاج کی خاطر استعمال نہیں کیا حالانکہ حدیث کہتی ہے کہ اس کے ایک پر میں شفا ہے۔ براہِ کرم تسلی بخش جواب سے نوازیں۔

جواب: میں ذیل میں اختصار کے ساتھ چند نکات میں جواب دینے کی کوشش کروں گا۔

۱- یہ حدیث صحیح تو ہے، لیکن متفق علیہ نہیں ہے۔ اصطلاحاً متفق علیہ اس حدیث کو کہتے ہیں جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہو۔ زیرِ نظر حدیث صرف بخاری شریف میں ہے اور بخاری شریف کی حیثیت یہ ہے کہ علماءِ کرام نے ہر دور میں اسے قرآن کے بعد سب سے معتبر کتاب مانا ہے۔

۲- دوسری بات یہ ہے کہ اس حدیث میں نہ تو کسی اصولِ دین کا تذکرہ ہے اور نہ اس میں عقیدے سے متعلق کوئی بات کہی گئی ہے، نہ کسی فریضۂ دین کا بیان ہے اور نہ حلال وحرام کا تذکرہ ہے، اگر کوئی مسلمان ساری عمر اس حدیث سے بے خبر رہے تو یہ بے خبری اس کی دین داری میں کوئی نقص تصور نہیں کی جائے گی۔ اور نہ اس کے عقیدے میں ہی کوئی خلل ہوگا۔ اب ظاہر ہے اس حدیث کو بنیاد بنا کر پورے دینِ اسلام کو استہزاء وتمسخر کا نشانہ بنانا کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔

۳- یہ حدیث اگرچہ صحیح حدیث کے درجے میں ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کا شمار حدیث الاحاد میں ہوتا ہے۔ یعنی تواتر کے ساتھ اس حدیث کی روایت نہیں ہے، بلکہ کسی ایک ہی راوی نے اس کی روایت کی ہے۔ حدیث الاحاد کے متعلق علماءِ

حدیث کا اختلاف ہے کہ اسے یقین اور حتمی بات کا درجہ حاصل ہے یا محض غالب گمان کی حد تک محدود ہے۔ اس بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی مسلمان حدیث الاحاد کا انکار کر دے یا اس کے متعلق شک وشبہ میں مبتلا ہو جائے تو اسے خارج از اسلام تصور نہیں کیا جائے گا۔ ہاں اگر کوئی مسلمان اس حدیث کو بنیاد بنا کر پورے دینِ اسلام کا مذاق اڑاتا ہے تو اسے بلاشبہ خارج از اسلام تصوّر کیا جائے گا۔

۴- اب رہی یہ بات کہ طب اور میڈیکل سائنس کی رُو، سے یہ حدیث قابلِ قبول ہے کہ نہیں تو آپ جان لیں کہ بے شمار ماہرینِ علمِ طب نے اس حدیث کی حمایت میں اپنی رایوں کا اظہار کیا ہے۔ مثال کے طور پر میں ڈاکٹر امین رضا (اسکندریہ یونیورسٹی) کے ایک مقالے کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔ یہ مقالہ میگزین ''التوحید'' میں سن ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

۱- کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی حدیثِ نبوی کا محض اس بنیاد پر انکار کر دے کہ وہ جدید علوم سے مطابقت نہیں رکھتی۔ کیوں کہ جدید علوم تو ہنوز ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ ترقی کے اس سفر میں جدید علوم اور جدید نظریات میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ آج ایک نظریہ صحیح ہے تو کل اسے غلط قرار دیا جاتا ہے۔

۲- اس حدیث یا کسی بھی حدیث کو محض اس بنیاد پر ماننے سے انکار کر دینا کہ وہ عقلِ سلیم سے متصادم ہے، سراسر غیر معقول بات ہے۔ حدیث عقل سے متصادم ہو رہی ہے تو اس میں ہماری عقل کا قصور ہے، حدیث کا نہیں۔ ہماری عقل تو ہنوز ناپختہ ہے اور ہمارا علم ابھی تک کافی محدود ہے اور جو باتیں ابھی تک ہمارے علم کے احاطے میں نہیں آ سکی ہیں وہ بے شمار اور لامحدود ہیں۔ اس کے مقابلے میں وہ باتیں جن تک ہمارے علم کی رسائی ہو سکی ہے، وہ تو بہت محدود ہیں۔ اگر انسان یہ تصوّر کر لے کہ اب اس کا علم مکمل ہو چکا ہے اور تحقیق وجستجو کے سارے میدان سر کیے جا چکے ہیں تو یہ انسان کی علمی موت ہے۔ اس لیے اگر حدیث عقل سے ٹکراتی ہے تو انصاف کی بات یہی ہے کہ قصور ہماری عقل کا

ہے' کیوں کہ ہماری عقل اور علم کو ابھی بہت سارے میدان سر کرنے ہیں۔

۳- یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ مکھیوں کے ذریعے علاج کرنے کا تصور میڈیکل سائنس میں بالکل مفقود ہے۔ پرانے زمانے میں بھی مکھیوں کے ذریعے مختلف علاج ہوتے رہے ہیں اور عصرِ حاضر میں بھی سرجری کے بعض شعبوں میں مکھیوں کے ذریعے علاج کیا گیا ہے۔ پچھلی صدی کی پہلی تین دہائیوں میں تو مکھیاں اسی مقصد کے لئے پالی جاتی تھیں۔ اس علاج کی بنیاد یہ ہے کہ مکھیوں میں کچھ ایسے بیکٹیریا کا انکشاف ہوا ہے جو جراثیم کش ہیں۔ انہیں جراثیم کی سرکوبی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

۴- اس حدیث میں اس بات سے خبردار کیا گیا ہے کہ مکھیوں میں بیماری کے جراثیم ہیں اور اس بات کا انکشاف جدید سائنس نے صرف دو صدی قبل کیا ہے۔

۵- اس حدیث میں اس بات کی بھی خبر دی گئی ہے کہ مکھیوں میں شفا کا پہلو بھی ہے۔ یعنی کچھ ایسے مادے ہیں جو جراثیم کش ہیں اور اس زہر کا اثر زائل کرنے والے ہیں جو زہر خود یہ مکھیاں لے کر آتی ہیں۔ میڈیکل سائنس کے مطابق بیکٹیریا جب ایک خاص تعداد میں ہوتے ہیں تو ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے ہیں اور ان میں کا ہر ایک کچھ زہریلے مادوں کی پچکاری سے دوسرے کی جان کے درپے ہوتا ہے۔ ان زہریلے مادوں کو علاج کی خاطر استعمال کیا جاتا ہے جسے ہم اصطلاح میں ''مضاد حیوی'' یعنی (Anti-Biotic) بھی کہتے ہیں۔ فی زمانہ مضاد حیوی دواؤں کا استعمال زوروں پر ہے۔

۶- یہ حدیث اس بات کی تعلیم تو نہیں دیتی کہ ہم مکھیوں کا شکار کریں اور پھر زبردستی اپنے برتن میں ڈبوئیں تاکہ اس سے شفا حاصل کر سکیں اور نہ اس بات کی طرف آمادہ کرتی ہے کہ ہم اپنے برتن کھلے رکھیں یا گھر گندا رکھیں تاکہ زیادہ سے زیادہ مکھیاں آئیں۔ بلکہ اس کے برعکس بے شمار ایسی حدیثیں ہیں جو صفائی اور ستھرائی کی تعلیم دیتی ہیں' بلکہ اس کی تاکید کرتی ہیں۔

۷- اس حدیث سے یہ مفہوم بھی نہیں لیا جا سکتا کہ اگر کسی کے برتن میں مکھی گر جائے اور اسے اس پانی یا کھانے سے کراہت محسوس ہو رہی ہے تو اسے زبردستی کھانے یا پینے پر مجبور کیا جائے۔ اسے کراہت محسوس ہو رہی ہو تو وہ شوق سے اس پانی یا کھانے سے ہاتھ ہٹا لے۔

۸- یہ حدیث اس بات سے ہمیں نہیں روکتی ہے کہ ہم مکھیوں کے خاتمے کے لئے ہر ممکن تدبیر اختیار کریں۔ اور یہ حدیث اس بات کی بھی تعلیم نہیں دیتی کہ ہم مکھیوں کی پرورش کریں اور پھر اِن سے شفا حاصل کریں۔

طلاق سے متعلق حدیثِ نبوی

سوال: طلاق کے باب میں اہلِ علم وفقہ درج ذیل مشہور حدیث پر اعتماد کرتے ہیں:

اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَى اللّٰهِ الطَّلَاقُ۔ ''اللہ کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ حلال چیز طلاق ہے'' تاہم بعض علمائے حدیث اس حدیث کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔ کیا آپ کے علم میں کچھ دوسری ایسی دلیلیں ہیں جن میں طلاق کے ناپسندیدہ ہونے کا ذکر ہو؟

جواب: میں اس سوال کا جواب درج ذیل نکات میں دینے کی کوشش کروں گا:

۱- اس بات کا اثبات کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

۲- کتاب وسنت سے بعض دوسرے حوالے جن میں طلاق کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔

۳- شریعت کے اصولوں سے اس ناپسندیدگی کی تائید۔

(۱) ابوداؤد، ابنِ ماجہ اور حاکم نے اس کی مرفوعاً روایت کی ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا۔ امام بیہقی اسے مرسَل بیان فرماتے ہیں یعنی اس کی سند میں صحابی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا تذکرہ نہیں ہے۔ ابنِ جوزی نے اس حدیث کے ایک راوی عبید اللہ بن ولید الوصافی کو ضعیف قرار دیا ہے۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ

نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

ان علماء کے اقوال کی روشنی میں، میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر یہ حدیث صحیح کے رتبے تک نہ بھی ہو تو حسن کے مرتبہ سے کم نہیں۔

بعض علماء نے روایت کے پہلو سے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک ہی چیز بیک وقت حلال اور خدا کی نظر میں ناپسندیدہ دونوں کیسے ہو سکتی ہے؟

اس کا جواب بعض علماء نے یہ دیا ہے کہ حلال کی ایک قسم ایسی بھی ہے جو خدا کی نظر میں مکروہ ہے۔ امام خطابی کہتے ہیں کہ کراہت نفس طلاق میں نہیں، بلکہ ان عوامل میں ہے جو طلاق کا موجب بنے۔ بعض نے یہ توجیہ پیش کی ہے کہ طلاق تو فی نفسہٖ حلال ہے۔ لیکن اس میں کراہت کا پہلو یہ ہے کہ طلاق کے بعد جو نتائج مرتّب ہوتے ہیں وہ ناپسندیدہ ہوتے ہیں۔

۲- کتاب وسنت میں ایسے شواہد موجود ہیں جن سے طلاق کی ناپسندیدگی ثابت ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے شوہروں کو اس بات کی ترغیب دی ہے کہ وہ اپنی ان بیویوں کو جنہیں وہ ناپسند کرتے ہیں طلاق نہ دیں بلکہ ان کے ساتھ نبھانے کی کوشش کریں۔ اللہ فرماتا ہے:

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ○ (النساء:۱۹)

ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔

قرآن نے ان بیویوں کے بارے میں جو نافرمانی کی مرتکب ہوں فرمایا:

فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ○ (النساء:۳۴)

اگر وہ تمہاری مطیع ہو جائیں، تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کے لئے بہانے

تلاش نہ کرو۔

ذرا غور کریں کہ جب نافرمان بیوی پر زیادتی کرنے سے منع کیا گیا ہے تو فرماں بردار اور نیکوکار بیوی پر طلاق کا ظلم کیسے روا ہو سکتا ہے؟

علامہ ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ طلاق اصلاً ممنوع ہے۔ محض بہ وقتِ ضرورت اس کی اجازت دی گئی ہے۔ جیسا کہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے صحیح حدیث مروی ہے کہ ابلیس اپنا تخت سمندر میں نصب کرتا ہے، پھر اپنے کارندے پھیلاتا ہے۔ سب سے مقرّب کارندہ وہ ہوتا ہے جو سب سے زیادہ فتنہ پھیلائے۔ پھر وہ کارندہ ابلیس کے روبرو آکر کہتا ہے کہ میں اسے بہکاتا رہا حتیٰ کہ اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان علیحدگی کرا دی۔ ابلیس اسے اپنے قریب بلاتا ہے اور فرطِ محبت سے گلے لگا لیتا ہے۔ اس حدیث سے واضح ہے کہ شوہر اور بیوی کے درمیان علیحدگی ایک شیطانی اور ناپسندیدہ فعل ہے۔

(۷)

اللہ تعالیٰ نے جادو کی مذمّت کرتے ہوئے فرمایا:

فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ (البقرۃ:۱۰۲)

پھر بھی یہ لوگ ان سے وہ چیز سیکھتے تھے جس سے شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دیں۔

ایک دوسری حدیث میں حضور نے فرمایا:

اَيُّمَا امْرَءَةٍ سَأَلَتْ زَوْجَهَا الطَّلَاقَ مِنْ غَيْرِ بَاْسٍ فَحَرَامٌ عَلَيْهَا رَائِحَةُ الْجَنَّةِ۔ (۹)

جس عورت نے بغیر کسی وجہ کے اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کیا' اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔

ان سب دلائل کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ طلاق فی نفسہٖ ایک ناپسندیدہ فعل ہے۔

۳-شرعی قواعد واصول سے بھی کراہتِ طلاق کی تائید ہوتی ہے۔

''ہدایہ'' جو احناف کی معتبر فقہی کتاب ہے اس میں طلاق کی تعریف یوں ہے ''طلاق اس نکاح کو ختم کرنے والا ذریعہ ہے، جس پر دُنیوی اور دینی فوائد مرتب ہوتے ہیں۔''

''المغنی'' میں حنابلہ کی طلاق کے بارے میں یہ رائے ہے: طلاق شوہر اور بیوی دونوں کے لئے باعثِ ضرر اور تکلیف دہ اور نقصان دہ ہے۔ اگر یہ بلا عذر ہو تو حرام ہے۔''

ابنِ عابدین جو حنفی تھے فرماتے ہیں کہ طلاق اگر بغیر کسی عذر کے ہو تو اس میں کوئی فائدے کی صورت نہیں، بلکہ بے وقوفی اور حماقت کا کام ہے۔ اور ایسی طلاق شرعاً ممنوع ہے۔

ان سب دلائل کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ طلاق واقعی ایک ناپسندیدہ عمل ہے اور وہ حدیث جس کا تذکرہ آپ نے اپنے سوال میں کیا ہے اور جو طلاق کو اللہ کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ حلال شئی قرار دیتی ہے ایک صحیح حدیث ہے۔

حواشی وحوالہ جات

(۱) موجودہ علماء میں الشیخ احمد شاکر نے اس تاویل کو اختیار کیا ہے۔

(۲) ترمذی شریف کی روایت ہے۔ حدیث حسن غریب ہے۔ منذری نے کہا ہے کہ اس کے راوی ثقہ ہیں۔

(۳) بخاری اور مسلم کی روایت ہے۔ راوی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔

(۴) ترمذی شریف کی روایت ہے، شیخ شاکر نے کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے۔

(۵) بخاری اور مسلم کی روایت ہے۔ راوی ابو ہریرہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

(۶) ابن المبارک نے اس کی روایت کی ہے۔ حدیث مُرسَل ہے۔

(۷) فتاوی ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ ج ۳۳- ص ۸۱

(۸) سُننِ ترمذی کی روایت ہے۔

(۹) ایضاً

☆☆☆☆☆

تیسرا باب

عقائد

مسلم کو کافر قرار دینے میں غلوّ سے کام لینا

سوال: میرے پاس دو خطوط آئے ہیں۔ ایک قاھرہ سے اور دوسرا یمن سے۔ ان دونوں میں یکساں سوال ہے۔ سوال ہے کسی مسلمان کو کافر قرار دینے میں مبالغے سے متعلق۔ قاہرہ سے جو خط موصول ہوا ہے، اس میں سوال کرنے والے محترم بھائی نے ایک ایسی جماعت کی طرف اشارہ کیا ہے جو اپنے علاوہ تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیتی ہے۔ حالانکہ اس جماعت کا مرجعِ فکر و عمل قرآن و سنّت ہی ہے، لیکن ان کے افکار میں اتنا تشدد اور غلوّ ہے کہ وہ گناہِ کبیرہ کے مرتکب کو بھی کافر تصوّر کرتے ہیں۔ ان میں وہ اشخاص جو قدرے نرم رویّہ رکھتے ہیں ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر ایک دفعہ گناہِ کبیرہ سرزد ہو جائے تو کوئی بات نہیں ہے تاہم اس پر اصرار کرنے والا کافر ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ آج سارے مسلمان اگرچہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں لیکن وہ حقیقت میں مسلمان نہیں ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ بغیر کسی دلیل کے یہ باتیں کہتے ہیں، بلکہ اپنے عقیدے کے اِثبات میں قرآن و حدیث سے حوالے بھی پیش کرتے ہیں۔

یمن سے جو خط وصول ہوا ہے اس میں ہمارے یمنی بھائی نے ایک ایسے مسلم شخص کی طرف اشارہ کیا ہے، جس کا دعویٰ ہے کہ آج یمن اور یمن سے باہر تمام اُمتِ مسلمہ حقیقتاً مسلمان نہیں ہے، بلکہ وہ سب مرتد اور کافر ہیں۔ چاہے انہوں نے ارکانِ اسلام کو مضبوطی سے تھام رکھا ہو، چاہے وہ مرد ہوں یا عورت اور چاہے ان کا تعلّق دارُالحرب

سے ہو یا دار الاسلام سے، اب نہ جمعے کی نماز ہی صحیح ہوتی ہے اور نہ پنج وقتہ با جماعت نمازیں' کیونکہ یہ سب مرتدین کی اقتداء میں ہوتی ہیں۔ ایسی مرتد اُمت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام جائز نہیں' بلکہ سب سے پہلے انہیں کلمہ شہادت کی طرف بلانا چاہئے' کیوں کہ یہ سرے سے مسلمان ہی نہیں ہیں۔

چوں کہ آپ کا موقف اِفراط، تفریط اور غلوّ سے پاک ہوتا ہے اس لئے ہم نے آپ کی طرف رجوع کیا ہے۔ گزارش ہے کہ آپ ہمیں اس عقیدے سے متعلق بتائیں کہ آیا یہ صحیح ہے یا قرآن وسنّت کے خلاف؟

جواب: بے شبہ اُمتِ مسلمہ میں ایسی جماعت یا افراد کا ظہور جو علی الاُعلان تمام مسلمانوں کو کافر قرار دینے میں غلوّ سے کام لیتے ہوں ایک خطرناک بات ہے۔ لیکن ہمیں چاہئے کہ سب سے پہلے ہم ان اسباب وعوامل کو تلاش کریں جن کی وجہ سے ایسے افراد جنم لیتے ہیں۔ یہ بات میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس جماعت اور ان کے متشدد خیالات ونظریات کا سدِّ باب حکومت کے ڈنڈوں سے نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ افکار وعقائد کی اصلاح متبادل افکار ہی سے کی جا سکتی ہے۔ اس مقصد کی خاطر سختی اور ڈنڈے کا استعمال غلط افکار کے مزید پھیلنے کا سبب بن سکتا ہے۔ اور یہ متشدد افراد درحقیقت مخلص' دیندار اور نماز وروزہ کے پابند ہوتے ہیں۔ ان کے خیالات میں تشدد کا سبب' وہ تیزی سے پھیلتی ہوئی اخلاقی وفکری برائیاں ہیں جنہوں نے غیر مسلموں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ آگے بڑھنے سے قبل میں ان اسباب وعوامل کا بیان ضروری سمجھتا ہوں جن کی وجہ سے ایسے افراد جنم لیتے ہیں۔

۱۔ اُمتِ مسلمہ کے بعض افراد کا حقیقی طور پر ارتداد اور کفر میں مبتلا ہو جانا۔ ایسے افراد حکومت کی طاقت اور ذرائع ابلاغ عامہ کو استعمال کر کے اپنے ملحدانہ افکار ونظریات کی ترویج وتشہیر میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

۲۔ بعض علماءِ کرام نے ان ملحد اور بے دین افراد کی طرف سے غفلت برتی ہوئی

ہے اور وہ انہیں مسلمانوں ہی میں شمار کرتے ہیں۔

۳- دورِ حاضر میں ہر طرف داعیانِ حق کی سرکوبی کی جارہی ہے اور ہر ممکن طریقے سے ان پر عرصۂ حیات تنگ کیا جارہا ہے۔ اس کا ردِّ عمل یہ ہے کہ داعیانِ حق میں کچھ ایسے افراد ظاہر ہوتے ہیں جن کے خیالات میں تشدد اور افکار میں غلو ہوتا ہے۔

۴- ان کے پاس دینی حمیّت اور اسلامی جذبہ تو خوب ہوتا ہے' لیکن دینی سمجھ بوجھ اور اسلامی اصول وقواعد کا فہم وادراک کم ہوتا ہے۔ یہ ناپختہ شعور انہیں غلو اور تشدد کی طرف مائل کردیتا ہے۔

یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہئے کہ اسلام میں محض دینی حمیّت اور اخلاص ہی کافی نہیں ہے' بلکہ ساتھ ہی ساتھ اسلامی شریعت اور اس کے احکام کا تفقہ بھی نہایت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلفِ صالحین عبادت اور جہاد سے قبل علم حاصل کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔

ہمیں چاہئے کہ ہم صرف ان اشخاص کو کافر تصوّر کریں جو علی الاعلان کفر کی راہ پر گامزن ہیں۔ البتہ وہ لوگ جو صرف ظاہری طور پر مسلمان ہیں' اگرچہ اندرونی طور پر وہ ایمان سے عاری ہیں تو انہیں ہم کافر قرار دینے کے ہرگز مجاز نہیں۔ دُنیا میں ہم ان کے ساتھ مسلمانوں جیسا معاملہ کریں گے اور آخرت کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

وہ لوگ جو علی الاعلان کفر میں مبتلا ہیں اور ہم انہیں کافر کہہ سکتے ہیں، درج ذیل ہیں:

۱- کمیونسٹ حضرات' کیوں کہ یہ خدا اور مذہب کو تسلیم نہیں کرتے۔

۲- سیکولر خیالات کے حامل اشخاص' کہ یہ اللہ کی شریعت کو نہیں مانتے اور دین ودنیا دونوں کو الگ الگ شئ تصوّر کرتے ہیں۔

۳- وہ فرقے جو یقینی طور پر اسلام سے خارج ہیں مثلاً اسماعیلی فرقہ، بہائی فرقہ اور قادیانی فرقہ۔

یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ کسی متعیّن شخص کو کافر قرار دینا کوئی آسان کام نہیں۔ یعنی ہم کسی گروہ کی طرف اشارہ کر کے کہہ سکتے ہیں کہ وہ کافر ہیں مثلاً کمیونسٹ کافر ہوتے ہیں یا قادیانی کافر ہوتے ہیں یا جس نے فلاں بات کہی وہ کافر ہو گیا۔ لیکن کفر کو کسی متعیّن شخص کی طرف منسوب کر کے کہنا کہ فلاں شخص کافر ہے کوئی آسان کام نہیں، بلکہ یہ کافی غور طلب کام ہے اس لئے کہ کسی کو کافر قرار دینے کے بعد درج ذیل نتائج مرتّب ہوتے ہیں۔

۱- وہ شخص اب اپنی بیوی کے لئے حلال نہیں ہے۔ دونوں میں علیحدگی ضروری ہے۔

۲- اس کی اولاد اب اس کی نگہداشت میں نہیں رہے گی، کیوں کہ عین ممکن ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تربیت کافرانہ انداز میں کرے۔

۳- اب وہ مسلم معاشرے کی نصرت وحمایت سے محروم ہو گیا۔ اس کا سماجی بائیکاٹ ضروری ہے۔

۴- اگر اسلامی حکومت قائم ہے تو اس پر ارتداد کی حد قائم کی جائے گی یعنی سزائے موت۔

۵- مسلمانوں کے احکام اس پر نافذ نہیں ہوں گے۔ چنانچہ مرنے کے بعد نہ اسے غسل دیا جائے گا نہ نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی اور نہ وہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہو گا۔

۶- اگر وہ کفر وارتداد کی حالت ہی میں مر گیا تو لعنت کا مستحق ہوا اور اس کا انجامِ کار جہنم ہے جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔

ان سنگین نتائج کے پیشِ نظر ضروری ہے کہ ہم ان شرعی اصول وقواعد کو صرف قرآن وسنّت کی روشنی میں وضع کریں، جن کی بنیاد پر ہم کسی کو مسلم یا کافر کہہ سکتے ہیں۔ ذیل میں انہیں اصول وقواعد کا بیان ہے اور اس سلسلے میں ہمارا مرجع صرف قرآن اور سنّت

ہے۔ اگر کسی موقع پر ہم کسی عالم کے قول کو نقل کریں گے تو صرف سہارے کے لئے۔ اس سے استدلال مقصود نہیں ہوگا۔

۱- پہلا اصول یہ ہے کہ کوئی بھی شخص کلمۂ شہادت یعنی اشھد ان لا الہ الا اللّٰہ واشھد ان محمدا رسول اللّٰہ کا اقرار کرتے ہی اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔ اب اس پر مسلمانوں کے قوانین نافذ ہوں گے، خواہ اس نے شہادت کا اقرار صرف اپنی زبان سے کیا ہو اور دل سے وہ ہنوز کافر ہو۔ کیوں کہ دل کا حال تو صرف اللہ کو معلوم ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل احادیث کو دلیل کے طور پر پیش کرتا ہوں۔

۱- بخاری شریف کی روایت ہے کہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے ایک ایسے شخص کو میدانِ جنگ میں قتل کر ڈالا جس نے تلوار دیکھتے ہی کلمۂ شہادت کا اقرار کر لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس واقعے کی خبر ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی سخت سرزنش کی اور فرمایا کہ اس نے کلمۂ شہادت کا اقرار کر لیا تھا پھر بھی تم نے اسے قتل کر ڈالا۔ اسامہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ اس نے صرف تلوار کے خوف سے کلمۂ شہادت کا اقرار کیا تھا۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم نے اس کے دل کو چیر کر دیکھا تھا؟ یعنی تمہیں اس کے دل کا حال کیا معلوم؟

۲- نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر اس شخص کا اسلام تسلیم کر لیتے تھے جو کلمۂ شہادت کا اقرار کر لیتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا اسلام تسلیم کرنے کے لئے اس بات کا انتظار نہیں کرتے تھے کہ نماز کا وقت آئے تو وہ نماز پڑھ کر دکھائے یا رمضان کا مہینہ آئے تو روزے رکھ کر اپنے اسلام کو ثابت کرے۔ مسلمانوں کے زمرے میں شامل ہونے کے لئے اس کا زبان سے کلمۂ شہادت کا اقرار ہی کافی تھا۔

۳- بخاری و مسلم کی روایت ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَقُوْلُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ. فَاِذَا قَالُوْهَا

فَقَدْ عَصَمُوْا مِنِّیْ دِمَائَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّهَا وَحِسَابُهُمْ عَلَی اللّٰهِ۔

مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جہاد کروں حتیٰ کہ وہ اقرار کرلیں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے۔ جب وہ اس کا اقرار کرلیں گے تو ان کے مال وجان میری طرف سے محفوظ ہیں اور ان کا حساب وکتاب اللہ کے ذمہ ہے۔ (یعنی انہوں نے دل سے اسلام قبول کیا یا نہیں اس کا فیصلہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے لئے کلمۂ شہادت کا زبان سے اقرار کافی ہے۔ رہی دل کی بات تو اس کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، ہم بندوں کے ہاتھ میں نہیں۔

۲- دوسرا اصول یہ ہے کہ جس شخص نے اس حالت میں جان دی کہ وہ توحید پر قائم تھا اور شرک سے بالکل پاک تھا تو وہ اللہ کے یہاں دو باتوں کا مستحق ہوگا:

(i) جہنم میں ہمیشگی سے نجات۔ خواہ اس کی زندگی گناہوں سے آلودہ رہی ہو۔

(ii) اپنے گناہوں کی پاداش میں وہ اس وقت تک جہنم میں رہے گا جب تک اللہ کی مرضی ہوگی اس کے بعد اسے وہاں سے نکال کر جنت میں داخل کیا جائے گا۔ دلیل کے طور پر درج ذیل احادیث پیش کرتا ہوں:

ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَا مِنْ عَبْدٍ قَالَ: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ثُمَّ مَاتَ عَلٰی ذٰلِكَ اِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ۔

جس شخص نے اس حالت میں جان دی کہ وہ لا الٰہ الا اللہ کا قائل تھا، وہ جنت میں داخل ہوگا۔

ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اتانی۔ جبرائیل فبشرنی انه من مات من امتك لا یشرك باللہ دخ لالجنة۔ قلت وان زنی وان سرق ؟ قال وان زنی وان سرق۔

ایک دن جبرائیل میرے پاس تشریف لائے اور اس بات کی بشارت دی کہ تمہاری اُمت میں جو شخص اس حالت میں وفات پائے گا کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہو تو وہ ضرور جنت میں جائے گا۔ میں نے پوچھا کہ چاہے اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو؟ جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں چاہے اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو۔

انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يَخْرُجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَكَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِنَ الْخَيْرِ مَا يَزِنُ بَرَّةٍ

جہنم سے ہر وہ شخص نکلے گا جس نے اقرار کیا کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اور اس کے دل میں ایک گیہوں کے دانے برابر بھی بھلائی ہو۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ جنت میں داخلے کے لئے توحید کا اقرار کافی ہے۔ موحِد شخص نے چاہے کتنے بڑے بڑے گناہ کئے ہوں، وہ اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر ایک نہ ایک دن ضرور جنت میں جائے گا۔

۳- تیسرا اصول یہ ہے کہ کلمۂ شہادت پڑھ کر دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے بعد کلمہ گو شخص کے لئے لازمی ہے کہ وہ اسلام کے ان احکام وقوانین کی سچائی اور ان کے برحق ہونے کا بھی اقرار کرے، جو احکام قرآن وحدیث کی صریح دلیلوں سے ثابت ہوں۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو احکام وقوانین وضع کر دیئے، ان میں اب کسی کو یہ اختیار نہیں کہ چاہے تو کسی کو مانے اور چاہے تو کسی کا انکار کر دے۔ اب وہ اس بات کا مجاز نہیں ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق کسی حکم کو سچ مان کر اس کا اتباع کرے اور کسی حکم کو

غلط جان کر ترک کر دے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ

کسی مومن مرد یا عورت کے لئے جائز نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول ﷺ کسی معاملے میں فیصلہ کر دے تو اس معاملے میں ان کی اپنی کوئی مرضی ہو۔

یہاں احکام وقوانین سے مراد وہ احکام ہیں جو قرآن وسنّت کی واضح دلیلوں سے ثابت ہوں اور جن پر تمام اُمت کا اتفاق ہو' مثلاً نماز کی فرضیت یا قتل وزنا کی حُرمت یا شادی اور طلاق میں شریعت کے واضح احکام۔ اگر کسی مسلمان نے ان احکام وقوانین میں سے کسی ایک کا بھی انکار کیا یا اس کا مذاق اڑایا تو وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ اور اسے مرتد تصوّر کیا جائے گا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص زکوٰۃ کی فرضیت کو تسلیم نہیں کرتا یا زنا کی حلت کا قائل ہو تو اسے اسلام کے دائرے سے خارج تصوّر کیا جائے گا۔

۴- چوتھا اصول یہ ہے کہ گناہِ کبیرہ کا ارتکاب، اگر چہ اس پر اصرار ہو، ایمان میں کمی کا باعث تو ہوتا ہے' لیکن اسلام سے خارج نہیں کرتا۔ اس سلسلے میں چند دلیلیں پیش کرتا ہوں:

۱- بخاری شریف کی حدیث ہے: عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ایک ایسے شخص کا واقعہ بیان کرتے ہیں، جس کا نام عبداللہ تھا اور لوگ اسے حمار کہہ کر پکارتے تھے۔ اکثر وہ حضور ﷺ کو ہنسایا کرتا تھا۔ حضور ﷺ نے اسے شراب پینے کے جرم میں متعدّد بار سزا دی تھی۔ ایک دفعہ اسے شراب کی حالت میں حضور ﷺ کے پاس لایا گیا۔ آپ ﷺ نے اس پر شراب کی حد جاری کی' یعنی کوڑے لگوائے۔ ایک صحابی نے جو یہ دیکھ رہے تھے

فرمایا کہ اللہ کی لعنت ہو اس پر، کتنی دفعہ اسے شراب کی سزا مل چکی ہے۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس پر لعنت نہ بھیجو۔ بخدا تمہیں معلوم ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتا ہے۔

اس حدیث سے واضح ہے کہ حضور ﷺ نے شراب نوشی جیسے گناہِ کبیرہ پر اصرار کرنے کے باوجود اس شخص کو اسلام سے خارج نہیں قرار دیا۔ معلوم ہوا کہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب اور اس پر مصر رہنے والے شخص کو اسلام سے خارج نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔

۲- افک کے واقعے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر چند لوگوں نے بہتان تراشی کی تھی، ان لوگوں میں ایک صحابی مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ غزوۂ بدر میں شرکت کا شرف بھی انہیں حاصل تھا۔ یہ معلوم ہے کہ پاک دامن عورتوں پر بہتان تراشی گناہِ کبیرہ ہے جس کی حد اسی کوڑے ہیں۔ حضرت مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ اس گناہ کے مرتکب ہوئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی کہ وہ کبھی مسطح رضی اللہ عنہ سے صلہ رحمی نہیں کریں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مؤاخذہ کیا اور اللہ نے انہیں عفو و درگزر سے کام لینے کی تلقین کی۔

۳- گناہِ کبیرہ کا ارتکاب اگر اسلام سے خارج کر دینے والی چیز ہوتی، تو گناہِ کبیرہ اور ارتداد میں کوئی فرق نہ ہوتا۔ ہر صاحبِ معصیت کو مرتد تصور کیا جاتا اور اسے مرتد کی سزا (سزائے موت) دی جاتی۔ پھر تو زنا، قتل، چوری اور شراب نوشی وغیرہ گناہوں کے لئے الگ الگ حدیں نہ مقرر ہوتیں۔

۴- وہ صحیح حدیث جس کا تذکرہ، اس سے قبل ہو چکا ہے، جس میں جبرائیل علیہ السلام نے حضور ﷺ کو بشارت دی تھی کہ لا الہ الا اللہ کہنے والا جنت میں جائے گا، خواہ اس نے زنا یا چوری کا ہی ارتکاب کیوں نہ کیا ہو۔

صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ حضور ﷺ قیامت کے دن بعض گناہِ کبیرہ کے مرتکبین کی شفاعت کریں گے، اگر گناہِ کبیرہ کا مرتکب خارج از اسلام ہو جاتا، تو حضور ﷺ کبھی اس کی شفاعت نہ کرتے۔

۵- پانچواں اصول یہ ہے کہ شرک کے علاوہ ہر گناہ اور معصیت قابلِ معافی ہے، خواہ وہ گناہِ صغیرہ ہو یا کبیرہ۔ اللہ شرک کبھی معاف نہیں فرمائے گا۔ اس کے علاوہ جتنے بھی گناہ ہیں وہ اللہ معاف کر سکتا ہے۔ اگر اس کی مشیّت ہوئی۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ (النساء:۴۸)

بے شبہ اللہ اس بات کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ بھی معاف کر سکتا ہے۔

۶- چھٹا اصول یہ ہے کہ کفر کی دو قسمیں ہیں:

الف۔ کفرِ اکبر۔ وہ کفر جو انسان کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔

ب۔ کفرِ اصغر۔ وہ کفر جس سے انسان دائرۂ اسلام سے خارج تو نہیں ہوتا البتہ سزائے الٰہی کا مستحق ہو جاتا ہے۔

کفر اکبر سے مراد ہے اس شریعت یا دین کا انکار، جسے حضور ﷺ لے کر آئے۔ جو شخص بھی اس دین یا اس دین کی شریعت کا منکر ہو گا وہ اسلام سے خارج شمار کیا جائے گا۔

کفر اصغر سے مراد ناشکری اور کفرانِ نعمت ہے۔ یہ کفر قابلِ مؤاخذہ ضرور ہے، لیکن اسلام سے خارج نہیں کرتا۔ مثلاً حضور ﷺ نے فرمایا:

مَنْ حَلَفَ بِغَیْرِ اللّٰهِ فَقَدْ كَفَرَ۔

جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے کفر کیا۔

اور فرمایا:

سَبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُهٗ كُفْرٌ۔

مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے جنگ کرنا کفر ہے۔

ان احادیث میں کفر سے مراد وہ کفر نہیں ہے، جو اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ یہی

وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان صحابہ رضی اللہ عنہم کو کافر نہیں شمار کیا، جنہوں نے جنگِ جمل میں آپ سے جنگ کی تھی۔ بلکہ انہیں باغی قرار دیا۔ معلوم ہوا کہ مسلمانوں سے جنگ کرنا وہ کفر نہیں ہے، جو اسلام سے خارج کردے۔

۷- ساتواں اصول یہ ہے کہ کسی ایک ہی شخص میں بیک وقت ایمان اور کفر یا جاہلیت یا نفاق کا اکٹھا ہونا عین ممکن ہے۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے، جو بہت سی نظروں سے اوجھل ہے۔ عام لوگوں کا یہ تصوّر ہے کہ انسان یا تو مؤمن ہوتا ہے یا کافر۔ بہ یک وقت وہ مؤمن اور کافر دونوں نہیں ہو سکتا۔ یہ لوگ اس بات سے بے خبر ہیں کہ ان دونوں کی درمیانی کیفیت بھی ہوسکتی ہے یعنی ایک شخص کے مؤمن ہوتے ہوئے بھی کفر کی چند خصلتیں اس کے اندر موجود ہوں۔ یہ کوئی عجیب وغریب بات نہیں کہ کسی شخص کے اندر ایمان بہ درجہ اَتم موجود نہ ہو بلکہ نفاق یا کفر یا جاہلیت کی بعض عادتیں بھی اس کے اندر موجود ہوں۔ تبھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

اِنَّكَ اِمْرَءٌ فِيْكَ جَاهِلِيَّةٌ.

تم ایسے شخص ہو جس میں جاہلیت بھی ہے۔

دوسری حدیث ہے:

مَنْ مَّاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ نَفْسَهٗ بِالْغَزْوِ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِّنَ النِّفَاقِ.

جس کسی کو موت آئی اس حالت میں کہ اس نے جہاد نہیں کیا اور نہ جہاد کی خواہش ہوئی تو وہ نفاق کی ایک خصلت پر مرا۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

الغناء ينبت النفاق فی القلب.

موسیقی دل میں نفاق پیدا کرتی ہے۔

ان احادیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کسی مسلم شخص میں نفاق یا جاہلیت کی کچھ خصلتیں بھی موجود ہو سکتی ہیں۔ اور ان کی وجہ سے وہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔ ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سلفِ صالحین کا عقیدہ یہی ہے کہ کسی بھی شخص میں بیک وقت ایمان اور نفاق یا کفر دونوں ہو سکتے ہیں۔

۸- آٹھواں اصول یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت وفرماں برداری کے معاملے میں لوگوں کے مختلف درجات اور مراتب ہوتے ہیں۔ جو شخص جتنا اطاعت گزار اور فرماں بردار ہوگا، تقرّب الی اللہ اور تقویٰ میں بھی اسی قدر اعلیٰ مرتبے پر ہوگا۔ اسی لئے سلفِ صالحین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مؤمن کی ایمانی حالت میں کمی وبیشی ہوتی رہتی ہے۔ یہ تصوّر کر لینا غلط ہوگا کہ ہر مؤمن شخص کو لازمی طور پر فرشتہ صفت اور تمام گناہوں سے پاک ہونا چاہئے۔

یہ حقیقت' ایمان واطاعت میں لوگ مختلف المراتب ہوتے ہیں' قرآن وحدیث سے بھی ثابت ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ

(فاطر:۳۲)

پھر ہم نے اس کتاب کا وارث بنا دیا، ان لوگوں کو جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چن لیا۔ اب کوئی تو ان میں سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے اور کوئی بیچ کی راہ پر ہے اور کوئی اللہ کے اذن سے نیکیوں میں سبقت کرنے والا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اُمتِ مسلمہ کو تین مرتبوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک قسم ان لوگوں کی ہے جو اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں یعنی کثرتِ گناہ میں ملوث ہیں۔ دوسرے وہ جو درمیانی روش پر گامزن ہیں یعنی ان میں اچھائیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی۔ اور تیسری

قسم ان لوگوں کی ہے جو نیکیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔

حدیث شریف میں ہے:

مَنْ رَأَىٰ مِنكُمْ مُّنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ وَذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ۔

تم میں سے جو برائی دیکھے اسے چاہئے کہ وہ اسے بہ زورِ طاقت دور کرے، جو ایسا نہیں کرسکتا، وہ اپنی زبان سے دور کرے۔ جو ایسا بھی نہیں کرسکتا، وہ اپنے دل ہی میں اسے بُرا سمجھے اور یہ ایمان کا کمزور ترین پہلو ہے۔

اس حدیث سے واضح ہے کہ مؤمنین میں تین درجے ہوتے ہیں۔ ایک درجہ ان لوگوں کا ہے، جو بہ زورِ طاقت برائیوں کو روکتے ہیں، دوسرا ان لوگوں کا ہے جو زبان سے برائیوں کا مقابلہ کرتے ہیں اور تیسری قسم ان کمزور لوگوں کی ہے، جو برائیوں کی روک تھام پر قادر نہیں ہیں۔ البتہ دل سے انہیں بُرا تصوّر کرتے ہیں۔

اس طویل گفتگو اور ان دلائل و براہین کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی شخص کو کافر قرار دینا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ جو لوگ اپنے تقوے اور علم و فضل کے غرور میں مبتلا ہو کر اپنے علاوہ دوسروں کو کافر گردانتے پھرتے ہیں، ان کا عمل قرآن و سنّت کے خلاف ہے اور وہ تشدد اور غلوّ میں مبتلا ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

إِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فَإِنَّمَا أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمُ الْغُلُوُّ۔

غلو سے بچو، تم سے پیش تر قوموں کو غلوّ ہی نے ہلاک کیا تھا۔

مالک کی اجازت کے بغیر اس کی زمین پر قبر یا مسجد بنانا

سوال: مصری اخبار ''الاخبار'' میں شائع شدہ ایک عجیب و غریب واقعے پر نظر پڑی۔ یہ واقعہ یوں ہے کہ شیخ محمد الجمل نے اپنی وفات سے قبل یہ وصیّت کی کہ انہیں ان کے قصبے کے قبرستان سے تقریباً تین کلومیٹر دور ایک کھیت میں دفن کیا جائے۔ یہ کھیت کسی اور کی ملکیت تھا۔ چنانچہ قصبے کے لوگوں نے اس وصیّت پر عمل کرنے سے انکار کر دیا اور

ان کا جنازہ قبرستان کی طرف لے جانے لگے۔ حیرتناک بات یہ ہوئی کہ ان لوگوں نے جب بھی جنازے کو قبرستان کی طرف لے جانے کی کوشش کی' جنازہ اٹھانے والوں کو یہ محسوس ہوا کہ گویا کوئی قوت انہیں قبرستان کے بجائے متذکرہ کھیت کی طرف گھسیٹ رہی ہے۔ لوگوں نے پولیس کو خبر کی۔ پولیس والوں نے بھی جنازہ قبرستان کی طرف لے جانے کی پوری کوشش کی لیکن بے سود۔ ان کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ مجبوراً لوگوں نے شیخ کی وصیّت کے مطابق انہیں متذکرہ کھیت میں دفن کر دیا۔

سوال یہ ہے کہ دینی نقطہ نظر سے یہ واقعہ کہاں تک درست ہے؟ کیا زمین کے مالک کی اجازت کے بغیر اس کی زمین پر قبر یا مسجد بنائی جاسکتی ہے؟ قبر یا مسجد بنانے سے جو غلے کا نقصان ہوگا اس کی تلافی کون کرے گا؟

جواب: قصبے کے لوگوں نے اس قسم کی وصیّت پر عمل کرنے سے انکار کر دیا، صحیح کیا۔ کیونکہ اس قسم کی وصیّت اصولی طور پر غلط اور غیر شرعی ہے اور متعدد اسباب کی بنا پر شریعت اور سنّت کے خلاف ہے، مثلاً:

۱- پہلی وجہ یہ ہے کہ شیخ نے ایسی زمین میں دفن کرنے کی وصیّت کی جو ان کی ملکیت نہیں تھی اور نہ وہ قبرستان ہی ہے۔ اگر شیخ کو شریعت کا ذرا بھی علم ہوتا تو وہ ہرگز ایسی وصیّت نہ کرتے۔

۲- دوسری وجہ یہ ہے کہ شیخ نے یہ وصیّت کر کے اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلے میں ایک امتیازی حیثیت عطا کرنی چاہی تھی۔ قبرستان جہاں عوام وخواص سارے دفن کئے جاتے ہیں' اسے چھوڑ کر کسی علیحدہ زمین میں ان کو دفن کرنا' انہیں دوسروں کے مقابلے میں امتیازی حیثیت عطا کرنا ہے، جو بعد میں شرک کا موجب بن سکتا ہے۔

۳- بغیر کسی فائدہ اور جواز کے خواہ مخواہ لوگوں کو یہ ایک ایسے کام کے لئے مجبور کرنا ہے جس کے لئے وہ مامور نہیں ہیں۔

رہی یہ عجیب وغریب بات کہ کوئی ماورائی قوت انہیں ان کی مرضی کے خلاف

قبرستان کے بجائے کھیت کی طرف زبردستی کھینچ رہی تھی یا تو اس طرح کی حکایتیں گاؤں یا قصبوں خصوصاً ضعیف الاعتقاد اور کم پڑھے لکھے لوگوں میں نہایت تیزی سے پھیلتی ہیں اور لوگ انہیں فوراً قبول کر لیتے ہیں۔ خصوصاً اگر معاملہ کسی ایسے شخص کا ہو جسے وہ اس کی زندگی میں ولی اللہ سمجھ بیٹھے ہوں۔ اس طرح کے واقعات نہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے عہد میں ثابت ہیں نہ تابعین کے دور میں، تو کیا آج کے مشائخ ان صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم سے افضل ہیں؟

رہی اس واقعے کی عقلی توجیہ تو وہ یوں کی جا سکتی ہے:

۱- ہو سکتا ہے کہ جنازہ اٹھانے والوں نے جان بوجھ کر یہ قصہ گھڑ لیا ہو اور اس کی تشہیر بھی کر دی ہو تا کہ اس کے ذریعے سے شیخ کی کرامت اور ولی اللّٰہی ثابت کی جا سکے۔

۲- ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ایسا جان بوجھ کر نہ کیا ہو بلکہ کسی نفسیاتی دباؤ اور اثر کی وجہ سے انہیں ایسا محسوس ہوا ہو۔ علمِ نفسیات کا طالب علم بہ آسانی یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ نفسیاتی دباؤ کے تحت انسان وہ کچھ کر بیٹھتا ہے، جس کا وہ ارادہ نہیں کرتا۔

۳- یہ بات بھی خارج از امکان نہیں کہ بدمعاش قسم کے جنّوں نے یہ گل کھلایا ہو تا کہ لوگوں کو شیخ کے ساتھ خوش اعتقادی میں مبتلا کر کے انہیں شرک کی طرف مائل کر سکیں۔ شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ نے اس طرح کے متعدّد واقعات نقل کئے ہیں۔

حیرت کی بات ہے کہ اس طرح کے واقعات عام طور پر کم پڑھے لکھے لوگوں، گاؤں، قصبوں یا ایسے علاقوں میں جنم لیتے ہیں جہاں ضعیف الاعتقاد لوگ رہتے سہتے ہیں۔ ورنہ سعودی عرب یا قطر ایسے ملکوں میں ایسے واقعات کیوں نہیں جنم لیتے؟

رہا وہ نقصان جو قبر بنانے کی وجہ سے کھیت کے مالک کو اٹھانا پڑا، تو اسے پورا حق حاصل ہے کہ وہ اس کی تلافی کا مطالبہ کرے اور ساتھ ہی اس قبر کو ہٹائے جانے کا مطالبہ کرے جس کی وجہ سے اسے نقصان ہوا۔ اس قبر کا وہاں سے ہٹانا یوں بھی ضروری ہے کہ

اس طرح کی قبریں بہت جلد ضعیف الاعتقاد لوگوں کو شرک اور قبر پرستی کی طرف مائل کر دیتی ہیں۔

رہی وہ مسجد جو اس قبر پر مالک کی اجازت کے بغیر بنائی گئی، اس میں نماز پڑھنا حرام ہے۔ کیونکہ:

۱- تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ غاصبانہ طریقے سے حاصل کی گئی زمین پر نماز پڑھنا جائز نہیں۔

۲- متعدّد احادیث میں حضور ﷺ نے قبروں پر مسجد بنانے سے منع فرمایا ہے اور ایسا کرنے کی وجہ سے یہود و نصاریٰ پر لعنت بھی فرمائی ہے۔

اسی لئے فقہاء کی رائے ہے کہ مسجد یا قبر میں سے جو چیز بعد میں بنائی گئی ہے اسے منہدم کر دیا جائے۔ اگر مسجد بعد میں بنی ہے تو مسجد منہدم کر دی جائے ورنہ قبر ہٹا دی جائے۔ اس کی مثال ''مسجدِ ضرار'' کی ہے جس کی بنیاد تقوے پر نہیں تھی' بلکہ مسلمانوں میں تفرقہ اور فساد برپا کرنے کی خاطر بنائی گئی تھی۔ غزوۂ تبوک سے واپسی پر اللہ نے حضور ﷺ کو اس مسجد کے انہدام کا حکم دیا۔ مسجدِ ضرار کے واقعہ سے دو باتیں اخذ کی جا سکتی ہیں:

۱- اوّل' یہ کہ ان عمارتوں اور جگہوں کو جلانا یا منہدم کرنا جائز ہے جہاں اللہ کی معصیت کا ارتکاب ہو رہا ہو۔

۲- دوم' یہ کہ وقف میں ایسی چیزیں بنانا صحیح نہیں ہے جن کی بنیاد اللہ کی معصیت اور نافرمانی پر ہو۔ (۱)

نبی ﷺ کے معجزات

سوال: میلاد النبی ﷺ کی محفل میں ہم حضور ﷺ کے معجزات پر گفتگو کر رہے تھے، وہ معجزات جو حضور ﷺ کی ولادت کے موقع پر ظاہر ہوئے اور وہ جو اس ولادت کے بعد ظاہر ہوئے، جیسا کہ عام طور پر لوگ میلاد النبی ﷺ کی محفلوں میں ان معجزات کا

تذکرہ کرتے ہیں۔ حاضرینِ مجلس میں سے ایک شخص نے معجزات پر گفتگو کرتے ہوئے ان تمام معجزات کو ماننے سے انکار کر دیا جن کا اکثر تذکرہ لوگوں کی زبانوں پر ہوتا ہے۔ مثلاً ہجرت کے موقع پر غار کے منہ پر کبوتروں کا انڈا دینا، مکڑی کا جالا بننا یا پھر ہرنی کا آپ ﷺ سے ہم کلام ہونا، وغیرہ وغیرہ۔ اس شخص نے مزید یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو صرف ایک معجزہ عطا کیا تھا جو تمام دنیا کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ ہے قرآنِ عظیم۔

امید ہے کہ آپ نبی ﷺ کے معجزات سے متعلق مفصل اور مدلّل گفتگو فرمائیں گے۔

جواب: نبی ﷺ کے معجزات کے بارے میں آپ نے جس شخص کے موقف کا تذکرہ کیا ہے اس کی بعض باتیں برحق ہیں اور بعض غلط۔ ایسا نہیں ہے کہ جن معجزات کا لوگ اکثر تذکرہ کرتے ہیں وہ ساری کی ساری غلط ہیں یا ساری کی ساری مبنی برحق ہیں۔ ان مواقع پر غلط اور صحیح کا معیار اپنی عقل اور جذبات کو نہیں بنایا جا سکتا' بلکہ ہمیں کتاب اللہ، صحیح احادیث اور صحیح روایتوں کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

معجزاتِ رسول ﷺ کے معاملے میں تین قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں:

۱- پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جو ہر قسم کے معجزے کو مبنی برحق تصوّر کرتے ہیں۔ جن معجزات کا تذکرہ کتابوں میں ہو یا لوگوں کی زبانوں پر اس معاملے میں وہ ذرا بھی احتیاط نہیں برتتے اور ہر ضعیف وسقیم قسم کی روایت کو قبول کر لیتے ہیں خواہ وہ روایت دینِ اسلام کے مزاج سے مطابقت رکھتی ہو یا نہ رکھتی ہو۔

اس پہلی قسم کا تعلّق عوام النّاس سے ہے اور عام طور پر میلاد النبی ﷺ کی محفلوں میں نعتیہ نظموں میں ان معجزات کا تذکرہ کثرت سے ہوتا ہے۔

۲- ان کے مقابلے میں دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو سرے سے تمام معجزات کا انکار کرتے ہیں۔ ان کی رائے یہ ہے کہ حضور ﷺ کا واحد معجزہ قرآن کریم ہے۔ یہی

ایک معجزہ ہے جو تمام دنیا والوں کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب بھی اللہ نے کفار ومشرکین سے اس قرآن کی طرح کی صرف ایک آیت یا سورہ لانے کو کہا، کفار ومشرکین اس چیلنج کا جواب دینے میں ناکام رہے۔ کفار ومشرکین نے جب بھی حضور ﷺ سے معجزات کی مانگ کی اللہ تعالیٰ نے قطعی طور پر ان کی مانگیں رد کردیں۔ اللہ کا ارشاد ہے:

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا ۝ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۝ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۝ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ (بنی اسرائیل:۹۰-۹۳)

اورانہوں نے کہا کہ ہم تیری بات نہ مانیں گے جب تک کہ تو ہمارے لئے زمین کو پھاڑ کر ایک چشمہ جاری نہ کردے یا تیرے لئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہو اور تو اس میں نہریں رواں کردے۔ یا تو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہمارے اوپر گرادے جیسا کہ تیرا دعوٰی ہے یا خدا اور فرشتوں کو رُو در رُو ہمارے سامنے لے آئے یا تیرے لئے سونے کا ایک گھر بن جائے یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک کہ تو ہمارے اوپر ایک ایسی تحریر نہ اتار لائے جسے ہم پڑھیں۔ اے نبی ﷺ ان سے کہو! پاک باعظمت ہے میرا پروردگار! کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں؟

ایک دوسری آیت میں اللہ نے ان کی مانگوں کو قبول نہ کرنے کے سبب کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے:

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ وَاٰتَيْنَا

ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ط وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ۝ (بنی اسرائیل:۵۹)

اور ہم کو نشانیاں بھیجنے سے نہیں روکا مگر اس بات نے کہ ان سے پہلے کے لوگ ان کو جھٹلا چکے ہیں۔ چنانچہ دیکھ لو' ثمود کو ہم نے علانیہ اونٹنی لاکر دی اور انہوں نے اس پر ظلم کیا۔ ہم نشانیاں اسی لئے تو بھیجتے ہیں کہ لوگ انہیں دیکھ کر ڈریں۔

ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، معجزات کی فرمائش کے بدلے میں اس نے قرآن نازل کیا جو تمام معجزات کے مقابلہ میں اکیلا ہی کافی ہے:

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ط (العنکبوت:۵۱)

اور کیا ان لوگوں کے لئے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

حکمت کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ محمد ﷺ کا معجزہ ایک عقلی اور ادبی قسم کا معجزہ ہو نہ کہ مادی اور جینیاتی قسم کا' تاکہ رہتی دنیا تک یہ معجزہ لوگوں کے لئے ایک چیلنج کی صورت میں برقرار رہے:

اپنی اسی رائے کی تائید میں یہ لوگ ایک صحیح حدیث بھی پیش کرتے ہیں:

مَا مِنْ نَبِيٍّ مِنَ الْاَنْبِيَاءِ اِلَّا وَقَدْ اُعْطِيَ مِنَ الْاٰيَاتِ مَا مِثْلُهُ اٰمَنَ عَلَيْهِ الْبَشَرُ وَاِنَّمَا كَانَ الَّذِيْ اُوْتِيْتُهُ وَحْيًا اَوْحَاهُ اللّٰهُ اِلَيَّ۔ (بخاری)

ہر نبی کو اللہ نے چند نشانیاں اور معجزے عطا کئے اور ان نشانیوں کی تعداد کے برابر ان پر ایمان لانے والے بھی رہے۔ وہ معجزہ جو مجھے عطا کیا گیا ہے وہ اللہ کی وحی (قرآن) ہے۔

۳- تیسری قسم ان لوگوں کی ہے، جن کی رائے درمیانی ہے۔ یعنی وہ نہ تمام معجزات کا انکار کرتے ہیں اور نہ تمام کا اقرار۔ اور یہی وہ رائے ہے جو میرے نزدیک قابلِ ترجیح

ہے۔اس رائے کی تفصیل یہ ہے:

الف: بلاشبہ قرآن کریم حضور ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ ہے جو رہتی دنیا تک تمام لوگوں کے لئے چیلنج ہے اور حضور ﷺ کی صداقت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ب: اس معجزے کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو چند دوسرے معجزات سے نوازا تھا' لیکن ان معجزات کی حیثیت چیلنج یا لوگوں پر حجت قائم کرنے کے لئے نہیں تھی۔ جیسا کہ دیگر انبیاء کا معاملہ تھا' بلکہ یہ معجزات حضور ﷺ کے لئے باعثِ تکریم و تعظیم اور خدا کی طرف سے باعثِ نصرت و رحمت تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان معجزات کا ظہور کافروں کی فرمائش پر نہیں ہوا' بلکہ کسی مصیبت کی گھڑی میں ہوا۔ مثال کے طور پر غزوۂ بدر کے موقع پر بارش کا ہونا جس سے صرف مؤمنین فیض یاب ہوئے اور کفار اس سے محروم رہے' حالانکہ وہ مؤمنین سے صرف چند گز کے فاصلے پر تھے۔ یا مثال کے طور پر اسراء و معراج کا واقعہ جس کا تذکرہ قرآن اور حدیث دونوں میں ہے۔

ج: ہم صرف ان ہی معجزات پر ایمان رکھتے ہیں جن کا تذکرہ قرآن یا صحیح حدیث میں ہو۔ جو معجزات قرآن یا صحیح حدیث سے ثابت نہ ہوں ان کی حیثیت ہماری نظروں میں ذرّہ برابر نہیں ہے۔

ذیل میں بعض ان معجزات کا تذکرہ ہے جو صحیح احادیث سے ثابت ہیں:

۱۔ منبرِ رسول ﷺ بننے سے قبل آپ ﷺ جس کھجور کے تنے پر کھڑے ہو کر خطبہ دیتے تھے اس تنے کا اس وقت آہیں بھرنا جب آپ ﷺ نے منبر بننے کے بعد اس کا استعمال ترک کر دیا۔ اس کی آہیں سن کر آپ ﷺ اُس کے پاس آئے اور اپنا مبارک ہاتھ اس پر رکھ دیا' چنانچہ وہ خاموش ہو گیا۔

۲۔ صحیح احادیث میں مختلف ایسے واقعات کا تذکرہ ہے کہ غزوہ یا سفر میں پانی کی قلّت کے موقع پر آپ ﷺ نے ان طریقوں سے پانی حاصل کیا جن سے پانی حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر یہ واقعہ کہ حضور ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ زوراء

کے مقام پر تھے۔ آپ ﷺ نے پانی سے بھرا ایک پیالہ منگوایا اور اس میں اپنی ہتھیلی ڈال دی۔ آپ ﷺ کی انگلیوں سے پانی کا چشمہ جاری ہو گیا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے بھی وضو کیا اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی۔ اسی طرح حدیبیہ کے موقع پر آپ ﷺ نے سوکھے ہوئے کنویں میں اپنے وضو کا بقیہ پانی ڈال دیا اور دعا کی۔ چنانچہ کنواں پانی سے لبالب ہو گیا۔

۳- صحیح احادیث میں ایسے واقعات کا بھی تذکرہ ہے کہ مصیبت کی گھڑی میں آپ ﷺ نے دعا کی اور اللہ نے فوراً آپ کی دعا قبول کی۔ مثلاً غزوۂ بدر کے موقع پر بارش کی دعا یا اسی غزوہ میں فتح کی دعا۔ اسی طرح عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے لئے تفقہ فی الدین کی دعا اور انس رضی اللہ عنہ کے لئے کثرتِ اولاد اور لمبی عمر کی دعا اور یہ ساری دعائیں حرف بہ حرف مقبول ہوئیں۔

۴- صحیح احادیث میں آپ ﷺ کی بعض پیشین گوئیوں کا تذکرہ ہے، جو حرف بہ حرف پوری ہوئیں۔ مثلاً یمن، بُصریٰ اور فارس پر مسلمانوں کی فتح کی پیشین گوئی۔ حضرت عمارہ رضی اللہ عنہ کے لئے یہ پیشین گوئی کہ انہیں ایک ظالم گروہ قتل کرے گا اور ایسا ہی ہوا۔ یا پھر قسطنطنیہ پر مسلمانوں کی فتح کی پیشین گوئی۔

ہجرت کے موقع پر غار کے منہ پر کبوتر کے انڈا دینے کا تذکرہ کسی صحیح حدیث میں موجود نہیں ہے۔ مکڑی کے جال بننے کی روایت کو بعض علماء نے ضعیف اور بعض نے صحیح قرار دیا ہے۔ لیکن قرآن کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اللہ نے آپ ﷺ کی مدد غیر مرئی (نہ دکھائی دینے والی) چیزوں سے کی تھی حالانکہ کبوتر کا انڈا یا مکڑی کا جالا غیر مرئی چیزیں نہیں ہیں۔ اس لئے ان روایات کا ماننا قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتا۔

تقدیر کا مسئلہ

سوال: اس دنیا میں انسان کے ساتھ جو کچھ پیش آتا ہے کیا وہ ازل سے اس کی تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے؟ اس کی موت، اس کا رزق، اس کی کامیابی اور اس کا جنتی یا

دوزخی ہونا؟ اگر یہ سب کچھ پہلے ہی سے لکھا جا چکا ہے تو پھر کسی قسم کی کوشش اور دوڑ بھاگ کی کیا ضرورت ہے؟ کسی حادثے میں زخمی شخص کی جان بچانے کی کوشش کیونکر ہو؟ اس کی زندگی ہوگی تو وہ بچ ہی جائے گا۔ تجارت وزراعت میں اتنی محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ جو کچھ مقدر میں ہے وہ تو مل ہی جائے گا۔

جواب: یہ کوئی نیا سوال نہیں ہے۔ یوں لگتا ہے کہ زمانہ خواہ کتنا بھی طویل ہو ہر زمانے میں یہ سوال پوچھا جائے گا۔ یہ ایسا کوئی حیران کن مسئلہ نہیں ہے' کیونکہ اسلام نے اس کا تشفی بخش جواب دیا ہے۔

۱- یہ برحق ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہوتا ہے، سب ازل سے لکھا جا چکا ہے۔ یہ ایک ایسا اسلامی عقیدہ ہے جس میں شک کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ ہی نے اس ساری کائنات کی تخلیق کی۔ زمین وآسمان، نباتات وجمادات، انسان اور حیوان سب اسی نے پیدا کئے اور یہ کہ اس کی تخلیق سے قبل ہی اس کا علم ان سب چیزوں پر محیط تھا، جو اس کائنات میں ابد تک رونما ہونے والی ہیں۔ چنانچہ جو کچھ بھی اس دنیا میں ہوتا ہے، اس کے علم اور ارادے کے مطابق ہی ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ○ (الانعام:۵۹)

درخت سے گرنے والا کوئی ایسا پتا نہیں جس کا علم اسے نہ ہو۔ زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں، جس سے وہ باخبر نہ ہو۔ خشک وتر سب کچھ ایک کھلی کتاب میں لکھا ہوا ہے۔

دوسری آیت ہے:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ○ (الحدید:۲۲)

کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو زمین میں یا تمہارے اپنے نفس پر نازل ہوتی ہو اور ہم نے اس کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب میں لکھ نہ رکھا ہو۔ ایسا کرنا اللہ کے لئے بہت آسان کام ہے۔

۲- کائنات میں ابد تک رونما ہونے والی تمام چیزوں کے بارے میں اللہ کا شامل وکامل علم ہونا اور ان سب کا تقدیر میں لکھا ہوا ہونا، اس بات کے منافی نہیں ہے کہ انسان عمل کرے، جدوجہد کرے اور کچھ پانے کی کوشش کرے۔ کیونکہ تقدیر میں جس طرح اس نے نتائج اور انجام لکھے ہیں اسی طرح وہ اسباب اور عوامل بھی لکھے ہیں، جن پر یہ نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اگر کسی شخص کی قسمت میں کامیاب ہونا لکھا ہے تو اس کی قسمت میں وہ عوامل بھی لکھے ہیں، جن کی وجہ سے وہ کامیاب ہوا۔ مثلاً محنت کرنا یا اپنی عقل استعمال کرنا وغیرہ، جس کی وجہ سے اسے کامیابی نصیب ہوئی۔ چنانچہ عمل کرنا اور جدوجہد کرنا تقدیر کے منافی نہیں ہے، بلکہ یہ سب کچھ تقدیر کا ہی ایک حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضور ﷺ سے دواؤں کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ کیا ان دواؤں سے ان بیماریوں پر قابو پایا جا سکتا ہے جو تقدیر میں لکھی ہیں؟ آپ ﷺ کا فیصلہ کن جواب تھا کہ دوائیں بھی تقدیر کا ایک حصہ ہیں۔

ملکِ شام میں جب وبائی مرض پھیلا اور عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ وہاں جانے سے پرہیز کیا تو کسی نے سوال کیا:

اتفر من قدر الله يا امير المؤمنين!

اے امیر المؤمنین کیا آپ اللہ کی لکھی ہوئی تقدیر سے بھاگ رہے ہیں؟

تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

نعم، نفر من قدر الله الى قدر الله.

ہاں، ہم اللہ کی ایک تقدیر سے دوسری تقدیر کی طرف بھاگ رہے ہیں۔

یعنی ہمارا وبائی مرض سے بھاگنا بھی تقدیر ہی کا ایک حصہ ہے۔

۳- یہ بات بھی برحق ہے کہ تقدیر کی باتیں ہم سے پوشیدہ ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ ہماری تقدیروں میں کیا لکھا ہوا ہے۔ لیکن ہمیں حکم ہے کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھیں بلکہ کام کریں۔ اسباب وعوامل کو اختیار کریں۔ تمام احتیاطی تدابیر اپنائیں۔ اور یہ سب تو اس ہستی نے بھی کیا تھا جس کا خدا پر ایمان تمام انسانوں کے ایمان سے کہیں بڑھ کر تھا۔ یعنی رسول اللہ ﷺ نے۔ چنانچہ انہوں نے لشکر تیار کیئے۔ کفار سے جنگیں کیں، زرہ پہنی، مدینہ کے اطراف میں احتیاطاً خندق کھودی۔ حبشہ اور مدینہ کی طرف ہجرت کا حکم دیا۔ ہجرت کے موقع پر غار میں روپوش ہوئے، اپنے گھر والوں کے لئے ایک سال کے لئے غلّہ جمع کیا، وغیرہ وغیرہ

۴- تقدیر کا بہانہ بنا کر انسان کو کاہلی اور سستی کی طرف مائل نہیں ہونا چاہئے۔ تقدیر پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے انسان کچھ کرے، اسباب وعوامل اختیار کرے، کچھ جدوجہد کرے اور ان سب کے بعد نتیجہ خدا کی مرضی پر چھوڑ دے۔

حضور ﷺ کے سامنے دو صحابہ رضی اللہ عنہم نے کشتی لڑی۔ ہارنے والا بغیر کسی محنت اور کوشش کے ہار گیا اور ہارنے کے بعد کہا کہ اللہ میرا مددگار ہے۔ حضور ﷺ سخت ناراض ہوئے۔ فرمایا: پہلے محنت کرو، کوشش کرو، اس کے بعد ہار جاؤ تب کہو کہ اللہ میرا مددگار ہے۔ (ابوداؤد)

۵- تقدیر پر ایمان کا فائدہ یہ ہے کہ انسان تمام کوششوں کے باوجود اگر ناکامی کا سامنا کرتا ہے تو اس پر مایوسی طاری نہیں ہوتی۔ مصیبت کی گھڑیوں میں صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا اور محنت ومشقت کے صلے میں جو کچھ بھی اسے نصیب ہوتا ہے، خدا کی مرضی سمجھ کر اسی پر خوش وخرم اور صابر وشاکر رہتا ہے۔

تقدیر کا عقیدہ اگر اُمتِ مسلمہ کے ذہنوں میں جاگزیں ہو جائے تو ایک ایسی اُمت تیار ہو سکتی ہے جو اندرونی طور پر طاقتور ہوگی اور اس کے اندر مجاہدانہ صفات موجود ہوں گی۔ وہ اُمت اس قابل ہوگی کہ تاریخ کی لگام اپنے ہاتھوں میں لے لے۔

روحوں کا چکر

سوال: آج کل لوگوں میں روحوں کو بلانے، ان سے غیب کی باتیں معلوم کرنے اور علاج معالجے کا مشغلہ کافی عام ہے۔ ذرائع ابلاغ نے بھی ان حرکتوں کی اتنی تشہیر کر دی ہے کہ اچھی خاصی تعداد میں لوگ اس چکر میں آ گئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ روحوں کا کیا معاملہ ہے؟ کیا یہ مُردوں کی روحیں ہوتی ہیں؟ یا کوئی دوسری مخفی قوت جو ڈبوں میں حرکت لاتی ہے۔ قلم خود بخود چلنے لگتے ہیں اور ایسے جوابات لکھتے جاتے ہیں جو صحیح بھی ہوتے ہیں اور غلط بھی۔ یا یہ محض ایک چال اور فریبِ نظر ہے؟ کیا روحوں کو عالم برزخ سے بلانا ممکن ہے؟ کیا ان سے غیب کی باتیں معلوم کرنا صحیح ہے؟ کیا وہ خبریں جنہیں روحیں لاتی ہیں' ان کی تصدیق کرنا جائز ہے اور کیا ان سے علاج کرانا درست ہے؟

جواب: ہم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ کوئی ایسی خفیہ طاقت ضرور ہوتی ہے جو ڈبوں میں حرکت پیدا کرتی ہے۔ قلم خود بخود چلنے لگتے ہیں اور لکھنے لگتے ہیں۔ مخفی قوتیں ایسے جواب لے کر آتی ہیں جو صحیح بھی ہوتے ہیں اور غلط بھی۔ اس بات سے ہم اس لئے انکار نہیں کر سکتے کہ ایک دنیا نے کھلی آنکھوں سے اسے دیکھا ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیے کہ ہم دینی اصول و نظریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس بات کی تحقیق کریں۔

ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اس کائنات میں کچھ ان دیکھی (غیر مرئی) مخلوقات بھی بستی ہیں۔ مثلاً:

۱- فرشتے: یہ اللہ کی نورانی مخلوق ہے جس کے ذمہ اللہ نے مختلف کام لگا رکھے ہیں۔ مثلاً اچھے اور بُرے اعمال لکھنا، موت کے وقت روحیں قبض کرنا، اچھے بندوں کی حفاظت کرنا، وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایک ایسی مخلوق ہے جو فطرتاً اللہ کی نافرمانی نہیں کر سکتی۔ اللہ کی مرضی کے خلاف ایک قدم نہیں اٹھا سکتی۔ اللہ اس کے بارے میں فرماتا ہے:

لَّا يَعْصُونَ اللَّهَ مَآ أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ۝ (التحریم:۶)

جو کبھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انہیں دیا جاتا ہے،

اسے بجالاتے ہیں۔

۲- فرشتوں کی روحیں: ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ موت کے بعد بھی روحیں زندہ رہتی ہیں۔ جسم کے مرنے سے روحوں کی موت واقع نہیں ہوتی۔ انہیں یا تو عذاب سے دوچار ہونا ہوتا ہے یا پھر رحمت ونعمت سے لطف اندوز ہوتی ہیں۔ قرآن وحدیث سے متعدّد حوالے اس ضمن میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً شہیدوں کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ وہ زندہ ہوتے ہیں، اللہ کی طرف سے انہیں رزق حاصل ہوتا رہتا ہے:

بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ۝ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ (آل عمران:۱۶۹)

وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں اپنے رب کے پاس رزق پارہے ہیں۔ جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اس پر خوش ہیں۔

نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ مردے جنازہ لانے والوں کے قدموں کی چاپ بھی سنتے ہیں جب وہ واپس ہورہے ہوتے ہیں۔ (۲) نبی ﷺ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ جب ہم قبرستان سے گزریں تو مُردوں کو مخاطب کرکے ان پر سلامتی بھیجیں۔ (۳) ان احادیث سے واضح ہے کہ مُردے عالم برزخ میں زندہ رہتے ہیں۔

۳- جنّ: ہم انسانوں کی طرح جنّ بھی اللہ کی ایسی مخلوق ہے کہ جو مکلّف ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں متعدّد جگہ انہیں مخاطب کیا ہے۔ ''يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ'' ان کے سلسلے میں پوری ایک سورہ نازل ہوئی، جس کا نام سورۃ الجن ہے۔ اس سورۃ میں ان کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ان میں نیک بھی ہوتے ہیں۔ (۴) جو نیک ہیں وہ جنت میں جائیں گے اور جو بد ہوں گے وہ دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔ جنّوں میں جو بُرے ہوتے ہیں، انہیں ہم شیاطین کی حیثیت سے جانتے ہیں اور یہ ابلیس ملعون کی اولاد ہیں یا جو انسانوں کو بہکانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

اب ہمیں اس بات کی تحقیق کرنی چاہئے کہ ان تین غیر مرئی مخلوقات میں سے کون

سی مخلوق ہے، جو ڈبے اور قلم میں حرکت پیدا کرتی ہے اور غیب کی باتیں بتاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانوں کو بہکانے کا کام فرشتوں کا نہیں ہوسکتا' کیوں کہ یہ اللہ کی نافرمانی ہے اور فرشتے اللہ کی نافرمانی نہیں کر سکتے۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ کام مُردوں کی روحیں انجام دیتی ہیں' کیوں کہ مرنے کے بعد روحیں اس طرح کے بے مقصد اور لایعنی کاموں کے لئے فارغ اور آزاد نہیں رہتی ہیں' بلکہ روحیں یا تو جنت میں ہوتی ہیں یا دوزخ میں۔ قرآن پاک کی متعدد آیات میں اس بات کا تذکرہ ہے کہ مرنے کے فوراً بعد روحوں پر عذاب یا نعمتوں کا دَور شروع ہو جاتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ نیک بندوں کی روحیں جنت کے درختوں پر چڑیوں کی طرح چہچہاتی رہتی ہیں۔ قرآن وحدیث میں کہیں بھی اس بات کا ثبوت نہیں ملتا کہ روحیں یوں آزاد چھوڑ دی جاتی ہیں کہ وہ لوگوں کے بُلانے پر حاضر ہو جائیں۔ قلم کو حرکت دیں اور کچھ لکھیں اور غیب کی باتیں بتائیں۔ بخاری ومسلم کی روایت ہے کہ جب حضور ﷺ نے بدر کی جنگ سے فراغت کے بعد مشرکین کی لاشیں جمع کرکے ایک کنویں میں ڈال دیں تو ایک ایک کا نام لے کر پکارا۔ اے فلاں ابن فلاں کیا تم نے اپنا انجام پالیا، جس کا اللہ نے تم سے وعدہ کیا تھا؟ میں نے تو اپنا انجام پالیا جس کا میرے رب نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! یہ تو مُردے ہیں پھر آپ ﷺ انہیں کیوں مخاطب کررہے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ بھی تمہاری طرح میری تمام باتیں سن رہے ہیں، لیکن جواب نہیں دے سکتے۔

جب یہ افضل البشر محمد ﷺ کو جواب نہیں دے سکتے تو یہ دوسروں کی آواز پر لبیک کیسے کہہ سکتے ہیں؟

فرشتوں اور روحوں کے بعد اب جنّ ہی بچ رہتے ہیں، جنّ سے یہ سب کام انجام دینے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ قرآن اور حدیث میں جنّوں کے بارے میں جو کچھ ہمیں بتایا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنّ ایسا کرنے پر قادر ہیں' بلکہ بُرے اور بدمعاش قسم کے جن تو اسی طرح کے کام کرتے رہتے ہیں تاکہ انسانوں کو زیادہ سے زیادہ راہِ

راست سے دور لے جاسکیں۔ حدیث میں ہے کہ ہر انسان کے ساتھ اس کا ایک شیطان لگا رہتا ہے۔ پوری حدیث یوں ہے:

مَا مِنْ أَحَدٍ اِلَّا وَلَهُ شَيْطَانٌ. (مسلم)

ہر شخص کے ساتھ اس کا شیطان ہوتا ہے۔

اب ذرا اس غرض وغایت کی بات ہو جائے جس کی وجہ سے روحوں یا جنوں کو بلایا جاتا ہے۔ کیا ان سے غیب کی باتیں معلوم کرنی ہوتی ہیں؟ حالانکہ اسلامی عقیدہ کے مطابق غیب کی باتیں اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں جانتا۔ اللہ فرماتا ہے:

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ط (النمل:۶۵)

کہو کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی مخلوق ہے وہ غیب کے بارے میں نہیں جانتی سوائے اللہ کے۔

وہ جن جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ تھے انہوں نے سلیمان علیہ السلام کی وفات پر یہی کہا تھا کہ اگر انہیں غیب کا علم ہوتا تو وہ کبھی اس عذاب میں مبتلا نہ ہوتے۔ اگر غیب کی باتیں بتانے کا یہ عمل ''کہانت'' ہی کی کوئی شکل ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کاہنوں پر لعنت فرمائی ہے اور کہانت کو خارج از اسلام قرار دیا ہے۔ (۵)

ان کی غیب کی بتائی ہوئی باتیں کبھی کبھی سچ بھی ہو جاتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ لوگ بُرے جنوں کو اپنا عامل بنائے ہوئے ہوتے ہیں اور ان عاملوں سے وہ باتیں معلوم کر لیتے ہیں، جنہیں وہ نہیں جانتے۔ غیب کی یہ باتیں چاہے ننانوے دفعہ جھوٹ ثابت ہوں تو کوئی بات نہیں لیکن اگر ایک دفعہ بھی سچ نکل جائے تو ہوا کی مانند چاروں سمت پھیل جاتی ہے اور لوگ اس پر یقین کر لیتے ہیں۔

جہاں تک علاج معالجے کی خاطر روحوں کو بلانے کا عمل ہے تو یہ سنت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل خلاف ہے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے علاج کے طور پر صرف ان طریقوں کو اپنایا ہے جو اس زمانے میں علاج کے مروجہ طریقے تھے مثلاً پچھنے لگوانا، یا آگ سے داغنا یا شہد

کے ذریعہ علاج کرنا وغیرہ وغیرہ۔ جب کوئی صحابی بیمار ہوتے تو علاج کے لئے حکیم کو بلایا جاتا تھا، روحوں کو نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے علاج کے لئے گنڈوں، تعویذوں اوران جیسے دوسرے وسائل پر لعنت فرمائی ہے۔ بلکہ یہاں تک کہا ہے:

مَنْ عَلَّقَ تَمِیْمَۃً فَقَدْ اَشْرَكَ (٦)

جس نے تعویذ لٹکایا' اس نے شرک کیا۔

یہ حقیقت ہے کہ روحوں کو بلانے کا عمل محض عوام کو بہکانے اور انہیں راہِ راست سے دُور لے جانے کے لئے ہے یا کچھ مادی فائدوں کے لئے یہ کام کیا جاتا ہے۔ لیکن اس حقیقت کے ساتھ ایک لطیف پہلو یہ بھی ہے کہ وہ مغرب زدہ شخص جو صرف عقل اور محسوس کی جانے والی چیزوں پر ہی یقین رکھتا ہے، غیر محسوس اور غیر مرئی چیزوں کا انکار کرتا ہے وہ اس حقیقت کی کیا توجیہ پیش کرسکتا ہے۔ ذرا ہمیں بتایئے تو کہ وہ کون سی مخفی قوت ہے جو ڈبوں میں یا قلم میں حرکت پیدا کرتی ہے؟

کیا نبی ﷺ اللہ کی پہلی مخلوق تھے؟

سوال: کیا یہ صحیح ہے کہ نبی ﷺ اللہ تعالیٰ کی سب سے پہلی مخلوق ہیں؟ اور یہ کہ وہ نور سے پیدا کئے گئے ہیں؟ کتاب وسنّت کی روشنی میں تشفی بخش جواب دیں۔

جواب: علمائے حدیث کے مطابق وہ ساری احادیث جن میں اللہ تعالیٰ کی پہلی تخلیق کا تذکرہ ہے۔ ان میں ایک بھی ایسی نہیں ہے، جسے صحیح قرار دیا جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں آپس میں کافی تناقض پایا جاتا ہے۔ چنانچہ بعض حدیثوں میں یہ ہے کہ اللہ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا اور بعض میں ہے کہ اللہ نے سب سے پہلے عقل کو پیدا کیا۔ عوام میں یہ مشہور ہے کہ اللہ نے اپنے نور سے ایک حصہ لیا اور اسے حکم دیا کہ محمد ﷺ ہو جا۔ اور اس طرح حضور ﷺ اللہ کی اوّلین مخلوق ہیں۔ یہ دعویٰ نہ روایت کے اعتبار سے درست ہے اور نہ درایت کے اعتبار سے۔ نہ عقل ہی اسے تسلیم کرتی ہے اور نہ اس بات میں کوئی دینی فائدہ ہی مضمر ہے۔ حضور ﷺ کا اوّلین مخلوق ہونا کسی صحیح روایت سے

ثابت نہیں ہے اور اگر ثابت ہو بھی جائے تو حضور ﷺ کے افضل البشر والخلائق ہونے میں اس سے کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جس حقیقی وصف کے ذریعے آپ ﷺ کو افضل البشر قرار دیا ہے وہ یہ ہے:

اِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ○ (القلم:۷)

اور بیشک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۔

جو بات تواتر کے ساتھ ثابت ہے، وہ یہ کہ حضور ﷺ عبداللہ بن عبدالمطلب کے بیٹے ہیں۔ ان کی ماں آمنہ بنت وہب ہیں۔ ان دونوں کے رشتۂ ازدواج میں آنے کے بعد حضور ﷺ کی ولادت ہوئی اور اسی طرح ہوئی جس طرح تمام انسانوں کی ہوتی ہے۔ اسی طرح پلے بڑھے جس طرح دوسرے تمام بچے پلتے بڑھتے ہیں اور پروان چڑھتے ہیں۔ انہیں رسالت کی ذمہ داری اسی طرح سونپی گئی جس طرح تمام انبیاء و رسل کو سونپی گئی۔ حضور ﷺ کوئی نئے رسول نہیں تھے۔ حضور ﷺ نے بھی فطری انداز میں انسانوں جیسی زندگی گزاری اور جب ان کا وقت پورا ہو گیا تو انہیں بھی اسی طرح موت آئی جس طرح دوسرے تمام انسانوں کو آتی ہے۔ قرآن میں اللہ فرماتا ہے:

اِنَّكَ مَیِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّیِّتُوْنَ ○ (الزمر:۳۰)

تمہیں بھی مرنا ہے اور ان لوگوں کو بھی مرنا ہے۔

قرآن نے متعدد مقامات پر حضور ﷺ کے بشر ہونے کا اقرار کیا ہے۔ مثلاً:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یُوْحٰۤی اِلَیَّ (الکہف:۱۱۰)

اے نبی ﷺ کہو کہ میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا، میری طرف وحی کی جاتی ہے۔

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ○ (بنی اسرائیل:۹۳)

اے نبی ﷺ ان لوگوں سے کہو پاک ہے میرا پروردگار کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں۔

حضور ﷺ نے بھی اپنی اُمت کو اس بات کی تاکید کی کہ حضور ﷺ کی تقدیس و تعظیم میں وہ اتنا غلو نہ کریں جیسا کہ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ کے ساتھ کیا اور انہیں خدا بنا ڈالا۔

پس یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر حضور ﷺ بشر ہیں تو وہ نور سے نہیں پیدا ہوئے اور نہ سونے چاندی سے۔ بلکہ، اسی مادہ منویہ سے ان کی تخلیق ہوئی، جس سے تمام انسانوں کی ہوئی ہے۔ البتہ اپنی رسالت و نبوت اور فریضۂ ہدایت کے اعتبار سے وہ بے شبہ اللہ کے نور ہیں۔ نور کی طرف ہدایت دینے والے ہیں۔ گمراہیوں اور راہ سے بھٹکے ہوئے لوگوں کے لئے ان کی ذات روشنی اور مشعلِ راہ ہے۔ اسی لئے اللہ نے فرمایا:

قَدْ جَآءَكُم مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ (المائدہ:۱۵)

تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آگئی ہے اور ایک واضح کتاب۔

حضور ﷺ کی بعثت سے قبل اسلام کا وجود

سوال: کیا حضور ﷺ کی بعثت سے قبل بھی اسلام موجود تھا؟ جس قرآنی آیت میں ابراہیم علیہ السلام کے مسلم ہونے کی خبر دی گئی ہے، اس میں اسلام سے مراد کیا یہی دینِ اسلام ہے، جسے حضور ﷺ لے کر آئے تھے؟

جواب: اسلام کا مفہوم ہے اپنی ذات اور اپنے دل کو اللہ کے آگے جھکانا اور اس کا مکمل مطیع و فرماں بردار ہونا۔ یعنی اللہ کی توحید کا اقرار کرنا، اس کی عبادت کرنا اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا اور یہ وہ طریقۂ زندگی ہے، جسے لے کر تمام انبیاء و رُسل آئے۔ تمام نبیوں اور رسولوں نے اسی طریقۂ زندگی کی طرف لوگوں کو دعوت دی۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تمام انبیاء و رُسل کا مذہب دینِ اسلام ہی تھا۔ کیوں کہ حقیقتاً جو دین اللہ کے نزدیک ازل سے محبوب ہے اور مطلوب ہے وہ دینِ اسلام ہی ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ قف (آل عمران:۱۹)

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔

دوسری آیت میں ہے:

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ (آل عمران:۸۵)

اسلام کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء ورُسل نے اسی دینِ اسلام کی طرف دعوت دی، نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو مخاطب کیا اور فرمایا:

وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ○ (یونس:۷۲)

اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں خود مسلم بن کر رہوں۔

ابراہیم علیہ السلام نے بھی یہی فرمایا:

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ (البقرہ:۱۳۱)

اس کا یہ حال تھا کہ جب اس کے رب نے کہا مسلم ہو جا' تو اس نے فوراً کہا میں مالکِ کائنات کا مسلم ہو گیا۔

سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا بلقیس کے پاس بھی اسی اسلام کا پیغام بھیجا تھا:

اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ○ (النمل:۳۱)

میرے مقابلے میں سرکشی نہ کرو اور مسلم ہو کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی دینِ اسلام کی دعوت دی۔ اسی طریقۂ زندگی کی طرف لوگوں کو بلایا۔ یہ الگ بات ہے کہ خاتم الانبیاء ہونے کی حیثیت سے ان کا لایا ہوا دین ایک مکمل دین ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نیا دین لے کر نہیں آئے تھے۔ انہوں نے بھی اسی دین کی دعوت دی، جس کی دعوت تمام انبیاء ورُسل نے دی تھی۔ البتہ خاتم الانبیاء ہونے کی حیثیت سے ان کے فرائض میں یہ بھی شامل تھا کہ پچھلی شریعتوں میں جو بھی کمی رہ گئی تھی، اسے دور کر کے دین کو مکمل کر دیں۔ لوگوں نے جو تحریفات کر دی تھیں ان کی تصحیح

کریں اور ایک مخصوص انسانی طبقے کے بجائے تمام عالم کو اس دین کی دعوت دیں۔ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ پچھلی شریعتوں اور شریعتِ محمدیہ کے مابین بعض فروعی مسائل میں واضح فرق ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پچھلی شریعتیں اپنے وقت اور حالات وضروریات کے مطابق تھیں جب کہ شریعتِ محمدیہ رہتی دنیا تک کے حالات وضروریات کے عین مطابق ہے۔

نئے گھر میں رہائش سے قبل قربانی

سوال: بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ نئے گھر میں رہائش کے موقعے پر ایک قربانی کرنی چاہیے ورنہ جنّ اس گھر پر قابض ہو جاتے ہیں اور گھر والوں کو تنگ کرتے ہیں۔ کیا یہ عقیدہ صحیح ہے؟

جواب: درحقیقت جنّوں کے بارے میں لوگوں کا عقیدہ اِفراط وتفریط کا شکار ہے کچھ لوگ ہیں جو جنّوں کے سرے سے قائل ہی نہیں ہیں۔ وہ صرف ان ہی چیزوں پر یقین کرتے ہیں جسے وہ دیکھ سکیں یا محسوس کر سکیں۔ ان کے بالمقابل کچھ ایسے لوگ ہیں جو جنّوں کے وجود کو ثابت کرنے میں غلو کر جاتے ہیں۔ ایسے لوگ ہر چھوٹے بڑے معاملے میں جنّوں کے تداخُل کے قائل ہیں۔ ان کے ذہنوں پر جنّ اس طرح سوار ہو گیا ہے کہ ہر حادثے میں انہیں جنّ کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ گویا جنّوں کی ساری دنیا پر حکمرانی ہو گئی ہو۔ دونوں عقیدے غلو کا شکار اور اسلام کے مخالف ہیں۔ جنّوں کے معاملے میں اسلام کا عقیدہ اِفراط وتفریط سے پاک ہے۔ اسلام نے جنّوں کے وجود کا انکار نہیں' بلکہ اقرار کیا ہے۔ جنّوں کی اپنی ایک الگ دنیا آباد ہے۔ قرآن واحادیث میں متعدّد مقامات پر جنّوں کا تذکرہ موجود ہے۔ وہ لوگ جو روحوں کو بلانے کا عمل کرتے ہیں' وہ بھی دراصل جنّوں کو بلاتے ہیں۔ جنّوں کے اقرار کے ساتھ ساتھ اسلام کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ جن اس حد تک بااختیار اور بااثر نہیں ہیں کہ تمام کائنات پر حکمرانی کریں۔ جہاں چاہیں اپنی مرضی سے کام کریں۔ وہ بھی اللہ کی مخلوق ہیں اور اللہ کی منشا اور تصرّف کے ماتحت ہیں۔ خدا کی

مرضی کے بغیر وہ ایک ادنیٰ سی جنبش پر بھی قادر نہیں ہیں۔

رہا لوگوں کا یہ عقیدہ کہ نئے گھر کو بسانے سے قبل اگر قربانی نہ کی جائے تو جن اس گھر پر قابض ہو جاتے ہیں اور گھر والوں کو تنگ کرتے ہیں تو یہ ایسا عقیدہ ہے جو نہ قرآن سے ثابت ہے اور نہ احادیث سے۔ یہ تو غیب کی بات ہے۔ عقیدے اور غیب کی بات جب تک قرآن سے ثابت نہ ہو، ہرگز قابلِ قبول نہیں۔ لہٰذا نئے گھر میں رہائش کے وقت قربانی کرنے والی بات بالکل بے بنیاد اور لغو ہے۔

گنڈوں اور تعویذوں سے علاج

سوال: میں ستائیس سال کا صحت مند نوجوان ہوں۔ ابھی میں نے پچھلے ہی سال شادی کی ہے۔ شادی کے بعد ہم دونوں میاں بیوی ایک سال تک بڑے خوش اور مطمئن رہے لیکن اچانک چھ دنوں سے میری بیوی کو ایک بیماری لاحق ہو گئی ہے۔ اس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا ہے۔ پہلے وہ پرسکون اور خوش رہتی تھی۔ لیکن اب وہ سارے گھر کو سر پر اٹھائے رکھتی ہے۔ گھر والوں نے کسی مولانا کے پاس لے جانے کا مشورہ دیا۔ مجبور ہو کر میں اسے ایک مولانا کے پاس لے گیا۔ انہوں نے دیکھنے کے بعد فرمایا کہ اس کے سر پر جن سوار ہے۔ اس پر پندرہ دنوں تک قرآن پڑھنے اور جھاڑ پھونک کا عمل کرنا پڑے گا۔ یہ عمل پندرہ دنوں تک چلتا رہا لیکن بے سود۔ مولانا نے اس مدت میں ایک تعویذ بھی اس کے گلے میں لٹکایا لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ سوال یہ ہے کہ اس قسم کے عمل کی کوئی شرعی حیثیت ہے یا محض دھوکا دینے کا ایک ذریعہ ہے؟

جواب: متعدد صحیح احادیث میں نبی ﷺ نے ہم مسلمانوں کو جھاڑ پھونک اور گنڈے تعویذ سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں لوگ اپنے بچوں کو تعویذ گنڈے باندھتے تھے جس کا مقصد نظرِ بد یا جنوں سے محفوظ رکھنا ہوتا تھا۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ الرُّقٰى وَالتَّمَائِمَ وَالتِّوَلَةَ شِرْكَةٌ۔ (۷)

بے شک جھاڑ پھونک، تعویذ اور جادو شرک ہے۔

جھاڑ پھونک یہ ہے کہ کوئی شخص کچھ مہمل اور بے معنیٰ الفاظ پڑھ کر مریض پر پھونکتا ہے۔ علماءِ کرام نے جھاڑ پھونک کو تین شرطوں کے ساتھ جائز قرار دیا ہے:

۱- پہلی شرط یہ ہے کہ اللہ کا نام یا اللہ کا کلام پڑھ کر پھونکا جائے۔

۲- دوسری شرط یہ ہے کہ پڑھی جانے والی چیز عربی زبان میں ہو اور کوئی مہمل بات نہ ہو۔

۳- تیسری شرط یہ ہے کہ پڑھتے اور پھونکتے وقت یہ پختہ عقیدہ ہونا چاہئے کہ سب کچھ اللہ کی مرضی پر منحصر ہے۔ وہی ہوگا جو اللہ نے تقدیر میں لکھ دیا ہے۔ جھاڑ پھونک بذاتِ خود افادیت کی حامل نہیں ہے۔

چنانچہ نبی ﷺ سے بھی یہ عمل منقول ہے۔ انہوں نے جو پڑھ کر پھونکا' اس کے الفاظ یہ تھے:

اَللّٰھُمَّ رَبَّ النَّاسِ اَذْھِبِ الْبَاْسَ اِشْفِ وَاَنْتَ الشَّافِیْ لَا شِفَآءَ اِلَّا شِفَاءُكَ شِفَاءً لَّا یُغَادِرُ سُقْمًا۔ (۸)

اے لوگوں کے رب! تو بلا ٹال دے۔ تو شفا عطا فرما۔ بے شک تو ہی شفا دینے والا ہے۔ تیری شفاء کے علاوہ کوئی شفاء نہیں ہے۔ ایسی شفاء جو کسی بیماری کا نام ونشان نہ چھوڑے۔

تعویذ یہ ہے کہ کچھ لکھ کر یا بغیر لکھے ہاتھوں یا جسم کے کسی حصے پر باندھ دیا جاتا ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ یہ تعویذ شفا کا موجب ہوگا۔ اسلام نے تعویذ کی جتنی قسمیں ہیں سب سے منع کیا ہے۔ روایت ہے کہ حضور ﷺ کے پاس دس افراد بیعت کے لئے آئے۔ آپ ﷺ نے نو سے بیعت کی۔ ایک سے اِعراض کیا۔ کسی نے وجہ پوچھی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس نے تعویذ باندھ رکھا ہے۔ اس شخص نے فوراً تعویذ توڑ کر پھینک دیا، آپ ﷺ نے بیعت فرمائی اور کہا:

مَنْ عَلَّقَ تَمِيْمَةً فَقَدْ اَشْرَكَ۔ (۹)

جس نے تعویذ باندھا' اس نے شرک کیا۔

اسی لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلفِ صالحین نے سختی کے ساتھ اس عمل سے منع کیا ہے۔ سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ جس نے کسی کے گلے سے تعویذ کاٹ پھینکا' اسے غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب ملے گا۔

ابراہیم نخعی، جو کہ ایک بزرگ تابعی تھے' فرماتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم ہر طرح کے تعویذ سے نفرت کرتے تھے، خواہ اس میں قرآن کی آیتیں لکھی ہوں یا کچھ اور۔

جمہور علماءِ کرام کا قول یہی ہے کہ ہر طرح کا تعویذ حرام ہے۔ میرے نزدیک بھی یہی قول راجح ہے۔ درج ذیل اسباب کی بنا پر:

۱- جن احادیث میں تعویذ کی حُرمت کا ذکر آیا ہے ان میں عموم ہے۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عام تعویذوں کے بارے میں حرمت کا ذکر کیا ہے۔ چاہے اس میں قرآن کی آیتیں لکھی ہوئی ہوں یا کچھ اور۔

۲- اگر قرآن کی آیت پر مشتمل تعویذ کو جائز قرار دیا جائے تو اس سے مستقبل میں ان تعویذوں کا دروازہ کھل جائے گا جن میں قرآن کی آیتیں نہیں ہوں گی۔

۳- اس طرح قرآن کی بے حُرمتی کا امکان ہے اس لئے کہ تعویذ پہن کر انسان رفعِ حاجت کے لئے گندی جگہوں پر جا سکتا ہے۔ یا کبھی وہ خود حالت جنابت میں ہو سکتا ہے یا پہننے والی عورت حالت حیض میں ہو سکتی ہے۔

اسلام کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ مرض کے وقت انسان جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں کا سہارا لے۔ بلکہ اسلام نے ہمیں اس بات کی تعلیم دی ہے کہ ایسے موقعوں پر ہمیں ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہئے یا ان طریقوں سے علاج کرنا چاہئے جو معروف ہیں۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مرض کی حالت میں انہیں طریقوں سے علاج کیا، جو اس زمانے میں مروّج تھے یا پھر حکیموں کی طرف رجوع کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

تَدَاوَوْا عِبَادَ اللّٰهِ فَإِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى لَمْ يَضَعْ دَآءً إِلَّا وَضَعَ لَهُ دَوَاءً. (۱۰)
اللہ کے بندو! دواؤں سے علاج کرو۔ کیونکہ اللہ نے ہر مرض کے لئے ایک دوا بنائی ہے۔

آپ نے اپنی بیوی کی جو حالت بتائی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں کوئی نفسیاتی مرض لاحق ہے۔ آپ کو چاہئے کہ آپ کسی نفسیاتی امراض کے ماہر ڈاکٹر کی طرف رجوع کریں۔

حضرت خضر علیہ السلام

سوال: خضر علیہ السلام کون تھے؟ کیا وہ نبی تھے یا ولی؟ کیا وہ آج تک زندہ ہیں جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں اور یہ کہ بعض اللہ کے بندوں نے ان سے ملاقات کی ہے۔ اگر وہ زندہ ہیں تو کہاں رہتے ہیں؟ لوگوں کے پاس کیوں نہیں آتے اور انہیں اس جہالت کے دور میں تعلیم کیوں نہیں دیتے؟

جواب: خضر علیہ السلام اللہ کے نیک بندے تھے۔ سورہ کہف میں ان کے اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان ملاقات کا قصہ تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ وعدہ کے مطابق موسیٰ علیہ السلام کی خضر سے ملاقات ہوئی۔ موسیٰ علیہ السلام ان کے ساتھ ہو لئے، اس شرط کے ساتھ کہ ان سے کچھ نہیں پوچھیں گے۔ خضر علیہ السلام نے راستے میں ایک کشتی میں سوراخ کر ڈالا، ایک بچے کو قتل کر دیا اور کچھ یتیم بچوں کے گھر میں دیوار کی مرمت کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام حیرانی کے عالم میں وعدے کے برخلاف سوال کرتے گئے۔ خضر علیہ السلام نے اپنے ان افعال کا سبب بتایا۔ پھر فرمایا کہ:

وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ اَمْرِىْ ط (الکھف:۸۲)
یہ سب کچھ میں نے اپنی منشا سے نہیں کیا (بلکہ اللہ کی مرضی سے کیا ہے)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ خضر عمرِ جاودانی لے کر آئے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے آج تک وہ زندہ ہیں اور تا قیامت زندہ رہیں

گے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب من گھڑت باتیں ہیں۔ قرآن وحدیث میں کوئی ایسی دلیل نہیں ہے، جوان کے زندہ جاوید ہونے کے لئے بطورِ مثال پیش کی جاسکے۔ بلکہ اس کے برعکس قرآن وسنّت اور علماءِ اُمت کے مطابق وہ بھی تمام انسانوں کی طرح فنا کا شکار ہو چکے ہیں۔

علامہ ابن القیمؒ کہتے ہیں کہ خضر علیہ السلام اور ان کی زندگی سے متعلق جتنی بھی احادیث موجود ہیں وہ سب گھڑی ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر خضر علیہ السلام کا حضور ﷺ سے ملاقات کرنا یا الیاس علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کا ہر سال ملاقات کرنا یا خضر علیہ السلام کا جبرائیل علیہ السلام اور میکائیل علیہ السلام سے عرفہ میں ملاقات کرنا۔ یہ سب باتیں گھڑی ہوئی حدیثیں ہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے خضر علیہ السلام کے بارے میں سوال کیا گیا کہ کیا وہ زندہ ہیں؟ جواب دیا کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ جبکہ خود حضور ﷺ نے اس بات کی پیشین گوئی کی تھی کہ آج روئے زمین پر جو شخص زندہ ہے سو سال کے بعد وہ زندہ نہیں ہوگا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ خضر علیہ السلام زندہ بچ رہے ہوں۔

علمائے کرام نے خضر علیہ السلام کی موت کو ثابت کرنے کے لئے قرآن کی یہ آیت پیش کی ہے:

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ اَفَائِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ۝

(الانبیاء:۳۴)

اور اے نبی ﷺ ہمیشگی تو ہم نے تم سے پہلے بھی کسی انسان کے لئے نہیں رکھی ہے، اگر تم مر گئے، تو کیا یہ لوگ جیتے رہیں گے؟

قرآن خود ہی گواہی دے رہا ہے کہ کسی بشر کو عمرِ جاودانی نہیں عطا کی گئی ہے۔

اگر عقلی اعتبار سے بھی غور کیا جائے تو آخر خضر علیہ السلام کے زندۂ جاوید ہونے اور پہاڑوں اور غاروں میں بسیرا کرنے میں کسی کا کیا فائدہ یا بھلا ہوسکتا ہے۔ فائدہ تو جب تھا کہ وہ لوگوں کے ساتھ زندگی گزارتے اور انہیں اچھی اچھی باتیں بتاتے۔ حقیقت یہ

ہے کہ یہ سب فضول اور بے بنیاد حکایات ہیں۔

رہا یہ سوال کہ کیا وہ نبی تھے یا ولی؟ تو اس سلسلے میں علماء کا اختلاف ہے۔ میری نظر میں راجح قول یہ ہے کہ وہ نبی تھے۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کر کے انہوں نے یہ کہا تھا:

وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ۔

میں نے یہ سب اپنی منشا سے نہیں کیا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ان پر اللہ کی وحی نازل ہوتی تھی جو انہیں اللہ کی مرضی بتاتی تھی اور اللہ کی وحی انبیاء و رسل پر ہی نازل ہوتی ہے۔ اس لئے غالب گمان یہی ہے کہ وہ اللہ کے نبی تھے۔

شیطانی وسوسہ

سوال: ایک عرصہ سے میرے دل میں ایک شیطانی وسوسہ بیٹھ گیا ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف پر شک ہونے لگا ہے۔ میں بار بار اپنے دل سے پوچھتا ہوں۔ ایسا کیوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کو انتہائی امیر اور کچھ لوگوں کو انتہائی غریب بنایا ہے۔ اگر سب برابر ہوتے تو کیا اچھا نہ ہوتا؟ اس شیطانی وسوسے کی وجہ سے میری نمازیں چھوٹ گئی ہیں۔ ان وسوسوں سے نجات پانے میں ہماری رہنمائی فرمایئے۔

جواب: ہر مومن کے ساتھ ایسا لمحہ آتا ہے، جب شیطان اسے بہکاتا اور ورغلاتا ہے۔ اسے وسوسوں میں مبتلا کر دیتا ہے اور جن کا ایمان پختہ ہوتا ہے وہ جلد ہی ان وساوس سے نجات حاصل کر لیتے ہیں۔ آپ نے جن وسوسوں کا تذکرہ کیا ہے وہ دراصل دو بڑی غلط فہمیوں پر مبنی ہیں:

۱۔ پہلی غلطی یہ ہے کہ آپ نے دُنیوی مال و دولت ہی کو سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ آپ کا عقیدہ ہے کہ مال و دولت ہی سب سے بڑی نعمت ہے۔ آپ کو جاننا چاہئے کہ انسان کی زندگی میں مال و دولت ہی سب کچھ نہیں ہے۔ کتنے پیسے والے ایسے ہیں جنہیں مختلف بیماریوں نے گھیر رکھا ہے، اپنے پیسوں سے وہ صحت نہیں خرید سکتے۔ مال و دولت کے

انبار کے باوجود ذہانت کی نعمت سے محروم ہوتے ہیں یا اولاد جیسی نعمت کے لئے ترستے رہتے ہیں۔ اولاد ہوتی بھی ہے تو ناکارہ نکل جاتی ہے۔ کتنے ایسے ہیں جو غریبوں کی طرح پیٹ بھر کر کھانا چاہتے ہیں لیکن وہ اپنے پیسوں سے بھوک نہیں خرید سکتے۔ بھوک ہے تو موٹاپے کے خوف سے پیٹ بھر کر نہیں کھا سکتے۔ مان لیجئے وہ پیٹ بھر کر کھا سکتے ہیں لیکن کتنا کھائیں گے؟ کیا اپنے پیٹ میں زمین وآسمان کو سمولیں گے؟ کیا اپنی دولت کو قبر میں ساتھ لے کر جائیں گے؟ اس پر مستزاد یہ کہ جس کے پاس جتنی دولت ہوگی اتنا ہی قیامت کے دن اس کا حساب کتاب بھی ہوگا۔ حدیث شریف میں ہے کہ قیامت کے دن بندہ اس وقت تک اپنی جگہ سے نہیں ٹل سکے گا جب تک کہ اس سے چار چیزیں نہ پوچھ لی جائیں۔ ان میں سے ایک سوال یہ ہوگا کہ جو دولت تمہیں عطا کی گئی تھی وہ کیسے کمائی اور کہاں خرچ کی۔

معلوم ہوا کہ مال ودولت ہی سب کچھ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بھی دنیا میں ہزارہا نعمتیں ایسی ہیں جو اس سے قیمتی ہیں۔ اب آپ ذرا خود غور کیجئے کہ جو قوتِ بینائی آپ کو عطا کی گئی ہے کیا لاکھ دو لاکھ کے عوض آپ اسے فروخت کر سکتے ہیں؟ یہ جو قوتِ سماعت آپ کو ملی ہے اسے سونے چاندی کے بدلے آپ فروخت کر سکتے ہیں؟ غرض کہ ہاتھ، کان، ناک، پاؤں اور دوسرے سارے اعضاء اللہ کی وہ نعمتیں ہیں، جن کا بدل سونا چاندی نہیں ہو سکتے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے:

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۝ (ابراہیم:)

اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے۔

ہر چیز کو مادیت کی نظر سے دیکھنا انسان کی بہت بڑی غلطی ہے۔

۲- دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ آپ نے یہ سمجھ لیا کہ اللہ کے عدل وانصاف کا تقاضا یہ تھا کہ سارے انسان مال ودولت میں برابر ہوتے۔

بخدا برابری میں کوئی حکمت نہیں ہے۔ حکمت تو اس میں پوشیدہ ہے کہ سب برابر نہ

ہوں تا کہ انسانوں کی آزمائش ہو سکے اور معلوم ہو سکے کہ کون شکر گزار ہے اور کون ناشکرا۔ کون مصیبت کی گھڑی میں صبر کرتا ہے اور کون صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے۔

اللہ نے جو یہ زمین وآسمان پیدا کیے۔ ہماری تخلیق کی تو کیا یہ سب کچھ یونہی بلا مقصد کیا؟ کیا ہمیں صرف اس لئے بنایا ہے کہ ہم سب کھائیں پئیں اور مر جائیں؟ اگر سب کو برابر پیدا کرنا ہوتا تو اللہ تعالیٰ یہ بھی کر سکتا تھا کہ انسان کو بغیر پیٹ کے پیدا کرتا۔ نہ ہمیں لباس کی ضرورت ہوتی نہ سر چھپانے کے لئے گھر کی۔ پھر تو امیر وغریب کا کوئی جھگڑا ہی نہ ہوتا۔ لیکن نہیں۔ حکمت ومصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کے ساتھ انسانی ضروریات بھی پیدا کی جائیں۔ آزمائش کی خاطر انسانوں میں فرق بھی رکھا جائے۔ اگر کوئی احسان وبھلائی کرنے والا ہے تو کوئی ایسا بھی ہو جس کے ساتھ وہ بھلائی کرے۔ اگر کوئی صبر کرنے والا ہے تو کوئی ایسا بھی ہو جسے دیکھ کر وہ صبر کرے۔ اگر سب برابر ہوتے تو اس زندگی میں کوئی مزہ نہ ہوتا۔ کوئی بھاگ دوڑ اور گہما گہمی نہ ہوتی۔ ساری رونقِ حیات مفقود رہتی۔ دن اور روشنی کی اہمیت ومنفعت کا احساس ہمیں اسی لئے تو ہے کہ ان کے ساتھ رات اور تاریکی بھی پیدا کی گئی ہے۔ اگر تاریکی نہ ہوتی تو روشنی کا ہمیں کیا احساس ہوتا؟

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ہم انسان خدا کی حکمت کا تعیّن کیسے کر سکتے ہیں؟ ایک بیمار شخص رات بھر درد سے تڑپتا ہے اور چاہتا ہے کہ درد بھری رات منٹوں میں ختم ہو جائے، دوسری طرف شب زفاف کی رنگینیوں میں مگن شادی شدہ جوڑا یہ تمنا کرتا ہے کہ یہ رات کبھی ختم نہ ہو۔ اب آپ بتائیں کہ خدا کس کس کی سنے؟ کس عمل میں حکمت پوشیدہ ہے؟ حق تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو ایک نظام کے تحت پیدا کیا ہے۔ اس کی حکمت وہی بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔

یہاں پر ایک قصے کا بیان قرینِ سیاق معلوم ہوتا ہے۔

ایک باغ میں باپ بیٹے محوِ گفتگو تھے۔ بیٹے نے باپ سے کہا کہ ہمیں تو اس میں اللہ کی کوئی حکمت نظر نہیں آتی کہ کھجور ایسے ننھے پھل کو ایک بڑے مضبوط درخت میں پیدا کیا اور تربوز ایسے بھاری بھرکم پھل کو کمزور سی بیلوں میں جنم دیا کہ یہ بیلیں زمین سے اوپر نہیں جاسکتیں۔ باپ نے کہا کہ اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی' لیکن ہم انسان نہیں سمجھ سکتے۔ تھوڑی دیر کے بعد دونوں سو گئے۔ اسی دوران ایک کھجور ٹوٹ کر بیٹے کے سر پر آ گری۔ بیٹے کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے بتایا کہ کھجور کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ باپ نے کہا کہ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس بڑے درخت میں تربوز نہیں پھلتا ورنہ آج تم آخری سانس لے رہے ہوتے۔ اگرچہ یہ ایک قصہ ہے۔ لیکن سوچنے والوں کے لئے اس میں سامان عبرت ہے۔ مومن بندے کو چاہئے کہ وہ کسی شئے میں بھی خدا کی مصلحت کو سمجھے یا نہ سمجھے' ہر حال میں اسے وہی کہنا چاہئے جو فرشتوں نے کہا تھا:

سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝

(البقرہ:۳۲)

کیا ہی عظمت والا ہے تو ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا تو نے ہم کو دیدیا ہے۔

یا پھر وہ کہنا چاہئے جو قرآن میں درج ہے:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ (آل عمران:۱۹۱)

پروردگار یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے۔ تیری عظمت کے خلاف ہے کہ تو عبث کا کام کرے۔ پس اے رب ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔

آپ کو چاہئے کہ جو شیطانی وسوسہ آپ کے ذہن میں آیا ہے اسے فوراً جھٹک دیں۔ خدا سے توبہ کیجئے اپنے ایمان کا اعادہ کیجئے۔ نمازیں پڑھنی شروع کر دیجئے اور جب کوئی شک ذہن میں آئے' فوراً اہلِ علم کی طرف رجوع کیجئے۔

ایک گمراہ کن وصیّت

سوال: میرے ہاتھوں میں ایک پمفلٹ ہے۔ اس کی عبارتیں پڑھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ آپ مجھے بتائیں کہ کیا یہ باتیں صحیح ہیں یا گھڑی ہوئی ہیں۔ اس پمفلٹ میں الشیخ احمد جو حرم نبی کی کنجیوں کے محافظ ہیں ان کی وصیّت درج ہے۔ اس وصیّت میں تمام مشرق و مغرب کے مسلمانوں کے لئے متعدّد پند و نصائح ہیں اور آخر میں یہ درج ہے کہ بمبئی میں فلاں شخص نے اس وصیّت کو شائع کرا کر لوگوں میں مفت تقسیم کرایا تو اللہ نے اسے پچیس ہزار روپے بخشے۔ ایک دوسرے شخص نے اسے مفت تقسیم کرایا تو اسے چھ ہزار روپیوں کا فائدہ ہوا۔ ایک شخص نے اسے جھٹلایا تو اسی دن اپنے بیٹے سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ آخر میں یہ لکھا ہے کہ جس شخص نے اس پمفلٹ کو پڑھا اور اسے شائع کرا کر لوگوں میں تقسیم نہیں کرایا تو وہ بڑی بڑی مصیبتوں میں گرفتار ہو جائے گا۔ آپ کی اس وصیّت کے بارے میں کیا رائے ہے؟

جواب: اس وصیّت کے بارے میں متعدّد افراد نے بار بار سوال کیا ہے، یہ کوئی نئی شعبدہ بازی نہیں ہے۔ بلکہ سالوں قبل بھی میں نے اسی قسم کی وصیّت پڑھی تھی اور اس میں بھی یہ وصیّت اسی الشیخ احمد محافظ حرم نبوی کی طرف منسوب تھی۔ میں نے مدینہ منورہ جا کر متعدّد لوگوں سے الشیخ احمد کے بارے میں دریافت کیا، کون تھے یا کہاں رہتے تھے؟ لیکن کسی کو بھی ان شیخ کی خبر نہیں ہے۔ کوئی بھی اس نام کے شیخ کو نہیں جانتا۔ حیرت کی بات ہے کہ مدینے میں تو اس شیخ سے کوئی واقف نہیں لیکن اس سے منسوب وصیّتیں ان علاقوں سے نشر ہو رہی ہیں جہاں بدعتیں یا گمراہیاں عام ہیں، یعنی ہندوستان۔ اس وصیّت کو پڑھ کر کوئی بھی صاحبِ نظر سمجھ سکتا ہے کہ یہ من گھڑت ہے۔ مثال کے طور پر اس میں پیشین گوئی ہے کہ قیامت بہت قریب ہے۔ یہ تو کوئی نئی بات نہیں ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ پہلے ہی ہمیں اس سے متنبہ کر چکا ہے:

لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا ۝ (الاحزاب: ۶۳)

شاید کہ وہ (قیامت کی گھڑی) قریب ہی آ گئی ہو۔

حضور ﷺ بھی فرما چکے ہیں کہ:

بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ۔ (بخاری ومسلم بہ روایت انس رضی اللہ عنہ)

(اپنی شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کو یکجا کر کے آپ ﷺ نے فرمایا) میں اور قیامت ان دونوں انگلیوں کی طرح قریب قریب بھیجے گئے ہیں۔

ان صراحتوں کے بعد اس کی چنداں ضرورت نہیں تھی کہ اللہ کسی شیخ کو خواب میں حضور ﷺ کی زیارت کرائے اور ان کی زبانی لوگوں کو یاددہانی کرائے۔ یاددہانی کے لئے اب کوئی رسول اور نبی نہیں آئے گا۔ اب صرف قرآن اور سنّت ہی قیامت تک کے لئے ہدایت کا سرچشمہ ہیں۔

اللہ فرماتا ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (المائدہ:۳)

آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے۔

ان تصریحات کے بعد اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اب بھی تذکیر کے لئے کسی شیخ کی وصیّت ضروری ہے تو اس نے دینِ اسلام کو سمجھا ہی نہیں۔

اس وصیّت میں لوگوں کو دھمکی دی گئی ہے کہ اگر انہوں نے اسے شائع کرا کر لوگوں میں تقسیم نہیں کرایا تو وہ مصیبتوں میں گرفتار ہو جائیں گے۔ حالانکہ قرآن اور حدیث کے بارے میں بھی کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ پڑھنے کے بعد شائع کرا کر لوگوں میں مفت تقسیم نہ کرنے والا مصیبتوں میں گرفتار ہو جائے گا۔ تو کیا نعوذُ باللہ اس وصیّت کی اہمیت قرآن و حدیث سے بھی بڑھ کر ہے؟

پمفلٹ میں اس بات کا دعویٰ کہ تقسیم کرانے والوں کو روپے پیسوں کا فائدہ پہنچا دراصل کم فہم مسلمانوں کو صراطِ مستقیم سے دور لے جانے کا آسان نسخہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے

رزق حاصل کرنے کے جو طریقے مقرر کیے ہیں انہیں طریقوں سے ساری دنیا رزق کماتی ہے۔ خود حضور ﷺ نے بھی رزق کمانے کے لئے انہیں طریقوں کو اختیار کیا۔ ان طریقوں سے ہٹ کر جس طریقے کی دعوت اس پمفلٹ میں دی گئی ہے، ظاہر ہے وہ لوگوں کو اپاہج بنانے والا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

(۱) زادُ المعاد، ابنِ قیم، ج ۳ ص ۳۵-۳۶

(۲) مسلم شریف کی روایت ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں۔

(۳) مسلم شریف کی روایت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا راوی ہیں۔

(۴) سورۃ الجن کی آیت نمبر ۱۴ کا مفہوم ہے۔

(۵) مسندِ احمد اور حاکم کی روایت ہے۔

(۶) ایک حدیث کا مفہوم ہے جسے احمد نے اپنی مسند میں درج کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

(۷) امام احمد، ابوداؤد اور حاکم نے روایت کی ہے۔

(۸) مسندِ احمد اور بخاری شریف کی روایت ہے۔

(۹) مسندِ احمد اور حاکم کی روایت ہے۔

(۱۰) مسندِ احمد، ترمذی اور حاکم وغیرہ کی روایت ہے۔

☆☆☆☆☆

چوتھا باب

طہارت اور نماز

نماز نہ پڑھنے والے کا شرعی حکم

سوال: ایک شخص ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے، لیکن نہ وہ نماز پڑھتا ہے اور نہ روزے رکھتا ہے، کیا اسے مسلمان کہنا صحیح ہے؟ کیا مرنے کے بعد اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی؟

جواب: اس شخص کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے، جسے حکومت یا کسی کمپنی نے نوکری پر رکھا ہو، اسے اس کی نوکری کے صلے میں تنخواہ ملتی ہو، وہ حکومت کے سامنے اپنے فرائضِ منصبی کے بارے میں جوابدہ بھی ہو، لیکن وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی برتتا ہے۔ بھلا چنگا ہونے کے باوجود اپنی ڈیوٹی سے غائب رہتا ہے؟ کسی کمپنی کے سامنے اگر یہ مسئلہ پیش کیا جائے تو کچھ لوگ اس کی سزا یہ مقرر کریں گے کہ اسے نوکری سے فی الفور برخاست کر دیا جائے۔ جبکہ کچھ لوگ جرمانے وغیرہ کی سزا مقرر کریں گے اور وہ ایسی سزا مقرر کرنے میں حق بہ جانب ہوں گے۔

اسلام کا بھی نماز نہ پڑھنے والے کے ساتھ یہی موقف ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ چونکہ اللہ کی عبادت ہی مسلمانوں کا اوّلین فرض ہے اس لئے نماز ترک کرنے والا لازمی طور پر اسلام کے دائرے سے خارج قرار دیا جائے گا۔ بعض علماء کے نزدیک نماز ترک کرنے والا اگر نماز کی فرضیت سے منکر ہے اور فریضۂ نماز کی تضحیک کرتا ہے تو ایسا شخص دائرۂ اسلام سے خارج تصوّر کیا جائے گا۔ لیکن اگر وہ نماز کی فرضیت کا قائل ہے اور محض

سستی اور کاہلی کی بنا پر نماز نہیں پڑھتا تو وہ خارج از اسلام نہیں ہوگا۔ نماز کا مذاق اڑانے والوں کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۚ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُونَ ○ (المائدہ:۵۸)

جب تم نماز کے لئے منادی کرتے ہو تو وہ اس کا مذاق اڑاتے اور کھیلتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل نہیں رکھتے۔

اس آیت سے ان لوگوں کی پوزیشن کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو نماز، روزے اور دوسری عبادات کو پسماندگی اور پچھڑے پن کی علامت سمجھتے ہیں اور اللہ کی عبادت کرنے والوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام علماء وفقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نماز یا دوسرے ارکانِ اسلام کا مذاق اڑانے والا اور ان کی فرضیت سے انکار کرنے والا اسلام سے خارج تصور کیا جائے گا۔ درج ذیل حدیث اس رائے کی تائید کرتی ہے:

بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلٰوةِ۔(۱)

آدمی اور کفر کے درمیان نماز ترک کرنا ہے۔

البتہ جو شخص محض سستی اور کاہلی یا اپنی دُنیوی مصروفیات کی وجہ سے نماز نہیں پڑھتا ہے اور اسے اپنی غلطی کا احساس بھی ہے تو اس کے بارے میں فقہاء کے درج ذیل اقوال ہیں:

۱- احناف کے نزدیک اسے فاسق سمجھا جائے گا اور اس وقت تک اسے مارا جائے گا جب تک وہ نماز نہ پڑھنے لگے۔ اور ضرورت ہوئی تو اسے قید بھی کیا جاسکتا ہے۔

۲- امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ وہ فاسق ہے کافر نہیں۔ لیکن اگر وہ نمازیں چھوڑنے پر مصر ہے تو اسے مارنا پیٹنا یا قید کرنا کافی نہیں ہے، بلکہ اسے قتل کر دیا جائے گا۔

۳- امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اسے مرتد تصور کیا جائے گا اس لئے اس سے توبہ کا

مطالبہ کیا جائے گا اور اگر وہ توبہ نہیں کرتا ہے تو اس کی گردن ماردی جائے گی۔

قرآن وحدیث کی دلیلیں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کی تائید کرتی ہیں اور میرے نزدیک بھی یہی راجح قول ہے۔ قرآن وحدیث سے چند دلائل درج ذیل سطور میں پیش کرتا ہوں:

۱- قرآن نے ترک صلاۃ کو کفار کی خصلت بتایا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَ إِذَا قِيلَ لَهُمُ ارْكَعُوا لَا يَرْكَعُونَ ○ (المرسلات:۴۸)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے آگے جھکو تو نہیں جھکتے۔

سورۂ توبہ میں ہے:

فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ ط (التوبہ:۵)

پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو انہیں چھوڑ دو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جنگ نہ کرنے کی شرط شرک سے توبہ کرنا ہی نہیں، بلکہ نماز کی ادائی بھی ہے۔

سورہ المدثر میں ہے:

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ○

یعنی جنّتی دوزخیوں سے یہ پوچھیں گے کہ کیا چیز تمہیں جہنم میں لے گئی۔

تو دوزخی جواب دیں گے:

قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ○

وہ کہیں گے ہم نمازیوں میں سے نہیں تھے۔

۲- حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے:

بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ۔

بندے اور کفر کے درمیان نماز کا ترک کرنا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:

اَلْعَهْدُ الَّذِیْ بَیْنَنَا وَبَیْنَهُمُ الصَّلَاةُ فَمَنْ تَرَکَهَا فَقَدْ کَفَرَ۔

(بخاری، مسلم، ترمذی)

ہمارے اور ان کے درمیان نماز کا معاہدہ ہے۔ جس نے نماز چھوڑ دی اس نے کفر کیا۔

ایک اور حدیث میں ہے:

مَنْ تَرَکَ صَلَاةَ الْعَصْرِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ۔ (بخاری، مسند احمد، نسائی)

جس نے عصر کی نماز چھوڑ دی اس کے سارے اعمال برباد ہو گئے۔

صرف ایک وقت کی نماز ترک کرنے سے اچھے اعمال برباد ہو جاتے ہیں تو اس شخص کی کیا سزا ہو گی جس نے تمام نمازیں چھوڑ دیں۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے گھروں کو آگ لگانے کی خواہش ظاہر کی جو باجماعت نماز ادا نہیں کرتے۔ اس شخص کا جرم تو اور بھی بھیانک ہے، جو سرے سے نماز ہی نہیں پڑھتا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم بھی ترک نماز کو کفر گردانتے تھے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ''جس نے نماز نہیں پڑھی وہ کافر ہے۔'' ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ ''جس نے نماز چھوڑ دی وہ کافر ہو گیا۔'' عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ اور ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے بھی اسی قسم کے اقوال مروی ہیں۔

ان سب دلیلوں سے واضح ہوتا ہے کہ نماز چھوڑنے والا کافر ہے۔ اگر اسے کافر نہ بھی مانیں تو کم از کم اس کا فاسق ہونا تو بہرحال متفق علیہ ہے۔ اس لئے ہر نماز چھوڑنے والے کو چاہئے کہ اپنا محاسبہ کرے، توبہ کرے اور اللہ کی طرف رجوع کرے۔

علامہ ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نماز نہ پڑھنے والے کو نہ سلام کرنا چاہئے اور نہ اس کے سلام کا جواب دینا چاہئے، اس سے اپنی بیٹی کی شادی نہیں کرنی چاہئے کیونکہ درحقیقت وہ مسلمان ہے ہی نہیں۔

شریعت نے بھی نماز کو کسی حالت میں معاف نہیں کیا ہے۔ خواہ کسی بھی قسم کا عذر ہو۔ پانی نہ ہو تو تیمّم کر لے، اگر مریض ہے اور کھڑا نہیں ہو سکتا تو بیٹھ یا لیٹ کر نماز پڑھے حتیٰ کہ اگر اس پر بھی قادر نہ ہو تو محض اشارہ سے نماز ادا کرے۔ لیکن چھوڑنا کسی بھی صورت میں جائز نہیں۔

رہا یہ مسئلہ کہ اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی یا نہیں؟ تو جن لوگوں نے تارکِ نماز کو محض فاسق قرار دیا ہے، کافر نہیں، ان کے نزدیک اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی اور جن لوگوں نے اسے کافر قرار دیا ہے ان کے نزدیک اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ جن لوگوں نے اسے کافر قرار دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ تارکِ نماز کو اسی وقت سوسائٹی میں کافر سمجھا جائے گا یا اس سے کافروں جیسا معاملہ کیا جائے گا، جب امامِ وقت یا قاضی اسے نماز پڑھنے کو کہے اور وہ انکار کر دے۔ اس سے قبل ہم اس سے کافروں جیسا معاملہ نہیں کر سکتے۔

وضو کی مسنون دعائیں

سوال: بعض حضرات وضو کے دوران کچھ خاص دعائیں پڑھتے ہیں۔ شرعاً ان دعاؤں کی کیا حیثیت ہے؟ کیا ان دعاؤں کے بغیر وضو نہیں ہوتا؟

جواب: بہت سارے لوگ اس قسم کی دعاؤں کو واجب سمجھتے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ ان دعاؤں کے بغیر وضو نہیں ہوتا۔ میں نے ایک شخص سے دریافت کیا کہ آپ نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ انہوں نے جواب دیا کہ انہیں وضو کرنا نہیں آتا۔ میں نے کہا تعجب ہے کہ آپ کو وضو کرنا نہیں آتا۔ کیا کوئی ایسا بھی شخص ہو سکتا ہے جو منہ دھونا، ہاتھ دھونا، سر پر ہاتھ پھیرنا اور پیر دھونا نہ جانتا ہو؟ فرمانے لگے کہ یہ سب تو آتا ہے' لیکن مجھے وضو کی دعائیں یاد نہیں ہیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ان دعاؤں کے بغیر وضو ہوتا ہی نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نبی ﷺ سے اس قسم کی دعاؤں کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ البتہ

صرف ایک دعا ہے، جسے آپ ﷺ پڑھتے تھے۔ بعض لوگوں کے نزدیک حضور ﷺ یہ دعا وضو کے دوران پڑھتے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ حضور ﷺ یہ دعا' وضو کے بعد پڑھتے تھے۔ دعا یہ ہے:

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ ذَنْبِیْ وَوَسِّعْ لِیْ فِیْ دَارِیْ وَبَارِكْ لِیْ فِیْ رِزْقِیْ۔ (نسائی)

اے اللہ! میرے گناہ معاف فرما، میرے گھر میں وسعت عطا فرما اور میرے رزق میں برکت عطا فرما۔

وضو سے فراغت کے بعد یہ دعا پڑھتے ہیں:

اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْكَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

ان دعاؤں کی شرعی حیثیت صرف یہ ہے کہ یہ سنت ہیں۔ کوئی دعا ایسی نہیں جس کا وضو میں پڑھنا واجب ہو۔ جن دعاؤں کا وِرد عام طور پر وضو میں کرتے ہیں ان کی ابتدا حضور ﷺ کی وفات کے بعد ہوئی ہے۔ وضو ایک عبادت ہے اور عبادت میں ایسا عمل شامل کرنا جو حضور ﷺ سے ثابت نہیں، سراسر بدعت ہے۔ حضور ﷺ کی حدیث ہے:

اِیَّاکُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ فَاِنَّ کُلَّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ۔ (ابوداؤد، ترمذی، حسن صحیح)

خبردار (دین میں) نئی نئی ایجاد کی گئی باتوں سے بچو کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے۔

ہر عبادت میں دو باتوں کا خیال رکھنا چاہئے اور یہی دو شرطیں ہیں ان عبادات کے قبول ہونے کی:

۱- پہلی شرط تو یہ ہے کہ عبادت صرف اللہ کے لئے ہو کسی دوسرے کو اس میں شریک

نہ کیا جائے اور

۲- دوسری یہ کہ' عبادت اس طرح ادا کی جائے جس طرح شریعت نے ہمیں بتایا ہے۔ اس میں اپنی طرف سے کمی یا بیشی کرنا عبادت کی روح کے منافی ہے۔

موزوں پر مسح کرنا جائز ہے

سوال: کیا وضو کے دوران پیروں کو دھونے کے بجائے موزوں پر مسح کرنا جائز ہے؟

جواب: موزوں پر مسح کرنا جائز ہے بہ شرطے کہ وضو کر کے انہیں پہنا ہو۔ دوبارہ وضو کرنے کی صورت میں ان پر مسح کر لینا جائز ہے۔ اگر حالت سفر میں ہے تو تین دنوں تک ایسا کر سکتا ہے اور اگر مقیم ہے یعنی حالتِ سفر میں نہیں ہے تو ایک دن تک۔ موزوں پر مسح کی اجازت' لوگوں کی آسانی کے لئے ہے۔ خاص طور سے جاڑے کے دنوں میں جب کہ سردی سخت ہوتی ہے اور ہر وضو کے وقت موزوں کا اتارنا اور پیر دھونا بڑا مشکل کام ہوتا ہے، اور جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ دینِ اسلام آسانیوں کا دین ہے۔ پریشانیوں اور تنگیوں کا نہیں۔

متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ انہوں نے موزوں پر مسح کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ بعض فقہاء چند مشکل شرائط کے ساتھ اس کی اجازت دیتے ہیں۔ مثلاً یہ شرط کہ موزہ کافی موٹا ہو کہ اسے پہن کر بآسانی چلا جا سکتا ہو۔ اس میں کوئی بڑا سوراخ نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حدیثِ نبوی ﷺ میں ان شرطوں کا کہیں تذکرہ نہیں ہے۔ موزوں پر مسح کی اجازت کا مقصد ہی یہ ہے کہ وضو کرنے والوں کے لئے آسانی اور رخصت کی صورت پیدا ہو۔ جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے تو ہر مسلمان کے لئے جائز ہے کہ وہ اس رخصت سے فائدہ اٹھائے۔ بسا اوقات سخت سردی کے موسم میں موزوں کو اتار کر پیر دھونا طبیعت پر گراں گزرتا ہے یا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص سوٹ پر جوتا پہنے ہوئے ہے اور جوتے موزے کا اتارنا اسے سخت مشکل کام نظر آتا ہے۔

نتیجتاً نہ وہ وضو کرتا ہے اور نہ نماز پڑھتا ہے۔ اس قسم کے واقعات کا میں نے بہ ذاتِ خود مشاہدہ کیا ہے۔ ان حالات میں اگر ان سے کہا جائے کہ موزے پر مسح کرنا جائز ہے تو وہ وضو بھی کرتے ہیں اور نماز بھی ادا کرتے ہیں۔ ورنہ محض موزے اتار کر پیر دھونے کی مصیبت سے بچنے کے چکر میں وہ نماز بھی چھوڑ دیتے ہیں اور خاص کر وہ حضرات جن کا ایمان قدرے کمزور ہوتا ہے۔

اسلامی شریعت کا اصول ہے کہ جہاں تک ممکن ہو لوگوں کے لئے آسانی پیدا کی جائے۔ زمانے اور حالات کی رعایت ہو۔ یہ دور مختلف فتنوں اور مشکلات و مصائب کا دور ہے۔ خواہ مخواہ کی سختیاں پیدا کرنا لوگوں کے لئے باعثِ فتنہ اور دین سے دوری کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لئے تمام مسلمانوں سے میری اپیل ہے کہ دینی معاملات میں خواہ مخواہ اور بے بنیاد سختیاں نہ پیدا کریں۔ جہاں تک گنجائش ہو لوگوں کے سامنے شریعت کے آسان اور نرم پہلو اُجاگر کیے جائیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرۃ:۱۸۵)

اللہ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے۔ سختی کرنا نہیں چاہتا۔

’’مسجد تقویٰ‘‘

سوال: درج ذیل آیت میں مسجدِ تقویٰ سے مراد کون سی مسجد ہے؟

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ

(التوبۃ:۱۰۸)

جو مسجد اوّل روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی تھی وہی اس کے لئے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں عبادت کے لئے کھڑے ہو۔

جواب: اس مسجد سے مراد مسجدِ قبا بھی ہو سکتی ہے جسے حضور ﷺ نے مدینہ کی طرف ہجرت کے موقع پر تعمیر کیا تھا۔ مدینہ پہنچنے سے قبل آپ ﷺ نے مقامِ قبا پر قیام کیا اور اس

مسجد کی بنیاد رکھی۔ یہ اسلام کی پہلی مسجد تھی اور اس مسجد سے مراد مسجدِ نبوی ﷺ بھی ہو سکتی ہے' کیونکہ روزِ اوّل سے اس کی بنیاد بھی تقویٰ پر ہے۔ صحیح احادیث سے دونوں رایوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ بعض صحیح احادیث میں ہے کہ اس مسجد سے مراد مسجدِ قبا ہے اور بعض صحیح احادیث کے مطابق اس سے مراد مسجدِ نبوی ﷺ ہے اور ان احادیث میں کوئی تضاد بھی نہیں ہے' کیونکہ دونوں مسجدوں کی تعمیر تقویٰ کی بنیاد پر ہوئی ہے اور دونوں مساجد کی اہمیت و عظمت ایک مسلّم حقیقت ہے۔

مسجدِ نبوی ﷺ کی اہمیت یوں ہے کہ وہ دونوں حرم شریف میں سے ایک ہے اور مسجدِ قبا کی اہمیت حضور ﷺ کی اس حدیث سے واضح ہے کہ:

صَلَاةٌ فِیْ مَسْجِدِ قُبَاءَ کَعُمْرَۃٍ۔

مسجدِ قبا میں نماز پڑھنا عمرہ کرنے کے برابر ہے۔

غسلِ جنابت کی حکمت

سوال: میں کسی دوست سے غسلِ جنابت کی حکمت پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔ اس کے جواب نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔ وہ کہنے لگا کہ بیوی سے مباشرت کے بعد سارا جسم دھونے اور غسل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہی وجہ ہے کہ وہ صرف عضوِ تناسل کو دھونے پر ہی اکتفا کرتا ہے۔ میں نے اسے قائل کرنا چاہا لیکن اس کی تشفی نہیں ہوئی۔ آپ سے تشفی بخش جواب مطلوب ہے۔

جواب: جنابت کے بعد غسل کرنا ایک اسلامی فریضہ ہے۔ یہ قرآن وسنّت سے ثابت ہے اور تمام اُمت اس پر متفق ہے۔ قرآن میں اللہ کا حکم ہے:

وَاِنْ کُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّھَّرُوْا ط (المائدہ:۶)

اگر جنابت کی حالت میں ہو تو نہا کر پاک ہو جاؤ۔

متعدّد صحیح احادیث سے بھی غسلِ جنابت کی فرضیت ثابت ہے۔ تمام علماء وفقہاء اس کی فرضیت پر متفق ہیں۔ ان سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر کسی نے اس کی

فرضیت کا انکار کیا تو وہ اسلام کے دائرے سے خارج شمار کیا جائے گا' کیوں کہ اس کی فرضیت کا انکار درحقیقت قرآن وسنّت کی تکذیب ہے۔

اب رہا سوال اس کی حکمت کا۔ فرض کیجئے ایک ڈاکٹر اپنے مریض کے لئے دوائیں تجویز کرتا ہے۔ دو گولیاں کھانے سے قبل اور دو کھانے کے بعد' دو چمچی صبح اور دو چمچی شام۔ کیا مریض کا ڈاکٹر سے یہ سوال کرنا ضروری ہے کہ فلاں دوا دو چمچی کیوں لینی ہے، تین کیوں نہیں؟ اور فلاں کھانے سے قبل کیوں کھانی ہے، بعد میں کیوں نہیں؟ اگر ڈاکٹر مریض کو اس کی علت وحکمت بتا دیتا ہے تب بھی یہ طبّی باریکیاں کیسے مریض کی سمجھ میں آسکتی ہیں؟ اس کی صحیح حکمت ومصلحت تو صرف ایک تجربہ کار ڈاکٹر ہی سمجھ سکتا ہے۔

یہی مثال پیش کرنا چاہوں گا، ان سب لوگوں کے لئے جو شرعی احکام وعبادات کی حکمت کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول ساری عبادتیں انسانی دل کے لئے دوا کی مانند ہیں۔ انسان کو غفلت، غرور اور بھول چوک کے مرض سے شفا بخشنے کے لئے۔ یہ اللہ کا حق ہے کہ ان میں سے جس دوا کی حکمت چاہے' اپنے بندوں پر ظاہر کرے اور جس کی حکمت چاہے' پوشیدہ رکھے۔ بندے کو اس بات پر مکمل یقین ہونا چاہئے کہ اللہ نے جو دوائیں تجویز کی ہیں وہ ساری کی ساری اس کی بہبود اور بھلائی کے لئے ہیں۔

وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ الۡمُفۡسِدَ مِنَ الۡمُصۡلِحِ ؕ (البقرہ:۲۲۰)

بُرے اور بھلے دونوں کے بارے میں اللہ جانتا ہے۔

کتنے ہی ایسے شرعی احکام ہیں جن کی حکمت وغایت قرونِ اولیٰ میں پوشیدہ تھی۔ بعد کے وقتوں میں سائنسی ترقی نے ان کی حکمت وغایت سے لوگوں کو آگاہ کیا۔

عبادات اور شرعی احکام کی روح یہی ہے کہ انہیں اللہ کے حکم کے مطابق انجام دیا جائے، چاہے ہم ان کی حکمت سے واقف ہوں یا نہ ہوں۔ بندے کو ہر حال میں اپنے رب کی اطاعت کرنی چاہئے۔ اگر انسان صرف انہی چیزوں میں اپنے رب کی اطاعت

کرے جن میں اس کی محدود عقل مطمئن ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنی عقل کا بندہ ہے، اپنے رب کا نہیں۔

ویسے آپ غور کریں تو غسلِ جنابت حکمت و مصلحت سے خالی نہیں۔ اس کا فوری فائدہ یہ ہے کہ جنابت کے بعد جسم میں جو کاہلی، سستی اور کمزوری لاحق ہوتی ہے وہ غسل کرنے سے جاتی رہتی ہے اور اس کی جگہ طاقت اور چستی آجاتی ہے۔ پیشاب اگرچہ اس راستہ سے نکلتا ہے جس راستہ سے منی آتی ہے، لیکن پیشاب کرنے کے بعد جسم میں نہ کمزوری کا احساس ہوتا ہے نہ سستی کا۔ بلکہ اس کے برعکس آرام ملتا ہے۔ علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ منی چونکہ سارے بدن سے نکلتی ہے اس لئے اس میں سارا بدن دھونے یعنی غسل کرنے کا حکم ہے۔ اس کے برعکس پیشاب میں صرف خاص عضو کو دھونے کا حکم ہے، کیونکہ اس کا معاملہ منی جیسا نہیں ہے۔

آپ ذرا غور کریں کہ اگر پیشاب میں بھی اسی طرح نہانے کا حکم ہوتا جس طرح جنابت میں ہے تو یہ حکم بندوں کے لئے کس قدر باعثِ مشقت ہوتا۔ پیشاب کے برعکس جنابت ایسا عارضہ ہے جو کبھی کبھی لاحق ہوتا ہے اور اس حالت میں غسل کرنا بہت زیادہ باعثِ مشقت نہیں۔ اگر تھوڑی مشقت ہے بھی تو اس کی حکمت یہ ہے کہ بندہ جلدی جلدی اس فعل کی طرف نفسیاتی طور سے آمادہ نہ ہو اور جنسی تعلقات میں اسراف سے کام نہ لے۔

مجھے غسلِ جنابت میں ایک حکمت اور نظر آتی ہے۔ مومن کو صرف اپنی خواہشوں کی خاطر زندہ نہیں رہنا چاہئے۔ ہر کام میں اس پر اللہ کا بھی حق ہے۔ بیوی سے مباشرت کر کے اس نے اپنے نفس اور بیوی کا حق ادا کر دیا۔ اب اسے اللہ کا حق ادا کرنا ہے اور یہ حق غسل کر کے ادا ہو سکتا ہے، کیونکہ اللہ نے اس کا حکم دیا ہے۔

غسلِ جنابت میں حکمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اللہ نے بندوں کو مختلف بہانوں سے نظافت اور پاکی کی ترغیب دی ہے۔ مثلاً ہوا خارج ہو تو وضو کا حکم۔ پانچوں اوقات

میں وضو کرنے کا حکم اور اسی طرح جنابت لاحق ہو تو غسل کرنے کا حکم۔ اسی لئے اللہ فرماتا ہے:

وَلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ (المائدہ:۶)

مگر وہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر تمام کردے۔

گرجا گھروں میں نماز ادا کرنا

سوال: کیا گرجا گھروں میں نماز ادا کرنا جائز ہے؟ اگر اس کے علاوہ کوئی دوسری جگہ نماز پڑھنے کے لئے میسّر نہ ہو؟

جواب: حدیثِ نبوی ﷺ ہے کہ مجھے خدا نے پانچ چیزوں سے نوازا ہے، جو مجھ سے قبل کسی نبی کو عطا نہیں کی گئی تھیں۔ ان پانچ چیزوں میں سے ایک اہم یہ ہے:

جُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَّطُهُوْرًا۔ (بخاری ومسلم بہ روایت جابر رضی اللہ عنہ)

میرے لئے ساری زمین سجدے کی جگہ اور پاک بنائی گئی ہے۔

اس حدیث کی رُو سے مومن کے واسطے ساری زمین پاک ہے، وہ جہاں چاہے نماز ادا کرسکتا ہے۔ اگرچہ افضل یہی ہے کہ وہ ایسی جگہوں پر نماز نہ پڑھے جہاں غیر مسلموں سے مشابہت کا اندیشہ ہو۔ لیکن اگر اسے دوسری جگہ میسّر نہ ہو تو گرجا گھر یا کہیں بھی نماز ادا کرسکتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جب کسی گرجا گھر میں نماز پڑھنے کی فرمائش کی گئی تو انہوں نے صرف اس اندیشے کی وجہ سے وہاں نماز نہیں پڑھی کہ مستقبل میں لوگ اس گرجا گھر کو عمر رضی اللہ عنہ کی نماز کا بہانہ بنا کر مسجد میں تبدیل کردیں گے۔ ان کا وہاں نماز نہ پڑھنا اس وجہ سے نہیں تھا کہ یہ گرجا گھر ہے اور یہاں نماز جائز نہیں ہوتی۔

بسم اللہ بالجہر کہنے میں اختلاف

سوال: میں ایک مسجد کا امام ہوں اور مسلکاً شافعی ہوں۔ اس لئے سورۂ فاتحہ سے

قبل بآواز بلند بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھتا ہوں اور فجر کی دوسری رکعت میں رکوع کے بعد قنوتِ نازلہ پڑھتا ہوں۔ چونکہ مقتدیوں میں اکثریت حنابلہ کی ہے اس لئے وہ مجھ پر اعتراض کرتے رہتے ہیں۔ کیا میرے لئے جائز ہے کہ میں اکثریت کا خیال کرتے ہوئے بسم اللہ زور سے پڑھنا بند کر دوں اور قنوتِ نازلہ پڑھنا ترک کر دوں؟ یا مقتدیوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ میری اقتدا کریں کیونکہ میں ان کا امام ہوں؟

جواب: اگرچہ میں ان دونوں مسائل میں حنبلی مسلک کو راجح سمجھتا ہوں' لیکن میری رائے یہ ہے کہ ان اجتہادی مسائل میں تشدد کا کوئی جواز نہیں ہے۔ کیونکہ اختلاف صرف اس بات میں ہے کہ کون سی شکل جائز ہے اور کون سی شکل افضل۔ اختلاف اس میں نہیں ہے کہ کون سی شکل جائز ہے اور کون سی ممنوع۔

چنانچہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں روایت ہے کہ اپنے مسلک کے خلاف انہوں نے ان دنوں قنوتِ نازلہ نہیں پڑھی جن دنوں وہ بغداد میں تشریف رکھتے تھے۔ کیونکہ بغداد میں اکثریت احناف کی تھی۔ یعنی انہوں نے اکثریت کے مسلک کا احترام کیا۔ یہی اہلِ علم کا شیوہ ہے کہ وہ اجتہادی امور میں تشدد کا راستہ اختیار نہیں کرتے۔ ایک دوسرے سے جھگڑتے نہیں' بلکہ ایک دوسرے کی رایوں کا احترام کرتے ہیں۔

اس مناسبت سے میں شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول نقل کرنے پر اکتفا کروں گا۔

انہوں نے لکھا ہے کہ: ''تمام مسلمان اس امر پر متفق ہیں کہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے۔ جیسا کہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کا عمل تھا۔ سب ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ جس نے اس کی مخالفت کی' اسے گمراہ اور بدعتی تصوّر کیا گیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین میں ایسے بھی تھے جو بسم اللہ پڑھتے تھے۔ مثال کے طور پر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ مالکیوں کے پیچھے نماز پڑھتے تھے' حالانکہ مالکی حضرات بسم اللہ نہیں پڑھتے ہیں، نہ سرّی نمازوں میں اور نہ

جہری نمازوں میں۔''(۲)

اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد میں امام صاحب سے کہوں گا کہ اگر آپ نے اکثریت کا خیال کرتے ہوئے بسم اللہ نہیں پڑھی یا قنوتِ نازلہ نہیں پڑھی تو کوئی حرج کی بات نہیں اور یہی بات میں آپ کے مقتدیوں سے کہوں گا کہ اگر آپ نے امام کی اقتدا میں یہ دونوں چیزیں پڑھیں تو بھی کوئی حرج کی بات نہیں۔

صلاۃ الخوف

سوال: براہِ مہربانی صلاۃ الخوف اور اس کی تفصیل پر روشنی ڈالیں۔

جواب: قرآن شریف میں دو مقامات پر صلاۃِ خوف کا تذکرہ ہے۔ پہلی آیت ہے:

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ○ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ (البقرہ:۲۳۸)

اپنی نمازوں کی نگہداشت رکھو خصوصاً ایسی نماز کی جو محاسنِ صلوٰۃ کی جامع ہو۔ اللہ کے آگے فرمانبردار غلام کی طرح کھڑے ہو۔ بدامنی کی حالت ہو تو خواہ پیدل ہو خواہ سوار، جس طرح ممکن ہو نماز پڑھو۔

تمام ارکان وشرائط کی پابندی کے ساتھ نماز کی ادائیگی مسلمانوں پر فرض ہے۔ سوائے خوف اور بدامنی کی حالت میں۔ وہ بھی جب شدید خوف کی حالت ہو، جنگ چھڑ چکی ہو۔ تلواریں اور توپیں چل رہی ہوں۔ الغرض مکمل جنگ کی صورتِ حال ہو، تو ایسی حالت میں نماز کے بعض ارکان وشرائط کی پابندی شرط نہیں۔ تاہم نماز اس صورت میں بھی معاف نہیں ہوتی۔ نماز ہر حالت میں ادا کرنی چاہئے۔ پیدل ہوں یا ٹینک یا جنگی طیاروں پر سوار۔ اگر نماز کے بعض ارکان کی پابندی نہ ہو سکتی ہو مثلاً کھڑے ہو کر نماز پڑھنا وغیرہ تو ان ارکان کی پابندی ضروری نہیں۔ مجبوری ہو تو اشارے کے ذریعے نماز ادا کی جا سکتی ہے۔ دو وقت کی نمازیں ایک ساتھ ملا کر بھی پڑھی جا سکتی ہیں۔ یہ تو ہوئی صلاۃِ خوف کی ایک صورت۔

قرآن کی دوسری آیت میں صلاۃِ خوف کی دوسری صورت کا تذکرہ ہے۔ آیت ہے:

وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَوٰةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُم مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوٓا أَسْلِحَتَهُمْ فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِن وَرَآئِكُمْ وَلْتَأْتِ طَآئِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ (النساء:۱۰۲)

اور اے نبی ﷺ جب تم مسلمانوں کے درمیان ہو اور انہیں نماز پڑھانے کھڑے ہو تو چاہئے کہ ان میں سے ایک گروہ تمہارے ساتھ کھڑا ہو اور اپنا اسلحہ لئے رہے۔ پھر جب وہ سجدہ کر لے تو پیچھے چلا جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے آکر تمہارے ساتھ نماز پڑھے اور وہ بھی چوکنا رہے اور اپنے اسلحہ لئے رہے۔

یہ ایک دوسری صورت ہے خوف کی جو پہلی صورت سے ہلکی ہے۔ مثلاً جنگ نہ چھڑی ہو لیکن جنگ کا ماحول بن چکا ہو۔ جنگ کے لئے سب تیار ہوں یا بدامنی کی صورت پھیلی ہو۔ ایسی صورت میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ سب کے سب ایک ساتھ نماز نہ پڑھیں۔ بلکہ ایک گروہ نماز پڑھ کر فارغ ہو جائے تب دوسرا گروہ نماز کے لئے کھڑا ہو۔ لیکن ایسی حالت میں بھی جماعت کے ساتھ نماز ادا کی جانی چاہئے جیسا کہ آیتِ مذکور سے ظاہر ہے۔

حالتِ جنگ میں ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمان خوف و دہشت کا بہانہ بنا کر نماز ترک کر دیں بلکہ اس کے برعکس اسے چاہئے کہ نماز کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کریں کیونکہ خوف اور جنگ کی حالت میں خدا سے قربت کا احساس مزید تقویت کا باعث ہوگا اور تقویت میدانِ جنگ میں نہایت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

یہ ہے صلاۃِ خوف کی تفصیل اور اس کی ادائیگی کا طریقۂ کار۔ اس نماز میں

مسلمانوں کے لئے دو عبرتیں ہیں۔

۱- پہلی عبرت یہ ہے کہ ہر حالت میں نماز کی پابندی کرنی چاہئے' چاہے امن کی حالت ہو یا خوف کی۔

۲- دوسری یہ کہ نماز باجماعت ادا کرنی چاہئے' خواہ بدامنی ہی کی حالت کیوں نہ ہو۔ نماز باجماعت ادا کرنا اسلامی شعار ہے اور ضروری ہے کہ اس شعار کی حفاظت کی جائے۔ اللہ فرماتا ہے:

وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ۝ (البقرہ:)

اور رکوع کرنے والوں (نماز پڑھنے والوں) کے ساتھ رکوع کرو۔

اس آیت میں نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنے کی تاکید ہے۔

پٹی بندھی ہونے کی حالت میں وضو

سوال: ہاتھوں میں یا انگلیوں میں پٹی بندھی ہو تو کیا اس پر وضو کرنا جائز ہے؟ کیونکہ پٹی کھول کر وضو کرنے کی صورت میں زخم کے بڑھنے یا مزید تکلیف دہ ہونے کا اندیشہ ہے۔

جواب: اگر وضو کی جگہ پر کٹنے، جلنے یا ایسی ہی کسی وجہ سے پٹی بندھی ہو تو اس پر مسح کر کے وضو کی تکمیل کی جا سکتی ہے۔

فقہاء کے درمیان اس بات میں اختلاف ہے کہ پٹی باندھنے سے قبل وضو کرنا ضروری ہے یا نہیں۔ لیکن میری نظر میں راجح قول یہ ہے کہ پٹی باندھنے سے قبل وضو شرط نہیں ہے۔ اگر اس نے وضو کے بغیر ہی پٹی باندھ لی ہو تو اس پر بھی مسح کر سکتا ہے۔

چاند گرہن اور سورج گرہن کی نماز

سوال: زمانۂ قدیم میں یہ عقیدہ تھا کہ چاند گرہن یا سورج گرہن خدا کے غیظ و غضب کی علامت ہے۔ بندوں کی نافرمانی جب زیادہ بڑھ جاتی ہے، تو ایسی چیزیں خدا کا غضب ظاہر کرنے کے لئے ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ لیکن آج جبکہ سائنس کافی ترقی کر چکا

ہے، علمِ فلکیات کا طالب علم اور سارے ہی لوگ جانتے ہیں کہ سورج گرہن یا چاند گرہن کا سبب خدا کا غیظ وغضب نہیں، بلکہ یہ ایک نہایت معمولی واقعہ ہوتا ہے جو کہ بعض تغیرّات کی وجہ سے رونما ہوتا ہے۔ سائنس اتنا ترقی کر چکا ہے کہ ہمیں کافی پہلے سے خبر ہو جاتی ہے کہ سورج یا چاند گرہن کب، کہاں اور کتنی دیر کے لئے ہوگا۔ کیا واقعی ایسی صورت میں نماز پڑھنا گرہن کو ٹال سکتا ہے؟ براہِ مہربانی چاند اور سورج گرہن کے موقع پر جو نماز پڑھی جاتی ہے اس کی حکمت سے آگاہ کریں کیونکہ دشمنانِ اسلام نے اسے تضحیک کا ذریعہ بنالیا ہے۔

جواب: چاند گرہن یا سورج گرہن کی نماز کا تذکرہ قرآن میں نہیں، بلکہ حدیث میں ہے ۱۰ھ میں جب سورج گرہن ہوا تو آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ نماز ادا کی اور گرہن ختم ہونے تک نماز پڑھتے رہے۔ کسی بھی صحیح حدیث میں یہ تذکرہ نہیں ہے کہ چاند یا سورج گرہن خدا کے غیظ وغضب کی علامت ہے۔ اگر واقعتہً گرہن خدا کے غیظ وغضب کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتا تو اسے مکی دور میں ضرور ہونا چاہئے تھا، جب کہ اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی اپنے عروج پر تھی۔ سورج گرہن ۱۰ھ میں ہوا جبکہ مکہ فتح ہو چکا تھا اور جوق در جوق لوگ اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ یہ تو خدا کی خوشنودی کا موقع تھا۔

زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کا یہ اعتقاد تھا کہ گرہن ایک طبعی تبدیلی ہے جو کہ کسی عظیم شخصیت کی وفات پر رونما ہوتی ہے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ حضور ﷺ کے بیٹے ابراہیم کی وفات کے دن ہی سورج گرہن ہوا۔ لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ابراہیم کی موت پر آج سورج بھی سوگوار ہے اور اسی وجہ سے اس پر گرہن ہے۔ یہ سن کر حضور ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کر کے ایک تقریر کی اور اس باطل عقیدہ کی تردید میں آپ ﷺ نے فرمایا:

"کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ سورج گرہن یا چاند گرہن یا تاروں کا ٹوٹنا، کسی عظیم

شخصیت کی موت کی وجہ سے نمودار ہوتا ہے، یقیناً ان کا عقیدہ باطل ہے۔ یہ تو اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے جس پر اللہ کی عبادت کرنی چاہیے۔''(۳)

بخاری شریف کی روایت ہے:

اِنْکَسَفَتِ الشَّمْسُ یَوْمَ مَاتَ اِبْرَاهِیْمُ فَقَالَ النَّاسُ اِنْکَسَفَتِ الشَّمْسُ لِمَوْتِ اِبْرَاهِیْمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ آیَتَانِ مِنْ آیَاتِ اللّٰهِ لَا یَنْکَسِفَانِ لِمَوْتِ اَحَدٍ وَّلَا لِحَیَاتِهٖ فَاِذَا رَأَیْتُمُوْهُمَا فَادْعُوا اللّٰهَ وَصَلُّوْا حَتّٰی یَنْجَلِیَ۔

جس دن ابراہیم کا انتقال ہوا اسی دن سورج گرہن ہوا۔ لوگوں نے کہا کہ ابراہیم کی موت کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ چاند اور سورج اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ ان دونوں کا گرہن کسی کی موت یا زندگی کی وجہ سے نمودار نہیں ہوتا۔ جب تم گرہن دیکھو تو اللہ سے دعا کرو اور گرہن ختم ہونے تک نماز پڑھو۔

بخاری شریف کی ایک دوسری روایت ہے:

لَایَنْکَسِفَانِ لِمَوْتِ اَحَدٍ وَّلٰکِنَّ اللّٰهَ یُخَوِّفُ بِهِمَا عِبَادَهٗ۔

ان دونوں کا گرہن کسی کی موت کی وجہ سے نہیں ہوتا' بلکہ اللہ اپنے بندوں کو اس کے ذریعہ ڈراتا ہے۔

حدیث کے یہی الفاظ یعنی ''اللہ ان کے ذریعے اپنے بندوں کو ڈراتا ہے'' یا ''اس کے ختم ہونے تک نماز پڑھتے رہا کرو'' وہ الفاظ ہیں جنہیں دشمنانِ اسلام نے تضحیک اور تمسخر کا نشانہ بنالیا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ تو ایک طبیعی عمل ہے۔ جیسے کہ دوسرے طبیعی عمل ہیں۔ پھر صرف گرہن کے موقعے پر نمازیں کیوں پڑھی جائیں؟ ان کے ذریعے بندوں کو ڈرانا کیسا؟ اور دعائیں کیوں مانگی جائیں؟ وغیرہ۔

بے شبہ یہ ایک طبیعی عمل ہے، جو اپنے وقتِ مقررہ پر ظاہر ہوتا ہے۔ نہ وقت سے

پہلے اور نہ وقت کے بعد۔ کائنات کی ان تمام طبیعی حرکتوں کی طرح ان کا ظہور اللہ کے بنائے ہوئے طریقے کے مطابق اپنے مقررہ وقت پر ہوتا ہے۔ اس کائنات میں جو چیز بھی وقوع پذیر ہوتی ہے، خدا کی مرضی سے ہوتی ہے۔ البتہ ان طبیعی حرکتوں اور سرگرمیوں میں جب کوئی بڑی تبدیلی رونما ہوتی ہے تو یقیناً ایسا ہوتا ہے، جب خدا کی قدرت وعظمت کا خاص طور سے احساس ہو، اس احساس کے نتیجے میں جسم اور دل خدا کے حضور سجدہ ریز ہوں۔ ہونٹوں پر دعائیں ہوں اور دل اللہ کی عظمت وکبریائی کے احساس سے تھر تھر کانپ رہا ہو اور یہی وہ جذبہ ہے جس کی طرف حدیث میں اشارہ ہے۔ خدا کی عظمت وکبریائی کا احساس صرف گرہن کے موقعے پر ہی نہیں' بلکہ حضور ﷺ نے دوسری بہت ساری طبیعی تبدیلیوں اور تغیرّات پر ہمیں اس بات کی ترغیب دی ہے کہ ہم خدا کی عظمت کا احساس کریں۔ اس سے دعائیں مانگیں اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہوں۔ مثلاً:

۱- صبح ہونے یا شام ہونے پر، حضور ﷺ نے اپنی اُمت کو تعلیم دی ہے:

إِذَا أَصْبَحَ أَحَدُكُمْ فَلْيَقُلْ اَللّٰهُمَّ بِكَ أَصْبَحْنَا وَبِكَ أَمْسَيْنَا وَبِكَ نَحْيَا وَبِكَ نَمُوْتُ وَإِلَيْكَ النُّشُوْرُ۔ (۴)

جب صبح ہو تو تم میں سے ہر ایک کو یہ کہنا چاہئے کہ یا اللہ! ہم نے تیری وجہ سے صبح کی اور تیری وجہ سے رات کی۔ تیری وجہ سے زندہ ہیں اور تیری وجہ سے مر جائیں گے۔ اور تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔

جب شام ہو تو ان الفاظ کا اعادہ کرے۔

۲- ہواؤں کے چلنے اور بادل کے چھانے پر: عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ جب ہوا چلتی تھی تو حضور ﷺ فرماتے تھے:

اَللّٰهُمَّ أَسْأَلُكَ خَيْرَهَا وَخَيْرَ مَا فِيْهَا وَخَيْرَ مَا أُرْسِلَتْ بِهِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ مَا فِيْهَا وَشَرِّ مَا أُرْسِلَتْ بِهِ۔ (۵)

اے اللہ میں تجھی سے اس کی اور اس کے اندرون جو بھلائی ہو طلب کرتا ہوں اور یہ

ہوا جو چیز دے کر بھیجی گئی ہے، اس کی بھلائی طلب کرتا ہوں اور تیری پناہ مانگتا ہوں اس کے شر سے اور اس کے اندرونی شر سے اور جو چیز دے کر یہ ہوا بھیجی گئی ہے۔ اس کے شر سے۔

۳- پہلی تاریخ کا چاند دیکھنے پر: ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پہلی تاریخ کا چاند دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اَهِلَّهٗ عَلَيْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِيْمَانِ وَالسَّلَامَةِ وَالْاِسْلَامِ وَالتَّوْفِيْقِ لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى رَبُّنَا وَرَبُّكَ اللّٰهُ۔ (۶)

اے اللہ اس چاند کو تو ہمارے لئے امن و ایمان اور سلامتی کا پیام بنا اور جن کاموں سے تو خوش ہو ان کی توفیق کا ذریعہ بنا۔ ہمارا اور اس چاند کا رب اللہ ہی ہے۔

اسی طرح متعدد دعائیں اور اذکار ہیں جو متعدد موقعوں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پڑھا کرتے تھے اور ہمیں اس کی تعلیم دی ہے۔ مثلاً سونے کے وقت، جاگنے کے وقت، کھانے پینے کے وقت، نیا کپڑا پہننے پر، سواری پر سوار ہوتے وقت۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان دعاؤں کا مقصد یہ ہے کہ انسان کا دل و دماغ اللہ تعالیٰ کی طرف مائل رہے اور وہ اللہ کو بھول نہ جائے۔ جب صبح و شام جیسی روزمرہ کی تبدیلیوں پر ہمیں دعاؤں کی تعلیم دی گئی ہے تو چاند اور سورج گرہن جو سالوں بعد پیش آتے ہیں، ان موقعوں پر ہمیں صرف دعاؤں پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے بلکہ دعاؤں کے ساتھ ساتھ نوافل کا بھی اہتمام کرنا چاہئے۔

ایک مومن ان طبعی تبدیلیوں کو صرف ان ہی آنکھوں سے نہیں دیکھتا جن سے عام دنیا والے دیکھتے ہیں بلکہ وہ عبرت کی نگاہوں سے انہیں دیکھتا ہے۔ خدا کی لامحدود قوت و حکمت کا اسے احساس ہوتا ہے اور اس احساس کے تحت وہ اللہ کی بڑائی بیان کرتا ہے اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے۔

چاند اور سورج گرہن میں مزید ایک قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ یہ گرہن قیامت کی یاد دلاتا رہتا ہے۔ اس کائنات کے ختم ہونے کی یاد دلاتا رہتا ہے' کیوں کہ اس تمام کائنات کی طرح یہ سورج اور چاند بھی فانی ہیں۔ ان میں وقوع پذیر تبدیلیوں پر بندۂ مومن عبرت کی نگاہیں ڈالتا ہے۔ آج کے حالات سے کل کی باتوں کو محسوس کرتا ہے۔ قربِ قیامت کا احساس اس کے دل میں جاگزیں ہوتا ہے اور یوں وہ قیامت کی تیاریوں میں مشغول ہو جاتا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''المنقذ من الضلال'' میں لکھا ہے کہ:

''یہ گمان کرنا نہایت غلط ہے کہ اسلام ان علومِ حدیثہ کا انکار کرتا ہے۔ شریعت میں کوئی ایسی بات نہیں جو ان جدید علوم سے نفی یا اثبات کے طور پر تعرّض کرتی ہو۔ اور نہ ان جدید علوم میں ہی کوئی ایسی بات ہے جو اسلامی اصول کے خلاف ہو۔

دو وقت کی نمازوں کو ملا کر پڑھنا

سوال: ایسی پارٹیوں میں شرکت کی وجہ سے' جو عام طور پر ظہر سے مغرب تک منائی جاتی ہیں' کیا ہمارے لئے جائز ہے کہ ہم ظہر اور عصر کی نمازوں کو ملا کر ایک ساتھ ادا کریں؟

جواب: حنبلی مسلک کے لحاظ سے کسی بھی عذرِ شرعی کی بنا پر دو وقت کی نمازوں یعنی ظہر اور عصر یا مغرب اور عشاء کو یکجا کر کے ایک ساتھ ادا کرنا جائز ہے۔ اس میں نمازیوں کے لئے یقیناً آسانی ہے۔ روایتوں میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر اور بارش کے علاوہ بھی دو وقت کی نمازیں یکجا کر کے پڑھی ہیں۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے اس بارے میں پوچھا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیوں کیا؟ تو انہوں نے فرمایا کہ: تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو تنگی اور مشکلات پیش نہ آئیں۔ یہ روایت صحیح مسلم میں موجود ہے۔

اس قسم کی روایتوں کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر واقعی کسی قسم کی پریشانی ہو تو دو وقت کی نمازیں ملا کر پڑھی جا سکتی ہیں۔ بہ شرطے کہ یہ عادت نہ بن جائے کہ ہر دو تین

دن کے بعد نمازیں ملا کر پڑھی جائیں۔ واقعی عذر کی مثال یہ ہے کہ ایک سپاہی ہے جس کی ڈیوٹی مغرب سے پہلے سے عشاء کے بعد تک ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں نماز نہیں پڑھ سکتا۔ وہ چاہے تو مغرب اور عشاء کی نماز ایک ساتھ پڑھ سکتا ہے۔ یا ایک ڈاکٹر ہے جو دیر تک آپریشن میں مصروف رہتا ہے وہ چاہے تو دو نمازیں ملا کر پڑھ سکتا ہے۔

لیکن میں نہیں سمجھتا کہ پارٹیوں میں شرکت کرنا کوئی عذر واقعی ہے۔ اگر وہ واقعی سچا مسلمان ہے تو پارٹیوں کے درمیان بھی نماز ادا کر سکتا ہے۔ اس میں شرمانے اور جھجکنے کی کوئی بات نہیں۔ بلکہ اسے علی الاعلان پارٹیوں کے دوران نماز ادا کرنی چاہئے تا کہ دوسرے بھی نصیحت حاصل کریں۔

سنن رواتب کی اہمیت

سوال: سنّتوں کو چھوڑ کر صرف فرض نماز پڑھنے پر اکتفا کروں تو کیا یہ جائز ہے؟

جواب: دن بھر میں پانچ نمازیں ہر مسلم مرد و عورت پر فرض ہیں۔ لیکن ان فرض نمازوں کے علاوہ چند نمازیں اور بھی ہیں جنہیں ہم سنّت رواتب یا سنّت مؤکدہ کہتے ہیں۔ آپ ﷺ ہمیشہ ان کی پابندی کیا کرتے تھے اور اپنی اُمت کو بھی ان سنّتوں کی پابندی کی ہدایت کی ہے۔ اس لئے ہر مسلم کو چاہئے کہ وہ ان سنّتوں کا اہتمام کرے اور فرض نمازوں کے ساتھ انہیں بھی پڑھا کرے' اس کے متعدّد فوائد ہیں۔ مثلاً:

۱۔ یہ سنّتیں اللہ تعالیٰ سے قربت کا ذریعہ ہیں اور ہمارے نامۂ اعمال میں نیکیوں میں اضافے کا سبب ہیں۔ ہر شخص کوشش کرتا ہے کہ اس کا بینک اکاؤنٹ زیادہ سے زیادہ مضبوط ہو۔ جب دُنیوی مال و اسباب کے سلسلے میں حرص کا یہ عالم ہے، تو آخرت کے اکاؤنٹ کو بڑھانے اور مضبوط کرنے کی طرف اسے بدرجۂ اَولیٰ دھیان دینا چاہئے۔

حدیثِ قدسی ہے:

مَا تَقَرَّبَ عَبْدِیْ اِلَیَّ بِمِثْلِ اَدَآءِ مَا افْتَرَضْتُهٗ عَلَیْهِ وَلَا یَزَالُ

عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّہٗ۔ فَاِذَا اَحْبَبْتُہٗ کُنْتُ سَمْعَہُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِہٖ وَبَصَرَہُ الَّذِیْ یَبْصُرُ بِہٖ وَیَدَہُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِھَا۔(۷)

فرض کاموں سے زیادہ کوئی دوسرا کام بندے کو مجھ سے قریب نہیں کرتا اور سنّتوں اور نوافل کے ذریعے بندہ میری قربت کے لئے مسلسل کوشاں رہتا ہے حتیٰ کہ میں اسے چاہنے لگتا ہوں۔ جب وہ میرا محبوب ہو جاتا ہے تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں' جن سے وہ سنتا ہے۔ اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں' جن سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں' جن سے وہ پکڑتا ہے۔

۲- ان سنّتوں میں کوتاہی اور ان سے غفلت برتنا اس بات کی علامت ہے کہ بندے کے اندر حضور ﷺ سے محبت اور تعلّق میں کمی ہے۔ جب حضور ﷺ نے ان سنّتوں پر پابندی کی ہے، تو ان سے محبت کا تقاضا ہے کہ ہم بھی ان کی پابندی کریں۔ اللہ فرماتا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب:۲۱)

درحقیقت تمہارے لئے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے۔

۳- ان سنّتوں کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ فرض نمازوں میں جو کوتاہیاں اور خامیاں رہ جاتی ہیں' ان سنّتوں سے اللہ تعالیٰ ان کی تکمیل اور تلافی کرتا ہے۔ کوئی مسلمان اس بات کا دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس نے فرض نماز مکمل طریقے سے ادا کی ہے اور اس میں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی۔ قیامت کے دن سب سے پہلے نمازوں کا حساب کتاب ہوگا۔ سب سے پہلے اس کی فرض نمازیں پیش کی جائیں گی۔ ان فرض نمازوں میں اگر کمی یا خامی رہ گئی ہوگی تو سنّتوں اور نوافل کے ذریعے ان خامیوں کی تلافی کی جائے گی۔

بہر حال ان سب فوائد کے باوجود اگر کوئی شخص فرض نمازوں پر ہی اکتفا کرتا ہے' تو وہ گنہگار نہیں ہے۔ کیونکہ اس نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ ایک صحیح حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے اس دیہاتی کے بارے میں جس نے قسم کھائی تھی کہ وہ ان فرض کاموں میں سے نہ کچھ کم کرے گا اور نہ زیادہ' فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی جنتی کو دیکھنا چاہتا ہے تو اس دیہاتی کو دیکھ لے۔ اس حدیث سے واضح ہے کہ صرف فرض کاموں پر اکتفا کرنا' باعثِ گناہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس اگر کوئی شخص فرض کاموں کو پابندی سے ادا کرتا ہے تو اس کے لئے جنّت کی بشارت ہے۔

نماز میں خشوع وخضوع کی اہمیت

سوال: نماز میں خشوع وخضوع کی کیا اہمیت ہے؟ کیا اس کے بغیر نماز قبول نہیں ہوتی؟

جواب: نماز میں خشوع وخضوع کے فقدان کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں:

۱- پہلی صورت یہ ہے کہ نماز کے دوران ایسی حرکتیں کچھ زیادہ سرزد ہوں جو نماز کے منافی ہیں۔ مثلاً بدن کھجانا، ادھر ادھر دیکھنا، بار بار اپنے کپڑوں کو درست کرنا وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کی حرکتیں اگر کثرت سے سرزد ہوں تو نماز کو باطل کر دیتی ہیں یعنی نماز ادا نہیں ہوتی۔

۲- دوسری صورت یہ ہے کہ نماز کے دوران ذہن کہیں اور مشغول ہو، نماز کی طرف دل حاضر نہ ہو یا چھوٹی موٹی نماز کے منافی حرکتیں' بہت کم مقدار میں سرزد ہوں تو ان کی وجہ سے نماز اگرچہ باطل نہیں ہوتی لیکن نماز کا مقصد جاتا رہتا ہے اور نماز کی روح مفقود ہو جاتی ہے۔ نماز کی روح یہ ہے کہ نمازی زیادہ سے زیادہ خشوع وخضوع کے ساتھ اپنے رب کی طرف متوجہ ہو۔ اللہ فرماتا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ○ (المومنون:۱،۲)

یقیناً فلاح پائی ایمان لانے والوں نے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے

ہیں۔

خشوع وخضوع کی دو قسمیں ہیں: دل کا خشوع اور جسم کا خشوع۔

دل کا خشوع یہ ہے کہ نمازی کو اس بات کا احساس ہو کہ وہ اللہ کے سامنے کھڑا ہے اور اللہ اسے دیکھ رہا ہے، دل میں اللہ کی عظمت وکبریائی کا خیال ہو، جو کچھ پڑھ رہا ہو اس کے مفہوم ومعانی پر غور کرے۔ قرآن کی آیتوں کو سمجھ سمجھ کر پڑھے۔ نماز کے ارکان کی حکمت وغایت سمجھ کر انہیں ادا کرے اور جسم کا خشوع یہ ہے کہ نماز کے دوران اِدھر اُدھر نگاہ نہ دوڑائے، بچوں جیسی حرکتیں نہ کرے، ایسی حرکتیں نہ کرے جو نماز کے منافی ہیں۔ بلکہ نہایت باوقار انداز میں اور عاجزانہ کیفیت کے ساتھ اللہ کے حضور کھڑا ہو۔ جسم کا خشوع اسی وقت ممکن ہے، جب دل کا خشوع موجود ہو۔

ایک بزرگ عالم حاتم الاصم سے دریافت کیا گیا کہ آپ نماز کس طرح ادا کرتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: ''میں تکبیر کہتا ہوں، پھر ٹھہر ٹھہر کر قرأت کرتا ہوں۔ خشوع کے ساتھ رکوع کرتا ہوں۔ عاجزانہ انداز میں سجدے کرتا ہوں۔ جنّت کو اپنے دائیں طرف اور دوزخ کو بائیں طرف محسوس کرتا ہوں۔ پُل صراط کو اپنے قدموں تلے محسوس کرتا ہوں۔ کعبے کو اپنی پیشانی کے سامنے تصوّر کرتا ہوں۔ ملک الموت کو اپنے سر کے اوپر تصوّر کرتا ہوں۔ اپنے آپ کو گناہوں میں گھرا ہوا سمجھتا ہوں۔ اس حال میں کہ اللہ کی آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں۔ یہ سمجھتا ہوں کہ میری عمر کی یہ آخری نماز ہے۔ اس لئے حتّی الامکان خلوص کے ساتھ نماز ادا کرتا ہوں۔ اس کے بعد سلام پھیرتا ہوں۔ اس کے باوجود مجھے اندیشہ رہتا ہے کہ میری نماز قبول بھی ہوئی یا نہیں۔''

ایسی ہوتی ہے ایک مومن کی نماز اور یہی وہ نماز ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ ۝ (العنکبوت:)

بے شبہ نماز فحش باتوں سے اور گناہ سے روکتی ہے۔

شرابی کی نماز

سوال: اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے، جو شراب بھی پیتا ہو اور نماز بھی پڑھتا ہو؟

جواب: بے شبہ یہ ایک افسوس ناک صورتِ حال ہے' کیونکہ صحیح اور سچی نماز تو وہ ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ الصَّلَاةَ تَنۡهٰى عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ ؕ (العنکبوت:)

بے شک نماز بے حیائی کے کاموں اور برائیوں سے روکتی ہے۔

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ شراب پینا گناہِ کبیرہ ہے' کیونکہ شراب عقل، صحت، مال اور شخصیت سب کے لئے انتہائی نقصان دہ ہے۔ اور سوسائٹی پر اس کے جو خراب اثرات مرتّب ہوتے ہیں وہ ان نقصانات کے علاوہ ہیں۔ اگر مومن اتنا ہی ضعیف الایمان ہے کہ شیطان اسے شراب پینے پر آمادہ کر سکتا ہے، تو اسے چاہئے کہ نشے کی حالت میں نماز نہ پڑھے' کیونکہ نشہ نجاست ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَقۡرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنۡتُمۡ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعۡلَمُوۡا مَا تَقُوۡلُوۡنَ (النساء:۴۳)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب مت جاؤ۔ نماز اس وقت پڑھنی چاہئے جب تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو۔

پس جب اس کا نشہ زائل ہو جائے اور وہ غسل یا وضو کر لے اور نماز ادا کر لے تو ان شاء اللہ اس کی نماز مقبول ہوگی اور امید ہے کہ اس کی نماز ایک نہ ایک دن اسے اس لعنت سے نجات دلائے گی۔

نماز ایک فرض ہے جسے وہ ادا کرتا ہے اور شراب پینا ایک جرم ہے جس کا وہ ارتکاب کر رہا ہے۔ ایک نیک کام ہے تو دوسرا بُرا کام اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ہر نیک کام کا اسے اچھا بدلا ملے گا اور ہر بُرے کام کا حساب اسے دینا ہوگا۔ اللہ فرماتا ہے:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (الزلزال: ۷، ۸)

پھر جس نے ذرّہ برابر نیکی کی ہوگی اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرّہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔

ہم ایسا نہیں کہہ سکتے کہ چونکہ تم شراب پیتے ہو اس لئے تم نماز بھی نہ پڑھا کرو۔ اس کی نماز اپنی جگہ اور شراب پینا اپنی جگہ۔ ایسا نہیں کہ شراب پینے کی وجہ سے وہ نمازیں چھوڑ دے۔ کیونکہ جب تک وہ نماز پڑھ رہا ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ نماز کی وجہ سے وہ شراب نوشی اور دوسری برائیوں سے اجتناب دیر یا سویر کرے گا۔

اگر مجھ سے کوئی یہ سوال کرے کہ درج ذیل صورتوں میں سے کون سی صورت افضل ہے؟ پہلی صورت یہ کہ آدمی شراب پیتا ہے اور نماز بھی نہیں پڑھتا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی شراب پیتا ہے اور نماز بھی پڑھتا ہے۔ میں کہوں گا کہ جو شخص شراب پیتا ہے اور نماز بھی پڑھتا ہے وہ اس شخص سے افضل ہے جو شراب پیتا ہے اور نماز نہیں پڑھتا۔ کیونکہ جو شخص شراب پیتا ہے اور نماز پڑھتا ہے' اس نے ایک نیک کام کیا اور دوسرا بُرا کام۔ جبکہ وہ شخص جو شراب پیتا ہے اور نماز نہیں پڑھتا، اس نے دونوں بُرے کام کیئے۔

وہ پانی جسے حائضہ عورت چھو لے

سوال: کیا اس پانی سے وضو جائز ہے جسے کسی حائضہ عورت نے چھوا ہو؟

جواب: یہ بات جان لینی چاہئے کہ حائضہ عورت کا جسم ناپاک نہیں ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ جس چیز کو چھو لے وہ چیز ناپاک ہو جاتی ہو۔ حائضہ عورت کی جو ناپاکی ہے وہ محض شرعی ناپاکی ہے اور اس شرعی ناپاکی کو ایک شرعی حکم یعنی غسل ہی دور کر سکتا ہے۔

پرانے زمانہ میں عورتیں حائضہ عورت کے بدن کو ناپاک تصوّر کرتی تھیں حتیٰ کہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لانے کو کہا تو عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ میں تو حیض کی حالت میں ہوں' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حیض تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔

(بخاری)۔ یعنی تمہارا ہاتھ ناپاک نہیں ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حائضہ عورت جس پانی کو چھو لے وہ پانی ناپاک نہیں ہوتا اور اس سے وضو کرنا بالکل جائز ہے۔

یہی حالت اس شخص کی ہے جو جنابت کی وجہ سے ناپاک ہو۔ اس کا بدن ناپاک نہیں ہوتا' بلکہ اس کی ناپاکی ایک شرعی ناپاکی ہے۔ روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے پاس جانے سے کترا رہے تھے۔ حضور ﷺ نے وجہ پوچھی تو انہوں نے عرض کیا کہ میں جنابت کی حالت میں ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: سبحان اللہ! مومن نجس نہیں ہوتا (بخاری و مسلم)۔ یعنی جنابت کی حالت محض شرعی اعتبار سے نجاست ہے' ورنہ مومن کا جسم ناپاک نہیں ہوتا۔

جماعت کے پیچھے تنہا نماز کا حکم

سوال: مقتدی اگر جماعت میں سب سے پیچھے تنہا نماز ادا کرے تو کیا اس کی نماز صحیح ہوگی؟

جواب: امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور ابنِ ماجہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک شخص کو جماعت میں سب سے پیچھے تنہا نماز پڑھتے دیکھا۔ جب وہ شخص جانے لگا تو نبی ﷺ نے اس سے فرمایا کہ اپنی نماز کا اعادہ کرو کیونکہ تنہا پیچھے نماز پڑھنے والے کی نماز نہیں ہوتی ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی ایک دوسری روایت ہے کہ نبی ﷺ سے کسی نے اس شخص کی نماز کے بارے میں دریافت کیا جو جماعت میں سب سے پیچھے نماز پڑھتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسے اپنی نماز کا اعادہ کرنا چاہیے۔

یہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں۔ ان کے علاوہ بھی دوسری صحیح احادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت میں سب سے پیچھے تنہا نماز پڑھنے والے کی نماز صحیح نہیں ہوتی ہے۔ چنانچہ سلفِ صالحین اور احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا یہی مسلک ہے۔ البتہ ان کے علاوہ

تینوں ائمہ یعنی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ اس کی نماز ادا ہو جائے گی مگر کراہت کے ساتھ۔

مذکور احادیث کی روشنی میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ حکمت اور اسلامی تعلیمات کا تقاضا بھی یہی ہے کہ تنہا نماز پڑھنے والے کی نماز قبول نہ ہو کیونکہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے، جو اتحاد کی تعلیم دیتا ہے' جماعت کی رغبت دیتا ہے۔ جماعت سے کٹ کر رہنا اور شذوذ کا راستہ اختیار کرنا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ جماعت کے ساتھ نماز کی ادائیگی دراصل مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق سکھانے کی عملی تربیت ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص اتحاد و جماعت کا راستہ چھوڑ کر شذوذ و انفرادیت کا راستہ اختیار کرے گا تو اس کا یہ عمل اسلامی تعلیمات کے عین خلاف ہے اور اس لئے قرینِ قیاس یہی ہے کہ اس کی نماز قبول نہیں ہوگی۔

بہر حال یہ حکم اس حال میں ہے جب کوئی شخص بے عذر اور بغیر کسی سبب کے جماعت میں سب سے پیچھے تنہا نماز ادا کرے۔ البتہ اگر کسی عذر کی بنا پر ایسا کرتا ہے مثلاً یہ کہ صف مکمل ہو چکی ہو اور کوئی جگہ نہ ہو اور مجبوراً پیچھے تنہا ہی نماز ادا کرتا ہے، تو اس صورت میں اس کی نماز صحیح ہوگی۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں یہ بہتر ہوگا کہ وہ اگلی صف سے کسی شخص کو کھینچ کر پیچھے اپنے برابر میں کر لے تاکہ اس صف میں ایک کے بجائے دو ہو جائیں۔ مگر بعض علماء یہ بھی کہتے ہیں کہ اس طرح اگلی صف سے کسی نمازی کو کھینچ کر پیچھے کرنا اس پر ظلم کرنا ہے اور اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔

حواشی وحوالہ جات

(۱) مسلم شریف۔ مُسند احمد۔ ابوداؤد اور ترمذی کی روایت ہے۔

(۲) الفواکہ العدیدہ فی المسائل المفیدۃ۔ ج ۲۔ص۔ ۱۸۱

(۳) مجمع الزوائد۔ ج ۲۔ص ۲۱۰

(۴) سنن ترمذی۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

(۵) مسلم کی روایت ہے۔

(۶) ترمذی

(۷) بخاری کی روایت ہے۔

☆☆☆☆☆

پانچواں باب

زکوٰۃ اور صدقات

کن تجارتوں میں زکوٰۃ واجب ہے؟

سوال: اس زمانے میں رأس المال یعنی اصل پونجی جسے ہم تجارت میں لگاتے ہیں اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً:

۱۔ بعض اصل پونجی متحرّک شکل میں ہوتی ہے مثلاً کاریں، کل پرزے اور ہر وہ تجارتی چیز جو فروخت کی خاطر دکانوں میں رکھی جاتی ہے مثلاً کپڑے اور کھانے کی چیزیں وغیرہ۔

۲۔ بعض پونجی اس نوعیت کی ہوتی ہے کہ وہ اپنی جگہ ثابت ہوتی ہے مثلاً آفس، کمپیوٹر اور آفس میں ڈیکوریشن یا ضرورت کی خاطر استعمال کیے جانے والے فرنیچر۔

۳۔ بعض پونجی جائیداد کی صورت میں ہوتی ہے مثلاً عمارت اور زمین۔

۴۔ بعض پونجی قرضوں کی صورت میں ہوتی ہے اور قرضے بھی مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ بعض کی واپسی ممکن ہوتی ہے خواہ تاخیر سے ہو اور بعض کی واپسی تقریباً ناممکن ہوتی ہے۔

یہ ہیں تجارت میں لگائی گئی پونجی کی چند صورتیں۔ اس دور میں تجارت میں اس قدر تنوّع اور توسّع آ چکا ہے کہ زکوٰۃ نکالنے والے بعض دفعہ حیران و پریشان ہو جاتے ہیں کہ کس مال میں زکوٰۃ نکالی جائے اور کس میں سے نہیں؟ آپ سے تشفی بخش جواب مطلوب ہے۔

جواب: آپ نے جس طرح ترتیب وار صورتوں کا تذکرہ کیا ہے، میں بھی اسی ترتیب سے جواب دیتا ہوں:

۱- پہلی صورت یعنی وہ اصل پونجی جو متحرّک شکل میں ہوتی ہے۔ مثلاً کاریں جو فروخت کی خاطر ہوتی ہیں یا کپڑے اور جوتے وغیرہ جو دکانوں میں فروخت کی خاطر رکھے جاتے ہیں تو فقہ کی اصطلاح میں انہیں ''عُروض التجّارۃ'' کہتے ہیں۔ یعنی وہ تجارتی اشیاء جنہیں فروخت کرکے ان سے نفع کمانا مقصود ہو۔ چونکہ عُروض التجّارۃ سے نفع کمانا مقصود ہوتا ہے اس لئے اس میں زکوٰۃ فرض ہے۔

۲- اسی طرح وہ چیزیں جو متحرّک نہیں' بلکہ ثابت صورت میں ہوتی ہیں مثلاً آفس، آفس کا فرنیچر اور کمپیوٹر، ٹائپ رائٹر وغیرہ تو انہیں عُروض التجّارۃ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ یہ وہ مالِ تجارت نہیں جن سے نفع کمانا مقصود ہوتا ہے۔ بلکہ نفع کمانے کے لئے انہیں استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ فقہاء کا قول ہے: ''وہ برتن، فرنیچر اور الماریاں وغیرہ جن میں تجارتی اشیاء رکھی جاتی ہیں یا جنہیں تجارت میں استعمال کیا جاتا ہے مثلاً ترازو وغیرہ تو زکوٰۃ کی خاطر ان کی قیمت نہیں لگائی جانی چاہئے اور نہ ان پر زکوٰۃ فرض ہے۔''(۱)

۳- جائیداد اگر تجارتی نقطۂ نظر سے خریدی جائے اور اسے فروخت کرکے اس سے فائدہ کمانا مقصود ہو تو اس جائیداد کی قیمت لگا کر اس پر زکوٰۃ نکالنا واجب ہے۔ البتہ اگر زمین خرید کر اس پر کرایہ کی خاطر گھر یا دکان بنائی جائے تو اس زمین پر نہیں' بلکہ اس کے کرایہ پر زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

البتہ اس بات میں اختلاف ہے کہ اس صورت میں زکوٰۃ کی شرح کیا ہوگی؟ ڈھائی فیصد زکوٰۃ ادا کی جائے گی جیسا کہ عُروض التجّارۃ میں ہے یا پانچ فیصد یا دس فیصد جیسا کہ کھیتی کی زمین میں غلے پر زکوٰۃ ادا کی جاتی ہے۔

۴- رہے قرضے تو ان میں سے وہ قرضے جن کی واپسی ناممکن ہو ان پر زکوٰۃ فرض نہیں۔ البتہ اگر کسی زمانے میں واپس ہو جائیں' تو ان پر ایک سال کی زکوٰۃ فرض ہے۔

البتہ وہ قرض جن کی واپسی عین ممکن ہو تو انہیں اپنی ملکیت تصور کر کے ان پر زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

تجارت کی ایک صورت اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی کمپنی کی ایجنسی لے لی جائے اور اپنی ایجنسی میں کمپنی کا سامان فروخت کی خاطر رکھا جائے۔ اس سامان کا حکم یہ ہے کہ اس کی حیثیت امانت کی سی ہوتی ہے۔ یہ سامان کمپنیوں کی طرف سے بطورِ امانت ایجنسیوں میں رکھے جاتے ہیں۔ اس لئے ان پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔

کیا مال گودام اور شوروم پر زکوٰۃ ہے؟

سوال: ایک تاجر ہے جو امپورٹ کا کام کرتا ہے۔ اس نے اپنے مالِ تجارت کی حفاظت کی خاطر ایک گودام اور انہیں فروخت کرنے کی خاطر ایک شوروم بنایا ہے۔ تو کیا اس گودام اور شوروم پر زکوٰۃ فرض ہوگی؟

جواب: فقہاء کے نزدیک زکوٰۃ ان چیزوں پر ہے جو فروخت کرنے کے لئے رکھی جاتی ہیں، جنہیں فقہ کی اصطلاح میں عُروض التّجارۃ کہتے ہیں۔ وہ فرنیچر، مال گودام یا شوروم وغیرہ جن میں عُروض التجّارۃ کو رکھا جاتا ہے ان پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ کیونکہ فی الواقعہ یہ فرنیچر گودام یا شوروم وغیرہ فروخت کی خاطر نہیں ہوتے بلکہ ان کے اندر رکھا ہوا سامان فروخت کی خاطر ہوتا ہے۔

زکوٰۃ سے متعلق متفرق سوالات

سوال: کسی شخص نے کوئی عمارت فروخت کرنے کی خاطر بنوائی، لیکن اس کی شومیِ قسمت کہ بننے کے برسوں بعد بھی وہ فروخت نہ ہو سکی۔ تو کیا اب اس کے لئے جائز ہے کہ فروخت کرنے کی نیّت تبدیل کر کے اسے کرایے پر اٹھا دے؟ ایسی صورت میں اس کی زکوٰۃ کس طرح ادا کی جائے گی۔ کیونکہ پہلے تو یہ عمارت فروخت کی خاطر بنائی گئی تھی لیکن اب کرایے پر اٹھا دی گئی ہے؟

جواب: جب تک اس کی نیت یہ تھی کہ اسے عمارت فروخت کرنی ہے، اس وقت تک اس عمارت کو عُروض التجّارۃ سمجھ کر اسے اس کی قیمت کا اندازہ کرکے اس پر زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ لیکن جب اس نے اپنی نیت تبدیل کرلی اس وقت سے زکوٰۃ اس عمارت کی قیمت پر نہیں، بلکہ اس کے کرایے پر ادا کرنی ہوگی۔

رہا یہ مسئلہ کہ وہ اپنی نیت تبدیل کرسکتا ہے یا کہ نہیں؟ تو یہ اس کا شرعی حق ہے کہ ضرورت پڑنے پر جب چاہے اپنی نیت تبدیل کرسکتا ہے۔

سوال: بعض لوگ لیز پر یعنی پٹے پر حکومت سے زمین حاصل کرتے ہیں، پھر تجارت کی غرض سے اس زمین پر آفس یا گودام وغیرہ بنالیتے ہیں۔ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ لیز کی مدّت ختم ہونے کے بعد وہ زمین حکومت کو واپس کرنی پڑتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اتنی ہی یا اس سے کم مدّت کے لئے دوبارہ زمین لیز پر مل جاتی ہے۔ کیا اس زمین پر زکوٰۃ واجب ہے؟

جواب: لیز پر حاصل کی ہوئی زمین پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ کیونکہ یہ زمین دراصل حکومت کی ملکیت ہے نہ کہ زمین حاصل کرنے والے کی۔ اور زکوٰۃ اس چیز پر ادا کی جاتی ہے جو اپنی ملکیت میں ہو۔ رہی عمارت یا آفس جو اس زمین پر بنائی جاتی ہے تو اس پر بھی زکوٰۃ نہیں ہے، کیوں کہ آفس یا عمارت عُروض التجّارۃ نہیں ہے جیسا کہ اس سے قبل میں نے ذکر کیا ہے۔ زکوٰۃ اس مالِ تجارت پر ادا کی جائے گی جو اس آفس یا عمارت میں فروخت کرنے کی غرض سے رکھا جاتا ہے۔

سوال: روپے کی زکوٰۃ کا حساب سونے سے لگایا جائے گا یا چاندی سے؟

جواب: بہتر اور قرینِ قیاس یہی ہے کہ اس دور میں روپے پیسے کی زکوٰۃ کا حساب سونے سے لگایا جائے نہ کہ چاندی سے۔ کیونکہ جب نبی ﷺ نے زکوٰۃ کا نصاب سونے اور چاندی دونوں سے مقرر کیا تھا تو ان کا یہ مقصد ہرگز نہ تھا کہ دو نصاب مقرر کیے جائیں۔ ایک سونے کا اور دوسرا چاندی کا۔ بلکہ حقیقتاً وہ ایک ہی نصاب تھا، چاہے وہ

سونے کا ہو یا چاندی کا۔ نبی ﷺ نے سونے کا نصاب بیس دینار اور چاندی کا نصاب دو سو درہم مقرر کیا تھا۔ اس زمانے میں ایک دینار دس درہم کے برابر ہوا کرتا تھا۔ گویا بیس دینار اور دو سو درہم قیمت میں مساوی تھے۔ اس کے بعد سونے کے مقابلے میں چاندی کی قیمت مسلسل گرتی گئی اور آج یہ حالت ہے کہ سونے اور چاندی کی قیمتوں کے درمیان زمین وآسمان کا فرق ہے۔

اسلام میں زکوٰۃ امیروں پر فرض کی گئی ہے' تاکہ ان کا کچھ مال فقیروں کی طرف لوٹایا جائے۔ اس دور میں چاندی کی قیمت اس قدر گر گئی ہے کہ دو سو درہم کے برابر چاندی رکھنے والوں کو ہم امیر نہیں کہہ سکتے کیونکہ دو سو درہم کے برابر کی چاندی زیادہ سے زیادہ چار پانچ سو روپے کے برابر ہوگی۔ چار پانچ سو روپے کی ملکیت کسی شمار میں نہیں ہے۔ اس کے برخلاف بیس دینار کے برابر سونا تقریباً ساڑھے سات تولہ ہوتا ہے (یا پچاس گرام اور ساڑھے سات سولہ سونے کی قیمت تیس ہزار روپے سے زیادہ ہوتی ہے۔)

ایک نظر ہم اگر روپے پیسوں کے علاوہ دوسری ان چیزوں پر ڈالیں جن پر زکوٰۃ واجب ہے مثلاً اونٹ، بکری وغیرہ تو ہمارا دل اسی بات پر مطمئن ہوگا کہ سونے ہی کو روپے پیسے کا نصاب مقرر کرنا چاہئے۔ کیونکہ اونٹ اور بکری وغیرہ کی جو تعداد نصابِ زکوٰۃ کے لئے مقرر کی گئی ہے' اس کی قیمت ساڑھے سات تولہ سونے کے آس پاس تو ہو سکتی ہے' لیکن دو سو درہم چاندی کے آس پاس ہرگز نہیں ہوسکتی۔

سوال: میرے پاس چند قطعہ اراضی ہیں جنہیں میں نے ایک مدّت قبل خریدا تھا۔ اگر اس پر زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے تو کیا اس قیمت کے لحاظ سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی، جس قیمت پر میں نے اس زمین کو برسوں قبل خریدا تھا، یا ہر سال زکوٰۃ کی ادائی کے وقت اس کی حالیہ قیمت کے لحاظ سے؟ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ہر سال زمین کی قیمت نکالنا ایک مسئلہ ہے۔

جواب: زکوٰۃ کی ادائی کے اعتبار سے زمین کی دو قسمیں ہیں:

۱- ایک زمین وہ ہوتی ہے جسے انسان صرف اس نیت سے خریدتا ہے کہ کچھ مدت گزرنے کے بعد، جب اس کی قیمت میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا، تو اسے فروخت کر کے کچھ فائدہ کمالے۔ ایسی صورت میں زمین کی حیثیت عُروض التجارۃ (مالِ تجارت) کی سی ہے۔ چنانچہ جس طرح مالِ تجارت کی قیمت کا اندازہ کر کے اس کی زکوٰۃ نکالی جاتی ہے، اسی طرح اس زمین کی قیمت کا اندازہ کر کے اس پر ڈھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ قیمت کا اندازہ ہر سال لگایا جائے گا کیوں کہ ہر سال اس کی قیمت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ جب اس کی قیمت میں اضافہ ہو رہا ہے تو بے شبہ اس کی زکوٰۃ کی مقدار میں بھی اضافہ ہونا چاہئے۔ یہی جمہور علماء وفقہاء کا قول ہے۔ البتہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ زمین کی قیمت کا اندازہ صرف ایک بار لگایا جائے اور اس کی زکوٰۃ بھی صرف ایک بار ادا کی جائے گی یعنی اسے فروخت کرتے وقت۔ فروخت کرتے وقت اس زمین کی جو قیمت ملتی ہے اس میں سے ڈھائی فیصد زکوٰۃ کی مد میں نکال دیا جائے گا۔ بہر حال جمہور علماء کا قول زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ جس زمین کو آپ نے اس سال دس ہزار میں خریدا ہے، دو سال کے بعد آپ اسے پچاس ہزار میں فروخت کرتے ہیں، تو کیا آپ کا ضمیر گوارا کرے گا کہ زکوٰۃ صرف دس ہزار پر نکالیں؟ بعض حالتوں میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک پر بھی عمل کیا جا سکتا ہے مثلاً ایسی حالت میں کہ زمین کی قیمت بہت گر گئی ہو۔ آپ نے اسے دس ہزار میں خریدا اور کئی سال گزرنے کے باوجود اس کی قیمت دس ہزار سے بھی کم ہو۔ ایسی صورت میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک پر عمل کیا جا سکتا ہے۔

۲- دوسری زمین وہ ہوتی ہے جسے فروخت کرنے کے لئے نہیں، بلکہ اس پر کرائے کی خاطر دکان یا مکان بنانے کے لئے خریدتے ہیں۔ ایسی زمین پر کوئی زکوٰۃ نہیں ہے۔ البتہ تعمیر کا کام مکمل ہو جانے کے بعد جو کرایہ اس دکان یا مکان سے آئے گا اس پر زکوٰۃ ادا

کرنا واجب ہوگا۔

سوال: میرا ایک دوست ہے، جسے میں نے بطورِ قرض تین سو دینار دیئے تھے۔ اس وقت وہ طالب علم تھا۔ اب وہ فراغت حاصل کر چکا ہے' لیکن اب تک اسے کوئی نوکری نہیں ملی ہے۔ اس کی مالی پوزیشن خراب دیکھتے ہوئے میں نے اس رقم پر جو زکوٰۃ واجب ہوتی ہے وہ اسے دے دی۔ کیا میرا یہ عمل درست ہے؟ اور کیا میں اس رقم کی زکوٰۃ نکالتا رہوں جو بہ دستور میرے دوست پر قرض ہے؟

جواب: قرض کی واپسی اگر کسی بھی مرحلے میں ممکن ہے' یعنی جس کے بارے میں یہ خیال ہو کہ وہ کبھی نہ کبھی واپس مل جائے گا' تو اس پر جمہور فقہاء کے نزدیک ہر سال زکوٰۃ واجب ہے۔ بعض فقہاء کے نزدیک اس کی زکوٰۃ اسی وقت واجب ہوتی ہے جب وہ واپس مل جائے۔ لیکن اگر قرض کی واپسی ناممکن ہو تو ایسی صورت میں اس پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ البتہ ناممکن ہونے کے باوجود وہ رقم کسی مرحلے میں واپس مل جائے تو اس پر صرف ایک سال کی زکوٰۃ واجب ہے۔

آپ نے اپنے دوست کی خراب مالی پوزیشن کے پیشِ نظر اس رقم کی زکوٰۃ اسے دے دی' یہ بالکل جائز ہے۔ کیوں کہ آپ کا دوست مسکین کے زمرے میں شمار کیا جائے گا یا اپنے گھر والوں سے دور ہے تو مسافر شمار کیا جائے گا۔ یونی ورسٹی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد اسے زکوٰۃ کی رقم دی جا سکتی ہے۔ کیوں کہ محض ڈگری نہ اس کا پیٹ بھر سکتی ہے اور نہ تن ڈھانپ سکتی ہے۔ بلکہ یہ بھی جائز ہے کہ آپ یہ قرض معاف کر دیں اور اس رقم کو آپ زکوٰۃ شمار کر لیں' جیسا کہ بعض فقہاء کا قول ہے۔

سوال: کوئی شخص اپنے وطن سے دور کسی دوسری جگہ مقیم ہے تو کیا اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے وطن کے بجائے اس شہر میں زکوٰۃ نکالے جس میں وہ مقیم ہے؟

جواب: اصول تو یہ ہے کہ مال کی زکوٰۃ وہاں نکالی جائے جہاں مال موجود ہو اور زکوٰۃ الفطر وہاں نکالی جائے جہاں وہ شخص مقیم ہے۔ تاہم ضرورت کے پیشِ نظر اس

اصول کی پابندی کوئی بہت ضروری بھی نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی فلسطینی شخص کسی خلیجی ملک میں نوکری کر رہا ہے اور اس کے اعزّا و اقارب اس سے دور کسی فلسطینی کیمپ میں غربت و افلاس کی زندگی گزار رہے ہیں تو ایسی صورت میں بہتر یہ ہے کہ وہ زکوٰۃ کی رقم اس شہر میں نکالنے کے بجائے فلسطینی کیمپ میں مقیم اپنے اعزا و اقارب کو ارسال کر دے۔

سوال: کیا بیوی یا دوسرے وہ رشتہ دار جن کا نان و نفقہ اس پر واجب ہے' ان کو زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے؟

جواب: فقہاء کا اتفاق ہے کہ بیوی کو زکوٰۃ کی رقم نہیں دی جاسکتی۔ کیونکہ بیوی در اصل شوہر کا ایک حصہ اور جزو ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا (الروم:۲۱)

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تم ہی سے بیویاں بنائیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ بیوی در اصل شوہر کا ایک جزو ہے۔ اس لئے بیوی کو زکوٰۃ دینا گویا اپنے آپ کو زکوٰۃ دینا ہے اور اپنے آپ کو زکوٰۃ دینا کسی طور جائز نہیں۔ اسی لئے بیوی کو زکوٰۃ دینا بھی کسی طور جائز نہیں۔

اسی طرح اپنی اولاد کو بھی زکوٰۃ کی رقم دینا جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ اولاد بھی ماں باپ کا جزو ہوتی ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

اَوْلَادُكُمْ مِنْ كَسْبِكُمْ۔

تمہاری اولاد تمہاری اپنی کمائی ہے۔

اسی طرح اپنے والدین کو بھی زکوٰۃ کی رقم دینا جائز نہیں' کیوں کہ ہر شخص اپنے والدین کا جزو ہوتا ہے۔ البتہ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ والدین اگر فقیر ہیں تو ان کو زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے۔ میرے نزدیک بھی ایسی صورت میں والدین کو زکوٰۃ کی رقم دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

البتہ بھائی بہن اگر غریب ہوں تو ان کو زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ میرے نزدیک زیادہ بہتر رائے یہ ہے کہ بھائی بہن اگر غریب ہوں تو انہیں زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے' کیوں کہ غریب بھائی بہن بھی ان فقراء ومساکین میں شمار کیے جاتے ہیں جن کا تذکرہ زکوٰۃ والی آیت میں ہے۔

ایسے دوسرے رشتہ دار مثلاً خالہ، پھوپھی، خالہ زاد بھائی بہن اور ماموں وغیرہ' تو فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ان کو زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے۔

بھائی بہن اگر امیر ہوں تو انہیں زکوٰۃ کی رقم نہیں دی جاسکتی۔ اسی طرح جس طرح کسی بھی دوسرے مالدار کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔ کیونکہ حدیثِ نبوی ﷺ ہے:

لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ وَلَا لِذِی مرة سَوِيٍّ.

کسی مالدار کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں اور نہ کسی صحت مند انسان کو ہی۔

دوسری حدیث ہے:

اِنَّهَا تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَآءِ هِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَاءِ هِمْ.

زکوٰۃ مال داروں سے لی جاتی ہے اور غریبوں کی طرف لوٹا دی جاتی ہے۔

زکوٰۃ والی آیت میں فی سبیل اللہ سے مراد

سوال: بعض ہم عصر علماء کا خیال ہے کہ زکوٰۃ کی رقم ان بھلائی کے کاموں میں بھی دی جاسکتی ہے جنہیں چند افراد یا سوسائٹی والے انجام دیتے ہیں مثلاً مسجدیں بنوانا یا ہسپتال اور مدرسے بنوانا یا یتیموں کا ٹرسٹ قائم کرنا وغیرہ۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ زکوٰۃ والی آیت میں ''فی سبیل اللہ'' سے مراد ہر وہ نیک اور بھلائی کا کام ہے جو اللہ کی راہ میں کیا جائے۔ حالانکہ جمہور مفسّرین اور سلفِ صالحین کے نزدیک ''فی سبیل اللہ'' سے مراد جہاد ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ فی سبیل اللہ سے مراد صرف جہاد ہے یا پھر اسے عام کرکے اس سے مراد ہر نیک اور بھلا کام ہے جو اللہ کی خوشنودی کے لئے انجام دیا جائے۔

جواب: بے شبہ بعض علماء کے نزدیک فی سبیل اللہ سے مراد وہ تمام بھلائی کے کام ہیں جو اللہ کی راہ میں اللہ کی خوشنودی کے لئے انجام دیئے جائیں' مثلاً مسجدیں یا ہسپتال بنوانا وغیرہ۔ لیکن میرے نزدیک فی سبیل اللہ کو عام معنوں پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے۔ کیوں کہ اس طرح ''فی سبیل اللہ'' کے تحت زکوٰۃ کے مستحقین کی اتنی قسمیں ہو جائیں گی کہ شمار کرنا مشکل ہوگا۔ اس طرح زکوٰۃ والی آیت میں زکوٰۃ کے مستحقین کو آٹھ قسموں تک محدود رکھنے کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ مزید برآں اگر فی سبیل اللہ کو عام معنی پر محمول کیا جائے تو اس سے مراد فقراء و مساکین بھی ہوں گے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ والی آیت میں ان کا تذکرہ علیحدہ کیا ہے۔ پھر انہیں علیحدہ تذکرہ کرنے کا کیا فائدہ؟ اللہ کا کلام بلاغت کے اعلیٰ معیار پر ہے اور یہ بات فصاحت و بلاغت کے خلاف ہے کہ بے مقصد و فائدہ کسی چیز کی تکرار ہو۔ پس یہ معلوم ہوا کہ یہ تکرار بے مقصد نہیں ہے۔ بلکہ درحقیقت ''فی سبیل اللہ'' کا علیحدہ اور خاص مفہوم ہے۔ سلفِ صالحین اور جمہور مفسرین نے اس سے مراد 'جہاد' لیا ہے۔ دلیل کے طور پر انہوں نے احادیث اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال میں سے مثالیں پیش کی ہیں۔ مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہے:

لَغَدْوَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ رَوْحَةٌ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا۔

(بخاری و مسلم)

اللہ کی راہ میں صبح یا شام نکلنا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔

اس حدیث میں فی سبیل اللہ سے مراد 'جہاد' ہے:

صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک صحت مند نوجوان کو دیکھا تو فرمانے لگے:

لَوْ كَانَ شَبَابُهٗ وَجَلَدُهٗ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (طبرانی)

کاش اس کی جوانی اور تنومندی اللہ کی راہ میں ہوتی۔

ان کا مقصد یہ تھا کہ کاش اس کی جوانی جہاد کے موقعے پر کام آتی۔

اس سلسلے میں میری رائے یہ ہے کہ ''فی سبیل اللہ'' کو نہ صرف قتال پر محمول کیا

جائے اور نہ اسے عام کر کے ہر اس کام پر محمول کیا جائے جو اللہ کی راہ میں اللہ کی خوشنودی کے لئے ہو۔

بے شبہ ''فی سبیل اللہ'' سے مراد اللہ کی راہ میں 'جہاد' ہے، لیکن جہاد کا مفہوم صرف جنگ کرنا نہیں ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر اس سے وسیع تر مفہوم اس میں شامل ہے۔ یعنی ہر وہ قدم جو اللہ کے دین کی نصرت اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے اٹھے۔ جہاد صرف تلوار اور توپ سے نہیں ہوتا' بلکہ کبھی قلم سے ہوتا ہے اور کبھی زبان سے۔ کبھی اقتصادی جہاد ہوتا ہے اور کبھی سیاسی۔ ان میں سے ہر جہاد میں مالی تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر وہ کوشش اور قدم جو اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے اٹھے' اسے فی سبیل اللہ کے مفہوم میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

کبھی وہ زمانہ بھی تھا جب توپ اور تلوار سے جنگ کر کے اسلام اور مسلمانوں کو غلبہ نصیب ہوا اور آج وہ زمانہ ہے جب فکری اور لسانی جنگ زیادہ موثر اور نتیجہ خیز ہوتی ہے اور اسی کے ذریعے بڑے بڑے معرکے سر کئے جاتے ہیں۔ جہاد کے اس وسیع تر مفہوم کو ثابت کرنے کے لئے میں چند دلیلیں پیش کرتا ہوں:

۱۔ نبی ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کون سا جہاد سب سے افضل ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا:

كَلِمَةُ الْحَقِّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ۔ (مسند احمد و نسائی)

کسی ظالم و جابر بادشاہ کے سامنے حق بات کہنا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جہاد کی ایک شکل لسانی جہاد بھی ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:

جَاهِدُوا الْمُشْرِكِينَ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ وَأَلْسِنَتِكُمْ۔

(مسند احمد، ابو داؤد، حاکم)

مشرکوں سے جہاد کرو اپنے مال کے ذریعے، اپنی جان کے ذریعے اور اپنی

زبانوں کے ذریعے۔

معلوم ہوا کہ جہاد فقط تلوار کی جنگ کا نام نہیں ہے، بلکہ بسا اوقات اور حسبِ ضرورت مال کے ذریعے بھی جہاد ہوتا ہے۔ جہاد میں کبھی جسمانی قوت کا استعمال ہوتا ہے اور کبھی لسانی قوت کی ضرورت پیش آتی ہے۔

۲- لفظِ جہاد کو وسیع تر مفہوم پر محمول کرنے کے لئے اگر کوئی قطعی نص نہ بھی ہو تب بھی محض قیاس کی بنا پر ایسا کیا جا سکتا ہے، کیونکہ جہاد چاہے تلوار سے ہو چاہے قلم اور چاہے زبان سے، ان میں سے ہر جہاد کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے یعنی اعلاء کلمۃ اللہ۔

یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ حالات اور ماحول کی مناسبت سے بعض کاموں کو ایک ملک میں جہاد تصوّر کیا جائے گا اور وہی کام بعض دوسرے ملکوں میں محض ایک رفاہی کام قرار پائے گا۔ مثلاً ایک ایسے ملک میں جہاں اسلام کا غلبہ ہے، مسلمانوں کی اکثریت ہے اور لوگ دینی تعلیم سے آگاہ ہیں وہاں کسی مدرسے یا مسجد کی تعمیر ایک رفاہی کام تو ہو سکتا ہے مگر جہاد نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس کسی غیر مسلم ملک میں جہاں مسلمانوں کی اقلیت ہو، اشاعتِ اسلام کی خاطر مسجد یا مدرسے تعمیر کرنا یقیناً جہاد ہے۔ عیسائی مشنریوں کی مثال واضح ہے۔ انہوں نے چرچ، ہسپتال اور سکول کی تعمیر کی آڑ لے کر عیسائیت کی جس قدر تبلیغ کی ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

درحقیقت اس دور میں جہاد فی سبیل اللہ کی سب سے عظیم صورت یہ ہے کہ مسلم ممالک جو کفار و مشرکین کے قبضے میں چلے گئے ہیں، انہیں بہ زورِ قوت واپس حاصل کیا جائے۔ کفار و مشرکین چاہے عیسائی ہوں یا یہودی ہوں یا کمیونسٹ۔ ان میں سے کوئی بھی اگر مسلم ممالک پر غاصبانہ قبضہ کر لیتا ہے تو اس وقت تک جہاد کی تمام صورتیں بروئے کار لائی جائیں گی جب تک یہ علاقے مسلمانوں کو واپس نہیں مل جاتے۔ مثال کے طور پر فلسطین کا نام لیا جا سکتا ہے، جس پر یہودی ظالمانہ طریقے سے قابض ہو گئے ہیں۔ چنانچہ جہاں بھی اس طرح کی جنگ جاری ہو ہمیں بھرپور مالی تعاون کرنا چاہئے۔ ان جگہوں پر

زکوٰۃ کی رقم بھی ارسال کرنی چاہئے۔

البتہ ایک بات یہاں قابلِ ذکر ہے۔ آج اس دور میں دفاعی اخراجات اس قدر زیادہ ہوتے ہیں کہ ان کے لئے علیحدہ بجٹ بنایا جاتا ہے اور یہ بجٹ بھی تمام دوسرے بجٹ سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ بعض ممالک تو ایسے ہیں کہ ملکی خزانے کا پچاس فیصد دفاعی بجٹ کے لئے مخصوص کر دیتے ہیں۔ اس قدر ضخیم بجٹ کے لئے زکوٰۃ کی تھوڑی سی رقم ہرگز کافی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے میری رائے میں زکوٰۃ کی رقم جہاد کی ان صورتوں میں بھیجنا زیادہ بہتر ہے جنہیں لسانی، ثقافتی، فکری اور اعلامی جہاد سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیوں کہ ان صورتوں میں تھوڑی رقم بھی زیادہ نمایاں کام انجام دے سکتی ہے۔ ذیل میں، میں بعض ایسی ہی صورتیں پیش کرتا ہوں:

۱- اسلامی دعوتی مرکز کا قیام، جہاں سے لوگوں تک اسلام کی دعوت پہنچائی جائے۔

۲- خود اسلامی ممالک کے اندر اسلامی ثقافتی مراکز کا قیام جہاں مسلم جوانوں کی عملی تربیت ہو سکے اور انہیں اعلاءِ کلمۃ اللہ کی خاطر تیار کیا جا سکے۔

۳- اسلامی اخبارات و جرائد کا اجرا جو غیر اسلامی صحافتی سرگرمیوں کے لئے چیلنج ہو۔

۴- اسلامی کتب کی نشر و اشاعت، جس میں اسلام کی صحیح تصویر پیش کی جائے اور کفر کی ریشہ دوانیوں کو اجاگر کیا جائے۔

یہ وہ چند صورتیں ہیں جہاں زکوٰۃ کی رقم ارسال کرنی چاہئے، بلکہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی ہر ممکن طریقے سے ان تمام سرگرمیوں میں دل کھول کر مالی تعاون کرنا چاہئے۔

کسی کافر کو زکوٰۃ کی رقم دینا

سوال: کیا کسی کافر یا ملحد کو محض انسانی بنیادوں پر زکوٰۃ کی رقم دی جا سکتی ہے، اگر وہ مالی تعاون کا محتاج ہو؟ یا کسی فاسق مسلمان شخص کو جو نماز روزے سے لاپروا ہو اور حرام

کاموں میں ملوث ہو اسے زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے؟ یا ایسے لوگوں کو زکوٰۃ دینا اللہ کی نافرمانی شمار کی جائے گی؟

جواب: جو شخص سرے سے اللہ، اس کے رسولوں اور یوم آخرت کا منکر ہو تو اسے زکوٰۃ کی رقم دینی جائز نہیں ہے، کیوں کہ وہ اپنے عقیدے کی بنیاد پر اسلام اور مسلمانوں کا دشمن تصوّر کیا جائے گا۔ اسے مالی طور پر مستحکم کرنا، گویا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس کے ہاتھ مضبوط کرنا ہے۔ اسی طرح ہر وہ شخص جو اسلام اور مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہو اور علی الاعلان ان سے دشمنی کی باتیں کرتا ہو اسے بھی زکوٰۃ کی رقم دینا جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ انہیں زکوٰۃ دینا گویا ان سے موالات اور مواخات قائم کرنا ہے اور اللہ نے ہمیں اس سے منع فرمایا ہے۔

البتہ وہ ذِمّی شخص جو مسلم حکومت کی سرپرستی میں ہے، بعض فقہاء کے نزدیک محض تالیف قلب کی خاطر اسے زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے۔ لیکن جمہور فقہاء کا قول ہے کہ زکوٰۃ کی رقم ذِمّی کو بھی نہیں دی جاسکتی کیوں کہ زکوٰۃ ان ذِمّیوں سے وصول نہیں کی جاتی ہے اور جب وصول نہیں کی جاتی تو انہیں دی بھی نہیں جاسکتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ زکوٰۃ مسلمان مالداروں سے لی جاتی ہے اور مسلمان غریبوں کی طرف لوٹا دی جاتی ہے۔ البتہ ان ذِمّیوں کی زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے طریقوں سے مدد کی جاسکتی ہے، اگر وہ مالی تعاون کے محتاج ہوں۔

رہے وہ مسلمان جو فاسق و فاجر ہیں۔ نماز نہیں پڑھتے اور حرام کام کرتے ہیں، تو انہیں زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے۔ بہ شرطے کہ وہ اس رقم کو اللہ کی نافرمانی کے کاموں میں خرچ نہ کریں۔ اگر وہ اس رقم کو گناہوں کے کاموں میں خرچ کریں مثلاً شراب پینے میں یا جوا کھیلنے میں، تو زکوٰۃ کی رقم انہیں ہرگز نہیں دی جائے گی۔

شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے اہلِ بدعت اور اہلِ فسق و فجور کو زکوٰۃ کی رقم دینے کے سلسلے میں سوال کیا گیا تو فرمایا: ہمیں چاہیے کہ ہم ان فقراء و مساکین اور دوسرے

مستحقینِ زکوٰۃ کو تلاش کریں جو اللہ کی شریعت پر قائم ہوں اور نیک مسلمان ہوں۔ رہے وہ لوگ جو فاسق و فاجر ہیں اور اہلِ بدعت ہیں تو وہ سزاؤں کے مستحق ہیں نہ کہ مدد کے۔ وہ شخص جو نماز نہیں پڑھتا ہے، اس سے نماز پڑھنے کے لئے کہا جائے گا۔ اگر اس نے نماز پڑھنا شروع کردی تو اسے زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے ورنہ نہیں۔ (۲)

محترم استاد الشیخ محمد ابوزہرۃ کی رائے ان سے مختلف ہے۔ وہ گنہگاروں کو بھی زکوٰۃ دینے کے حق میں ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے:

۱- زکوٰۃ والی آیت میں فقراء و مساکین کا لفظ عام ہے۔ اس میں اہلِ معصیت اور اہلِ تقویٰ کے درمیان فرق نہیں ہے۔ اگر ہم غیر مسلموں کو تالیف قلب کی خاطر زکوٰۃ کی رقم دے سکتے ہیں تو فاسق مسلمانوں کو بدرجۂ اولیٰ دے سکتے ہیں۔

۲- ہم کسی گنہگار مسلمان کو جو مالی تعاون کا سخت محتاج ہے، محض اس کی معصیت کی بنا پر زکوٰۃ نہیں دیتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس سے زندہ رہنے کا حق چھین رہے ہیں۔ تلوار سے مارنا اور بھوک سے مارنا دونوں میں زیادہ فرق نہیں۔

۳- مشکل وقتوں میں نبی ﷺ مشرکین کی مدد کیا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے بعد ابوسفیان کے پاس پانچ سو دینار بھیجے تھے، کیوں کہ قبیلہ قریش قحط کا شکار ہوگیا تھا۔

۴- اہلِ معصیت کو مالی تعاون نہ دینا بسا اوقات انہیں مزید سرکشی کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ (۳)

میں سمجھتا ہوں کہ استاد محترم محمد ابوزھرہ کی ان دلیلوں پر کلام کیا جاسکتا ہے۔

۱- ان کی پہلی دلیل فقرا و مساکین کا عموم ہے۔ اس عموم کی تخصیص اسلام کے اس قاعدۂ کلیہ سے ہوسکتی ہے جس کے مطابق اصل معصیت کی ہر ممکنہ زجر و توبیخ ہونی چاہئے اور معصیت میں ان کے ساتھ تعاون سے پرہیز کرنا چاہئے۔ چنانچہ اسی زکوٰۃ والی آیت میں لفظ ''الغارمین'' کا بھی استعمال ہے اور وہ بھی بظاہر عام ہے۔ جب کہ تمام فقہاء کا

اتفاق ہے کہ ان قرض خوروں کو زکوٰۃ نہیں دی جائے گی جنہوں نے غلط کاموں کے لئے قرض لیا ہو۔

۲- ہم کہاں کہہ رہے ہیں کہ گنہگاروں کو بھوک سے مرتا چھوڑ دیں۔ زکوٰۃ کے علاوہ دوسری مدّوں سے بھی ان کی مدد کی جاسکتی ہے' بلکہ کرنی چاہئے۔

۳- کفّار و مشرکین کی صلہ رحمی زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے پیسوں سے کی جاسکتی ہے جیسا کہ حضور ﷺ نے کیا۔

درج ذیل صورتوں میں تمام فقہاء کا اتفاق ہے:

۱- اہلِ معصیت کی مدد زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے پیسوں سے کی جاسکتی ہے۔

۲- تالیفِ قلب کی خاطر اہلِ معصیت کو زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے۔

۳- جاں بلب شخص' چاہے وہ اہلِ معصیت ہی کیوں نہ ہو اس کی جان بچانے کے لئے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔

۴- اگر یہ یقین ہو کہ اہلِ معصیت زکوٰۃ کی رقم کو گناہ کے کاموں میں خرچ کرے گا تو اسے زکوٰۃ نہیں دی جائے گی۔

میری رائے یہ ہے کہ اہلِ معصیت دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو گناہ کرتے ہیں لیکن گناہوں پر شرمندہ بھی ہیں اور اسلام سے ان کا رشتہ باقی بھی ہے۔ ان گنہگاروں کو زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے۔ البتہ وہ حضرات جو صرف نام کے مسلمان ہوں اور اسلامی احکام و شعائر کا مذاق اڑاتے ہوں تو انہیں زکوٰۃ کی رقم نہیں دی جاسکتی۔

حواشی وحوالہ جات

(۱) فقہ الزکاۃ: یوسف القرضاوی۔ ج ۱۔ ص ۳۳۵

(۲) فتاویٰ ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ ج۔ ۲۵۔ ص ۸۷

(۳) بحث الشیخ ابوزہرۃ۔ ص ۷۵۔ ۷۶

☆☆☆☆☆
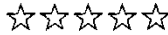
چھٹا باب

روزہ اور صدقۃ الفطر

سحری کا حکم

سوال: سحری کے متعلق ہمیں بتائیں کہ روزے کی مقبولیت کے لئے سحری کھانا ضروری ہے یا نہیں؟

جواب: روزے کی مقبولیت کے لئے سحری کھانا شرط نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک سنت ہے جس پر حضور ﷺ نے خود بھی عمل کیا اور لوگوں کو بھی اس کی تاکید فرمائی ہے۔ حدیث نبوی ہے:

تَسَحَّرُوْا فَإِنَّ فِي السُّحُوْرِ بَرَكَةً۔ (بخاری و مسلم)

سحری کھایا کرو کیوں کہ سحری میں برکت ہے۔

اسی طرح سحری تاخیر سے کھانا بھی سنّت ہے اور افطار میں جلدی کرنا بھی سنّت ہے۔ کیوں کہ اس طرح بھوک اور پیاس کی شدت کچھ کم ہو جاتی ہے اور اس طرح روزے کی مشقت میں بھی قدرے تخفیف ہوتی ہے۔ بے شبہ دینِ اسلام نے عبادتوں میں حتی الامکان تخفیف اور آسانی کو ملحوظ رکھا ہے، تاکہ لوگوں کے دل ان عبادات کی طرف زیادہ سے زیادہ مائل ہوں۔ انہیں آسانیوں میں حضور ﷺ کی یہ تاکید ہے کہ سحری تاخیر سے کھائی جائے اور افطار میں جلدی کی جائے۔ حضور ﷺ کی سنّت کے اتباع میں طلوعِ فجر سے قبل اٹھنا باعثِ ثواب ہے، چاہے ایک کھجور یا ایک گھونٹ پانی ہی سے یہ سنّت ادا کی جائے۔

سحری میں ایک روحانی فائدہ بھی ہے۔ فجر سے قبل اٹھنا۔ ایک ایسی گھڑی میں اٹھنا ہے جب اللہ تعالیٰ بندوں کے بہت قریب ہوتا ہے۔ بندے کا ایسی گھڑی میں اپنے خالق و مالک سے مناجات کرنا' مغفرت کی دعائیں کرنا۔ کیا یہ سب کچھ بستر پر سوتے پڑے رہنے کے برابر ہوسکتا ہے؟ ہم خود تصور کر سکتے ہیں کہ ان دونوں حالتوں میں کس قدر زمین و آسمان کا فرق ہے۔

احتلام کی حالت میں روزہ

سوال: کیا روزے کی حالت میں احتلام سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟

جواب: روزے کی حالت میں احتلام سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ کیونکہ یہ ایک ایسی چیز ہے، جس پر انسان کا بس نہیں اور اللہ تعالیٰ انسان کو کسی ایسے کام کا مکلّف نہیں کرتا، جس پر اس کا بس نہ ہو۔ اسی طرح روزے کی حالت میں غسل کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، چاہے غیر ارادی طور پر پانی اس کے کانوں سے ہوتا ہوا حلق تک پہنچ جائے یا کلی کرتے وقت حلق میں چلا جائے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ (الاحزاب:۵)

اور نادانستہ جو کام تم کرو اس کے لئے تم پر کوئی گرفت نہیں ہے' لیکن اس پر گرفت ضرور ہے، جس کا تم دل سے ارادہ کرو۔

بوڑھے شخص اور حاملہ عورت کے لئے روزے کی رخصت

سوال: کیا کسی بوڑھے شخص کے لئے جائز ہے کہ رمضان کے روزے نہ رکھے؟ اسی طرح اگر حاملہ عورت کو یہ خوف ہو کہ روزے کی وجہ سے اس کا بچہ خطرے میں پڑ سکتا ہے تو کیا وہ روزہ توڑ سکتی ہے؟ کیا روزے کی حالت میں خوشبو کا استعمال جائز ہے؟

جواب: ایسے بوڑھے اور بوڑھیاں جنہیں روزہ رکھنے میں بہت زیادہ تکلیف ہوتی

ہو،ان کے لئے جائز ہے کہ وہ روزے نہ رکھیں۔اسی طرح وہ مریض جس کا مرض مستقل نوعیت کا ہو اور اس کے صحت یاب ہونے کی کوئی امید نہ ہو، اس کے لئے بھی جائز ہے کہ روزہ نہ رکھے بہ شرطے کہ یہ ایک ایسا مرض ہو جس کی وجہ سے روزہ رکھنے میں شدید تکلیف ہوتی ہو یا روزے کی وجہ سے مرض میں اضافے کا خوف ہو۔ان سبھی کے لئے رخصت کی بنیاد قرآن کریم کی یہ آیت ہے:

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُبِكُمُ الْعُسْرَ (البقرۃ:۱۸۵)

اللہ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے سختی کرنا نہیں چاہتا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بوڑھے اور اس جیسے معذور اشخاص کے لئے یہ آیت نازل ہوئی ہے:(۱)

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ط فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ط (البقرہ:۱۸۴)

اور جو لوگ (مسکین کو کھلانے کی) قدرت رکھتے ہوں تو وہ فدیہ دیں۔ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے اور جو اپنی خوشی سے کچھ زیادہ بھلائی کرے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے۔

روزہ معاف ہونے کی صورت میں ان پر واجب ہے کہ وہ ہر ایک روزے کے بدلے میں ایک مسکین کو پیٹ بھر کھانا کھلائیں۔

حاملہ عورت اگر روزے کو اپنے بچے کے لئے خطرہ محسوس کرے تو اس کے لئے بھی روزے معاف ہیں کیوں کہ ایک انسانی جان جو اس کے پیٹ میں ہے، اس کی حفاظت اس پر فرض ہے۔تاہم ان روزوں کے بدلے میں وہ ان روزوں کا قضا کرے گی یا قضا کے ساتھ ساتھ مسکین کو کھانا بھی کھلائے گی یا صرف کھانا ہی کافی ہے؟ اس امر میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔جمہور علماء کا قول ہے کہ وہ صرف روزوں کا قضا کرے گی۔

میری رائے یہ ہے کہ وہ عورت جو بہت تھوڑے وقفے سے حاملہ ہو جاتی ہو،اس پر

قضا واجب نہیں ہے' کیوں کہ عملاً تمام چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا اس کے لئے بہت تکلیف دہ مرحلہ ہوگا۔ اس کے لئے جائز ہے کہ وہ ہر چھوٹے ہوئے روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھلانا کھلائے۔ رہا خوشبو کا استعمال تو تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ روزے کی حالت میں خوشبو کا استعمال جائز ہے۔

آپریشن کی وجہ سے روزے کی رخصت

سوال: مجھے مختلف قسم کے آپریشنوں سے گزرنا پڑا ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے روزہ رکھنے سے منع کیا ہے۔ آپریشن کے دو سال کے بعد میں نے روزہ رکھنا شروع کیا جس کی وجہ سے مجھے کافی تکلیف ہوئی۔ میں ایک ہوش مند انسان ہوں۔ کیا میرے لئے جائز ہے کہ روزہ نہ رکھ کر اس کے بدلے صدقہ کروں؟

جواب: تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ مریض کے لئے روزہ معاف ہے۔ جب وہ اچھا ہو جائے تو چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا اس پر واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

> وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ط (البقرۃ:١٨٥)
>
> اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرے۔

تاہم ہر قسم کے مرض میں اس کی اجازت نہیں ہے۔ کیوں کہ کچھ ایسے مرض ہوتے ہیں جن میں روزہ رکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مثلاً کمر میں یا انگلی میں درد ہو۔ وغیرہ۔ کچھ ایسے مرض ہوتے ہیں کہ روزہ رکھنا مفید ہوتا ہے مثلاً دست اور پیچش کا مرض۔ اس قسم کے امراض میں روزہ توڑنے کی اجازت نہیں ہے۔ بلکہ صرف اس مرض میں اس کی اجازت ہے جس میں روزہ رکھنے سے مرض میں اضافے کا اندیشہ ہو یا روزہ رکھنے سے شدید تکلیف ہوتی ہو۔ ایسی صورت میں روزہ نہ رکھنا ہی افضل ہے۔ اگر ڈاکٹر کے مشورے کے باوجود اور تمام تکلیفوں کو سہتے ہوئے کوئی شخص روزہ رکھتا ہے، تو یہ ایک مکروہ کام ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے آسانی کی صورت فراہم کی ہے۔ اسے

چاہئے کہ اللہ کی اس رخصت کو قبول کرے۔ بالفرض اس تکلیف کی حالت میں روزہ رکھنے سے اسے کسی قسم کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے تو گویا یہ ایک جرم ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝ (النساء:۲۹)

اور اپنے آپ کو مار نہ ڈالو۔ بے شک اللہ تم پر مہربان ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ چھوٹے ہوئے روزوں کے بدلے کیا کرنا چاہئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مرض دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ مرض ہے جو وقتی ہوتا ہے اور کسی نہ کسی مرحلہ میں اس کے دور ہونے کی امید ہوتی ہے۔ اس مرض میں اگر روزے چھوٹے ہوں تو ان کے بدلے صدقہ کرنا کافی نہیں' بلکہ روزوں کی قضا واجب ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا یہی حکم ہے:

فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ (البقرۃ:۱۸۵)

تو دوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرو۔

دوسر وہ مرض ہے جس کے دور ہونے کی تازیست کوئی امید نہیں ہوتی۔ ایسی صورت میں ہر چھوٹے ہوئے روزے کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہوگا۔ بعض فقہاء مثلاً امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ بھی جائز ہے کہ کھانا کھلانے کے بجائے کسی مسکین کی مالی امداد کر دی جائے۔

نماز نہ پڑھنے والے کا روزہ

سوال: کیا نماز نہ پڑھنے والے کا روزہ ہوگا؟ یا تمام عبادتیں ایک دوسری کے ساتھ مربوط ہیں کہ ایک کے نہ ادا کرنے سے دوسری بھی قبول نہیں ہوں گی؟

جواب: ہر مسلمان شخص تمام عبادتوں کا مکلّف ہے۔ ان میں سے کوئی بھی چھوٹ جائے تو اللہ کے نزدیک جواب دہ ہے۔ ایک عبادت ادا نہ کرنے سے دوسری عبادتیں قبول ہوں گی یا نہیں' اس سلسلے میں فقہاء کا اختلاف ہے:

۱-بعض کہتے ہیں کہ اگر کسی نے ایک عبادت بھی ترک کر دی تو وہ کافر ہو گیا اور اس کی کوئی دوسری عبادت بھی مقبول نہ ہوگی۔

۲-بعض کے نزدیک صرف نماز اور زکوٰۃ ترک کرنے والا کافر ہے۔

۳-بعض کے نزدیک صرف نماز ترک کرنے والا کافر ہے' کیوں کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

بَيْنَ الْعَبْدِ وَ بَيْنَ الْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ۔ (مسلم)

بندے اور کفر کے درمیان نماز کا ترک کرنا ہے۔

ان فقہاء کے نزدیک نماز ترک کرنے والے کا روزہ بھی مقبول نہ ہوگا' کیوں کہ وہ کافر ہے اور کافر کی عبادت مقبول نہیں ہوگی۔

۴-بعض فقہاء کہتے ہیں کہ مسلمان جب تک اللہ کی وحدانیت اور رسول ﷺ کی رسالت پر ایمان ویقینِ کامل رکھتا ہے' کسی ایک عبادت کے ترک کر دینے سے وہ کافر شمار نہیں ہوگا بہ شرطے کہ اس عبادت کا نہ وہ مذاق اڑاتا ہو اور نہ منکر ہو۔ اس لئے ایک عبادت ترک کرنے کی وجہ سے اس کی دوسری عبادتیں ہرگز برباد نہیں جائیں گی۔

میرے نزدیک یہی رائے زیادہ قابلِ ترجیح ہے۔ چنانچہ جو شخص صرف سستی اور کاہلی کی بنا پر کوئی ایک عبادت ادا نہیں کرتا ہے اور دوسری تمام عبادتیں ادا کرتا ہے تو دوسری عبادتیں ان شاء اللہ مقبول ہوں گی۔ البتہ وہ ناقص اور ضعیف الایمان کہلائے گا اور جس عبادت میں اس نے کوتاہی کی ہے اس میں وہ گنہگار ہوگا اور اللہ کے نزدیک سزا کا مستحق ہوگا۔ بہر حال کسی ایک نیکی کے ضائع ہونے سے اس کی دوسری نیکیاں برباد نہیں ہوتیں۔ اس نے جو نیکی کی ہوگی اس کا اچھا بدلا پائے گا اور جو برائی کی ہوگی اس کا بُرا بدلا پائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ۝ (الزلزال:۷،۸)

پھر جس نے ذرّہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرّہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔

روزے پر گناہوں کی تاثیر

سوال: اس روزے دار کے لئے کیا حکم ہے جو روزے کی حالت میں غیبت کرتا ہو، جھوٹ بولتا ہو یا کسی غیر محرم عورت کی طرف شہوت کی نظر سے دیکھتا ہو؟

جواب: روزہ وہی نفع بخش اور باعثِ اجر وثواب ہے جو برائیوں سے روکے' نیکیوں پر آمادہ کرے اور نفس میں تقویٰ پیدا کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○ (البقرۃ: ۱۸۳)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم پر روزے فرض کر دیئے گئے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے' اس توقع سے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی۔

روزے دار کے لئے ضروری ہے کہ اپنے روزے کو تمام گناہوں کی آلودگی سے پاک رکھے تاکہ ایسا نہ ہو کہ اس کے نصیب میں صرف بھوک اور پیاس ہی آئے اور روزے کے اجر وثواب سے محروم رہ جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

رُبَّ صَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ صِيَامِهِ اِلَّا الْجُوْعَ۔ (نسائی، ابنِ ماجہ، حاکم)

بعض ایسے روزے دار ہوتے ہیں کہ ان کے روزے میں سے انہیں صرف بھوک ہی نصیب ہوتی ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:

مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِيْ اَنْ يَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ۔ (بخاری، احمد اور اصحاب السنن)

جو شخص جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہیں چھوڑتا تو اللہ کو کوئی ضرورت نہیں

کہ وہ کھانا اور پینا ترک کر دے۔

اسی لئے ابنِ حزم کا قول ہے کہ جھوٹ بولنے، غیبت کرنے اور اس قسم کے دوسرے گناہوں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے' جس طرح کہ کھانے پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلفِ صالحین اپنے روزوں کی حفاظت کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ جس طرح کھانے پینے سے اپنے آپ کو بچاتے تھے' اسی طرح گناہوں کے کاموں سے بھی اپنے آپ کو دور رکھتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

لیس الصیام من الشراب والطعام وحدہ ولکنہ من الکذب والباطل واللغو۔

روزہ صرف کھانے پینے سے رکنے کا نام نہیں ہے' بلکہ جھوٹ، باطل کاموں اور لغویات سے رکنے کا نام بھی ہے۔

میرے نزدیک اَرجح رائے یہ ہے کہ ان لغو کاموں سے روزہ تو نہیں ٹوٹتا البتہ روزے کا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور روزہ دار روزے کے ثواب سے محروم ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ روزہ رکھنا اپنی جگہ ہے اور گناہ کے کام کرنا اپنی جگہ۔ ایک نیکی ہے اور دوسری برائی۔ اور قیامت کے دن ہر شخص اپنی چھوٹی بڑی نیکی اور برائی دونوں کا حساب وکتاب دے گا۔ اس مفہوم کو واضح کرنے کے لئے ذیل کی حدیث پر غور کیجیے:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں (۲) کہ ایک صحابی حضور کے پاس آئے اور عرض کیا کہ میرے پاس کچھ غلام ہیں جو میری بات نہیں مانتے اور میری نافرمانی کرتے ہیں اور میں انہیں گالم گلوچ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔ قیامت کے دن ان کے ساتھ میرا حساب وکتاب کیسا ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا ان غلاموں نے تمہاری جتنی نافرمانی اور خیانت کی ہوگی اور تم نے انہیں جتنی سزا دی ہوگی' ان سب کا حساب کیا جائے گا۔ اگر ان کی نافرمانی کے مقابلے میں تمہاری سزا کم ہوگی تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔ اگر ان کی نافرمانی اور تمہاری سزا برابر ہوگی تو حساب کتاب برابر رہے گا۔ لیکن اگر تمہاری سزا

ان کی نافرمانی کے مقابلے میں زیادہ ہوگی تو اسی حساب سے تمہاری بھلائی ان غلاموں کو دے دی جائے گی۔ یہ سن کر وہ صحابی رضی اللہ عنہ رونے لگے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن کی اس آیت کو پڑھو:

وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ؕ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ○ (الانبیاء:۴۸)

قیامت کے روز ہم ٹھیک تولنے والے ترازو رکھ دیں گے پھر کسی شخص پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ جس کا رائی کے دانے برابر بھی کچھ کیا دھرا ہوگا وہ ہم سامنے لے آئیں گے اور حساب لگانے کے لئے ہم کافی ہیں۔

یہ سن کر صحابی رضی اللہ عنہ نے تمام غلام آزاد کردیئے۔

فجر کی اذان سن کر بھی سحری کھاتے رہنا

سوال: کسی مجبوری کی بنا پر اگر کوئی شخص تاخیر سے سحری کھا رہا ہو اور اسی دوران فجر کی اذان ہو جائے تو کیا اذان سنتے ہی کھانے سے ہاتھ اٹھا لینا چاہئے یا اذان کے ختم ہونے تک وہ کھا پی سکتا ہے؟

جواب: اگر اسے اس بات کا یقین ہو کہ اذان بالکل صحیح وقت پر ہو رہی ہے تو اذان سنتے ہی اسے سحری کھانا چھوڑ دینا چاہئے۔ حتیٰ کہ اگر اس کے منہ میں نوالہ ہے تو اسے چاہئے کہ اسے اگل دے تا کہ یقینی طور پر اس کا روزہ صحیح ہو۔ تاہم اگر اسے یقین ہو یا کم از کم شک ہو کہ اذان وقت سے قبل ہو رہی ہے تو اذان سن کر کھانے کا عمل جاری رکھ سکتا ہے۔ اس بات کے یقین کے لئے کہ اذان بالکل صحیح وقت پر ہو رہی ہے مختلف چیزوں سے مدد لی جاسکتی ہے۔ مثلاً کیلنڈر یا گھڑی یا اس قسم کی دوسری چیزیں جو آج کل بآسانی دستیاب ہیں۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے کسی نے سوال کیا کہ سحری کھانے کے دوران اگر شک

ہو کہ فجر کا وقت ہو گیا تو کیا میں سحری کھانا چھوڑ دوں؟ آپ ﷺ نے جواب دیا کہ جب تک شک ہو' کھاتے رہو۔ جب فجر کا یقین ہو جائے تو کھانا چھوڑ دو۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک بھی یہی ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ شوافع نے شک کی حالت میں کھاتے رہنے کا جواز درج ذیل قرآنی آیت سے اخذ کیا ہے:

وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۝ (البقرۃ:۱۸۷)

اور راتوں کو کھاؤ پیو حتیٰ کہ تم کو سیاہیٔ شب کی دھاری سے سپیدۂ صبح کی دھاری نمایاں نظر آ جائے۔

اس آیت میں یقین کا لفظ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جب یقینی طور پر کچھ واضح ہو جائے۔ یعنی جب شک کی کیفیت نہ ہو' بلکہ یقین ہو کہ فجر کا وقت آ گیا ہے۔

صدقۃ الفطر کہاں دیں؟

سوال: میرا سوال صدقۃ الفطر سے متعلق ہے۔ اگر کسی نے دو تہائی رمضان کے روزے کسی اور شہر میں رکھے ہوں اور عید سے ذرا قبل کسی دوسرے شہر میں منتقل ہو گیا ہو اور وہیں عید منائی ہو تو اسے کس شہر میں صدقۃ الفطر نکالنا چاہئے؟

جواب: صدقۃ الفطر اس شہر میں دینا چاہئے جہاں عید کی چاند رات گزری ہو۔ کیوں کہ اس صدقے کا سبب رمضان کے روزے نہیں' بلکہ روزوں کا ختم ہو جانا ہے۔ اس لئے اسے اسی مناسبت سے صدقۃ الفطر کہتے ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی شخص رمضان کی آخری تاریخ میں مغرب سے قبل مر جاتا ہے تو اس پر صدقۃ الفطر واجب نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کسی بچے کی ولادت رمضان کی آخری تاریخ میں مغرب کے بعد یعنی عید کا چاند طلوع ہونے کے بعد ہوئی ہے تو اس پر صدقۃ الفطر واجب ہے' حالانکہ اس نے رمضان کا ایک دن بھی نہیں دیکھا۔ اس بات پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔ صدقۃ الفطر کا تعلق عید اور

اس کی خوشیوں سے ہے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ فقراء اور مساکین کو بھی عید کی خوشیوں میں شریک کیا جائے۔ حدیث ہے:

أُغْنُوهُمْ فِيْ هٰذَا الْيَوْمِ.

اس دن انہیں (فقرا اور مساکین کو) بھی مالدار کیا کرو۔

عورتوں کا مسجد میں تراویح ادا کرنا

سوال: بعض عورتیں پابندی سے تراویح کی نماز مسجدوں میں جا کر ادا کرتی ہیں۔ ان میں بعض ایسی بھی ہوتی ہیں جو اپنے شوہروں کی اجازت کے بغیر ہی نکل جاتی ہیں۔ بعض عورتیں مسجدوں میں جا کر اونچی آواز میں باتیں کرتی ہیں۔ کیا ان کا مسجد میں جا کر تراویح پڑھنا واجب ہے؟

جواب: تراویح کی نماز نہ عورتوں پر واجب ہے اور نہ مردوں پر۔ بلکہ یہ ایک سنت ہے، جس پر اللہ کی طرف سے نہایت عظیم اجر وثواب ہے۔ حدیث نبوی ﷺ ہے: ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

مَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غَفَرَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ.

(بخاری، مسلم)

جس نے رمضان میں رات کی نمازیں ایمان اور احتساب کے ساتھ پڑھیں' اللہ اس کے پچھلے گناہ بخش دے گا۔

عورتوں کا اپنے گھر میں رہ کر رمضان کی راتوں کی نمازیں پڑھنا یعنی تراویح پڑھنا زیادہ افضل ہے۔ اِلّا یہ کہ مسجدوں میں جانے سے ان کا مقصد صرف تراویح پڑھنا نہیں' بلکہ دوسرے نفع بخش نیک کام ہوں' مثلاً وعظ وتذکیر کے پروگرام میں شامل ہونا ہو یا درس وتدریس کی مجلس سے استفادہ کرنا ہو یا کسی جید قاری کی قرأت سننی ہو تو ان حالتوں میں ان کا مسجد جا کر نماز ادا کرنا زیادہ افضل ہے۔ کیوں کہ ان صورتوں میں نماز پڑھنے کے علاوہ دوسری نیکیاں بھی مقصود ہیں' اور اس لئے بھی کہ آج کل مرد حضرات اپنی

عورتوں کو دینی تعلیم دلانے کا زیادہ اہتمام نہیں کرتے۔ اس لئے ان عورتوں کا مسجد جا کر نماز باجماعت ادا کرنے کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم حاصل کرنا، ان کے لئے زیادہ بہتر ہے۔ اگر وہ گھر میں بیٹھی رہیں گی تو ممکن ہے کہ انہیں نماز میں وہ رغبت نہ پیدا ہو جو مسجد میں ہوتی ہے۔

تاہم بہرصورت عورتیں مسجدوں میں اپنے شوہروں کی اجازت ہی سے جاسکتی ہیں اور شوہروں کو بھی چاہئے کہ اپنی بیویوں کو مسجدوں میں جانے سے نہ روکیں اِلاّ یہ کہ واقعی کوئی شرعی عذر ہو۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں:

لَا تَمْنَعُوْا اَمَآءَ اللّٰهِ مَسَاجِدَ اللّٰهِ۔ (مسلم)

اللہ کی باندیوں (عورتوں) کو مسجدوں سے نہ روکو۔

عذرِ شرعی کی صورت یہ ہے کہ مثلاً شوہر بیمار ہو اور اسے بیوی کی خدمت کی ضرورت ہو۔ یا گھر میں چھوٹے چھوٹے بچے ہوں اور انہیں گھر میں تنہا چھوڑنا مناسب نہ ہو۔ وغیرہ۔

اگر بچے مسجد میں شور مچاتے ہیں اور نمازیوں کو پریشان کرتے ہیں تو انہیں تراویح کی نماز کے لئے مسجد لے جانا مناسب نہیں ہے۔ کیوں کہ تراویح کی نماز لمبی ہوتی ہے اور اتنی دیر تک بچوں کو سنبھالنا مشکل کام ہے۔ بخلاف پنج وقتہ فرض نمازوں کے کہ ان کا وقت مختصر ہوتا ہے۔ رہا مسئلہ عورتوں کا مسجدوں میں جا کر باتیں کرنے کا تو ان کا حکم بھی مردوں جیسا ہے۔ یعنی جس طرح مردوں کے لئے مناسب نہیں ہے کہ مسجدوں میں اونچی آواز میں باتیں کریں اور دُنیوی معاملات کے متعلق گفتگو کریں' اسی طرح عورتوں کے لئے بھی یہ مناسب نہیں ہے۔

یہاں میں ایک خاص بات کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ کچھ ایسے حضرات ہوتے ہیں جو عورتوں کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ غیرت مند ہوتے ہیں۔ اتنے زیادہ کہ ان پر تکلیف دہ حد تک پابندیاں عائد کرتے ہیں۔ انہیں کسی

صورت میں مسجدوں میں جانے کی اجازت نہیں دیتے' حالانکہ آج کل مسجدوں میں عورتوں کے لئے علیحدہ محفوظ جگہ ہوتی ہے' جب کہ حضور ﷺ کے زمانے میں عورتوں کے لئے کوئی علیحدہ جگہ نہیں ہوتی تھی۔ ان میں بعض حضرات ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی عورتوں کو مسجد میں سرگوشیوں تک کی اجازت نہیں دیتے' حالانکہ وہ خود اونچی آوازوں میں باتیں کرتے ہیں۔ میں ان سے کہنا چاہوں گا کہ غیرت ایک اچھی صفت ہے' لیکن اس میں حد سے تجاوز کرنا ایک ناپسندیدہ بات ہے۔ فرمان نبوی ﷺ ہے:

اِنَّ مِنَ الْغَيْرَةِ مَا يَبْغَضُهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ.

کچھ ایسی غیرت ہے جسے اللہ ناپسند کرتا ہے اور اس کا رسول بھی۔

دورِ حاضر نے نئی زندگی کے دروازے عورتوں پر بھی وا کیے ہیں۔ آج عورتیں اپنے گھروں سے نکل کر اسکول' کالج اور بازار ہر جگہ آتی جاتی ہیں۔ لیکن اس جگہ جانے سے محروم ہوگئی ہیں جو اس سرزمین پر سب سے بہتر جگہ ہے یعنی مسجد۔ میں بغیر کسی تردّد کے لوگوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ عورتوں کے لئے بھی مسجدوں کے دروازے کشادہ کریں۔ انہیں بھی مسجدوں میں درس وتدریس کی مجلسوں سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کریں۔ انہیں بھی اللہ کی برکتوں سے فیض یاب ہونے کا موقع عطا کریں۔ بہ شرطے کہ عورتیں اسی انداز میں مسجد جائیں جس طرح مسجد جانے کا حق ہے۔

روزے کی حالت میں ٹی وی دیکھنا

سوال: رمضان میں روزے دار کا ٹی وی دیکھنا شریعت کی نظر میں کیسا ہے؟

جواب: ٹی وی ذرائع ابلاغِ عامہ کا ایک حصہ ہے۔ اس میں خیر کا پہلو بھی ہے اور شر کا بھی۔ جس طرح دوسرے ذرائع ابلاغ مثلاً اخبارات وجرائد اور ریڈیو وغیرہ میں خیر وشر دونوں قسم کے پہلو ہوتے ہیں۔ مسلمان کو چاہئے کہ جو خیر ہو اس سے نفع حاصل کرنے کی کوشش کرے اور جو شر ہو اس سے اجتناب کرے، چاہے وہ روزے کی حالت میں ہو یا نہ ہو۔ لیکن روزے دار اور ماہِ رمضان کی اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس مہینے میں اپنے

آپ کو شر سے محفوظ رکھنے اور خیر کی طرف سبقت لے جانے کا خاص اہتمام کرے۔

ٹی وی دیکھنا فی نفسہٖ نہ مطلقاً حرام ہے اور نہ مطلقاً حلال۔ اس کا حرام یا حلال ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ ہم کون سا پروگرام دیکھ رہے ہیں؟ اگر یہ پروگرام بھلی باتوں پر مشتمل ہو مثلاً کوئی دینی پروگرام ہو یا نیوز کا پروگرام ہو یا کوئی مفید معلوماتی پروگرام ہو تو اس کا دیکھنا بالکل جائز ہے۔ لیکن اگر فحش قسم کے پروگرام ہوں تو ان کا دیکھنا ناجائز ہے چاہے رمضان کا مہینہ ہو یا کوئی دوسرا مہینہ۔ البتہ رمضان میں ان کا دیکھنا مزید باعثِ گناہ ہے۔ اسی طرح اگر ٹی وی دیکھنے میں اس قدر انہماک ہو کہ نماز وغیرہ سے غفلت ہو جاتی ہو تب بھی اس کا دیکھنا جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب شراب اور جوئے کو حرام قرار دیا تو اس کی حرمت کی علّت یہ بتائی کہ یہ دونوں چیزیں انسانوں کو اللہ کی یاد سے غافل کر دیتی ہیں۔ اللہ فرماتا ہے:

إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَٰنُ أَن يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَوٰةِ ۖ فَهَلْ أَنتُم مُّنتَهُونَ ○ (المائدہ:۹۱)۔

شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمہیں خدا کی یاد اور نماز سے روک دے۔ پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے؟

تراویح کی نماز جلدی جلدی ادا کرنا

سوال: کیا تراویح کی نماز جلدی جلدی اور تیز پڑھی جا سکتی ہے؟

جواب: بخاری و مسلم کی حدیث ہے:

مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ.

جس نے رمضان میں قیام لیل (تراویح) کا اہتمام ایمان واحتساب کے ساتھ کیا اس کے پچھلے گناہ بخش دیئے گئے۔

اللہ تعالیٰ نے رمضان میں دن کے وقت ہم پر روزے فرض کئے اور رات کے وقت نفل نمازوں یعنی تراویح کے اہتمام کی تاکید کی' تاکہ یہ عبادتیں ہمارے گناہوں کی معافی کا سبب بن سکیں۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ وہ کون سی نمازیں ہیں، جن سے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ یہ وہ نمازیں ہیں جن میں نماز کے ارکان وشرائط اور اس کے آداب کا پورا خیال رکھا گیا ہو۔ یہ بات سبھی کو معلوم ہے کہ اطمینان اور سکون کے ساتھ نماز کی ادائیگی بھی نماز کے ارکان میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے اس شخص کو، جس نے جلدی جلدی نماز ادا کی تھی، فرمایا:

اِرْجِعْ فَصَلِّ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ۔

واپس جاؤ' پھر نماز پڑھو' کیوں کہ تمہاری نماز نہیں ہوئی۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے اسے نماز پڑھنی سکھائی کہ کس طرح ٹھہر ٹھہر کر اطمینان کے ساتھ نماز ادا کی جاتی ہے۔ (۳) اللہ کا فرمان ہے:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ○ (المومنون:۱،۲)

کامیاب ہوئے وہ جو ایمان لائے۔ جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ وہ نماز کامیابی کی ضامن ہے جو خشوع وخضوع کے ساتھ ادا کی جائے۔ خشوع کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو دل کا خشوع یعنی اس بات کا پوری طرح احساس ہو کہ نماز کے دوران ہم کس ہستی کے ساتھ ہم کلام ہیں اور یہ کہ وہ ہماری تمام حرکتیں دیکھ رہا ہے۔ دل کا خشوع یہ بھی ہے کہ ہم جو کچھ پڑھیں' سمجھ کر پڑھیں۔ ایسا نہ ہو کہ زبان پر تو اللہ کا کلام ہو اور دل کہیں اور غائب ہو۔

خشوع کی دوسری قسم بدن کا خشوع ہے اور وہ یہ ہے کہ نماز میں احترام وادب کا خاص خیال ہو۔ نماز کے دوران ادھر اُدھر دیکھنا، کھٹا کھٹ رکوع وسجدہ کرنا، بار بار کھجلانا یا کپڑوں سے کھیلنا یہ سب احترام وآداب کے خلاف ہے۔

تمام مسلمان بھائیوں کے لئے میری یہ نصیحت ہے کہ جب ہم نماز پڑھیں تو یہ خیال کرلیں کہ ہم کس ہستی کے سامنے کھڑے ہیں اور کس سے ہم کلام ہیں۔ ہمیں احساس ہو کہ وہ ہستی ہمیں دیکھ رہی ہے۔ نماز' یوں ادا کرنا کہ گویا ایک مشکل مرحلہ تھا جو سر ہو گیا یا بھاری بوجھ تھا جسے منزلِ مقصود تک پہنچا دیا' نماز کی حکمت وغایت کے قطعاً منافی ہے۔ بہت سارے لوگ رمضان میں بیس رکعت تراویح چند منٹوں میں ختم کر لیتے ہیں۔ قرآن جلدی جلدی اور تیز تیز پڑھتے ہیں تاکہ کم سے کم وقت میں نماز ختم ہو جائے۔ نہ اطمینان سے رکوع کرتے ہیں اور نہ سجدہ اور نہ خشوع وخضوع ہی کا اہتمام کرتے ہیں۔ یہ تو ایسی نماز ہوئی جس کے بارے میں نبی ﷺ نے فرمایا:

تَعْرُجُ اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ سَوْدَآءُ مُظْلِمَةٌ تَقُوْلُ لِصَاحِبِهَا ضَيَّعَكَ اللّٰهُ كَمَا ضَيَّعْتَنِيْ.

یہ نماز آسمان کی طرف جاتی ہے اس حالت میں کہ کالی اور تاریک ہوتی ہے۔ نماز پڑھنے والے سے کہتی ہے کہ اللہ تمہیں ضائع کرے جس طرح تم نے مجھے ضائع کر دیا۔

بغیر خشوع اور اطمینان کے ساتھ تراویح پڑھنے والوں کے لئے میری یہ نصیحت ہے کہ خشوع اور اطمینان کے ساتھ ادا کی گئی آٹھ رکعتیں جلدی جلدی ادا کی گئی بیس رکعتوں سے بہتر اور افضل ہیں۔ اگر بیس رکعات پڑھنا مشکل ہو تو آٹھ رکعت ہی پر اکتفا کریں لیکن اطمینان اور خشوع وخضوع کا ضرور خیال کریں۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں دیکھے گا کہ کتنی رکعتیں پڑھیں بلکہ اس کے نزدیک خضوع وخشوع کی اہمیت ہے اور یہی خشوع دراصل باعثِ مغفرت ورحمت ہے۔

ایامِ حیض کو مؤخر کرنے کے لئے گولیوں کا استعمال

سوال: کون ہے جو ماہ رمضان کی خیر وبرکت سے بے خبر ہو۔ اس خیر وبرکت سے کماحقہ' مستفید ہونے کے لئے ہم عورتوں کی خواہش ہوتی ہے کہ ایک روزہ بھی قضا نہ ہو۔ لیکن مہینے میں چند دن ایسے ہوتے ہیں جب ہم عورتیں نہ نماز پڑھ سکتی ہیں اور نہ روزے

رکھ سکتی ہیں۔ کیا ہمارے لئے جائز ہوگا کہ حیض آنے سے قبل کچھ ایسی دواؤں کا استعمال کرلیں جن سے حیض کے دن کچھ مدت کے لئے مؤخر ہو جائیں اور ہمارا ایک روزہ بھی قضا نہ ہو؟ بعض عورتوں نے ان کا استعمال بھی کیا ہے اور انہیں کوئی نقصان نہیں ہوا۔

جواب: تمام علماء کا اتفاق ہے کہ ایّامِ حیض میں روزے اور نماز دونوں معاف ہیں تاہم روزوں کی قضا لازمی ہے۔ ایسا اس لئے ہے کہ ایّامِ حیض میں عورتیں جسمانی طور پر کمزوری، تکلیف اور تکان محسوس کرتی ہیں اور یہ اللہ کی رحمت ہے ان پر، کہ اللہ نے ان ایّام میں انہیں یہ آسانی عطا کی ہے۔

ایّامِ حیض کو مؤخر کرنے کی خاطر دواؤں کے استعمال کے سلسلے میں میری اپنی ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ فطرت کے ساتھ جنگ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تمام معاملات اپنے فطری انداز میں انجام پاتے رہیں۔ حیض کا جاری ہونا ایک فطری عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی فطرت پر عورت کی تخلیق کی ہے اور یہ اللہ ہی ہے جس نے ان ایام میں ان پر روزے اور نماز معاف کئے۔ اس لئے ہم بندوں کو چاہئے کہ ہم بھی اللہ کی فطرت اور اس کی منشا کے آگے سرِ تسلیم خم کردیں۔

تاہم میں ان دواؤں کے استعمال کو ناجائز بھی نہیں قرار دیتا۔ اگر ایسی دواؤں کا وجود ہے کہ جن سے ایّامِ حیض کو منسوخ کیا جا سکتا ہو تو ان کا استعمال اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ نیت صرف یہ ہو کہ روزے قضا نہ ہوں اور یہ کہ صحت پر کوئی خراب اثر نہ پڑے۔

شعبان میں قضا روزے رکھنا

سوال: سالِ گزشتہ رمضان کے چھ روزے چھوٹ گئے تھے۔ میں نے اب جا کر شعبان کے آخری عشرے میں قضا روزے رکھنے شروع کئے ہیں۔ ابھی دو تین روزے ہی رکھے تھے کہ لوگوں نے یہ کہنا شروع کردیا کہ شعبان کے مہینے میں قضا روزے رکھنے جائز نہیں۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟

جواب: قضا روزے کسی بھی مہینے میں رکھے جا سکتے ہیں۔ اس میں شعبان اور شوال کی کوئی قید نہیں ہے۔ روایتوں میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بسا اوقات بعض قضا روزے شعبان کے مہینے میں رکھتی تھیں۔ اس لئے آپ نے جو قضا روزے شعبان میں رکھے ہیں ان شاء اللہ وہ اللہ کے یہاں مقبول ہوں گے۔

روزے میں انجکشن لگانے کا حکم

سوال: روزے کی حالت میں مریض کا انجکشن لگوانا یا کان میں دوا ڈالنا جائز ہے؟ کیا عورتوں کا سرمہ لگانا جائز ہے؟

جواب: وہ انجکشن جن کی دوائیں معدے تک نہیں جاتیں یا بالفاظِ دیگر جن کا مقصد مریض کو غذا فراہم کرنا نہیں ہوتا، ان کے لگانے میں کوئی حرج نہیں۔ اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔

البتہ انجکشن کی وہ قسمیں، جن کا مقصد مریض کو غذا فراہم کرنا ہوتا ہے مثلاً گلوکوز کا پانی چڑھانا وغیرہ تو اس سلسلہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ ایسی چیزوں کا وجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھا اور نہ سلفِ صالحین کے دور میں۔ یہ تو عصرِ جدید کی ایجاد ہے۔ علماء کے ایک طبقے کا خیال ہے کہ اس قسم کے انجکشن سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ جب کہ دوسرا طبقہ روزے کی حالت میں مریض کے لئے اس کے استعمال کو جائز قرار دیتا ہے۔

اگرچہ میں دوسرے طبقے کی رائے کو قابلِ ترجیح سمجھتا ہوں، تاہم احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ روزے کی حالت میں اس قسم کے انجکشن سے پرہیز کرنا چاہئے۔ رمضان کی راتوں میں یہ انجکشن لئے جا سکتے ہیں اور اگر دن کے وقت اس انجکشن کا لگانا ضروری ہو تو اللہ تعالیٰ نے ویسے ہی مریض کے لئے روزے معاف کئے ہیں۔ اس قسم کے انجکشن سے معدہ میں براہِ راست کوئی غذا تو نہیں پہنچتی، البتہ اس کے استعمال سے بدن میں ایک قسم کا نشاط اور قوت آ جاتی ہے اور یہ بات روزے کے منافی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو روزے ہم پر فرض کئے ہیں تو اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ہم بھوک پیاس کی تکلیف کو محسوس کر

سکیں۔ اگر اس قسم کے انجکشن کی عام اجازت دیدی جائے تو صاحبِ حیثیت حضرات اس کا استعمال عام کر دیں گے تاکہ وہ بھوک پیاس کی تکلیف کو کم سے کم کر سکیں اور یوں روزے کا ایک مقصد فوت ہو جائے گا۔

رہی بات کانوں میں تیل ڈالنے یا آنکھوں میں سرمہ لگانے کی تو اس سلسلے میں علماء کا اختلاف ہے۔ علماء کے متشدد طبقے کی رائے یہ ہے کہ ان چیزوں کے استعمال سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ جب کہ معتدل قسم کے فقہاء کا خیال ہے کہ ان کے استعمال سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیوں کہ ان کے استعمال سے نہ معدے تک کوئی غذا پہنچتی ہے اور نہ بدن میں کوئی مقوّی شئے داخل ہوتی ہے جو بدن کو تقویت بخشے۔ میرے نزدیک یہی رائے قابلِ ترجیح ہے۔ شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی بھی یہی رائے ہے۔ ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ چیزیں روزہ توڑنے والی ہوتیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم لازمی طور ان کے بارے میں لوگوں کو بتاتے کہ یہ چیزیں روزہ توڑنے والی ہیں۔ کیوں کہ ان چیزوں کا وجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی تھا۔ لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ کوئی بھی صحیح حدیث ایسی نہیں ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چیزوں کے استعمال سے منع فرمایا ہو۔

اس سلسلے میں ایک حدیث ہے بھی تو وہ بالکل ضعیف حدیث ہے۔

روزے کی حالت میں مسواک یا پیسٹ کرنے کا حکم

سوال: روزے کی حالت میں مسواک کرنے اور خاص کر پیسٹ استعمال کرنے کا کیا حکم ہے؟

جواب: زوالِ شمس سے قبل مسواک کرنا ایک پسندیدہ اور مستحب عمل ہے، روزے کی حالت میں بھی اور عام دنوں میں بھی۔ زوال کے بعد مسواک کرنے کے سلسلے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء کے نزدیک زوال کے بعد مسواک کرنا صرف مکروہ ہے۔ کیوں کہ حدیث میں ہے کہ روزے دار کے منہ کی بُو اللہ کو مشک سے بھی زیادہ پسند ہے۔ (۴) اس لئے روزے دار کو چاہئے کہ اس پسندیدہ چیز کو برقرار رکھے اور مسواک کر کے

اسے زائل نہ کرے۔ بالکل اسی طرح جس طرح شہیدوں کو ان کے خون آلودہ کپڑوں کے ساتھ ہی دفن کرنے کی تلقین ہے، کیوں کہ قیامت کے دن ان کے خون آلودہ کپڑوں سے مشک کی خوشبو آئے گی۔

میری رائے یہ ہے کہ حدیث میں روزے دار کے منہ کی بُو کو مشک سے بھی زیادہ پسندیدہ قرار دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسے برقرار بھی رکھا جائے۔ کیوں کہ کسی صحابی سے مروی ہے کہ:

اِنِّی رَأَیْتُ النَّبِیَّ ﷺ یَسْتَوکُ مَا لَا یُحْصٰی وَھُوَ صَائِمٌ۔

میں نے نبی ﷺ کو اتنی دفعہ مسواک کرتے دیکھا کہ جس کا کوئی شمار نہیں، حالانکہ وہ روزے کی حالت میں تھے۔

مسواک کرنا ایک پسندیدہ عمل ہے، حضور ﷺ کی سنّت ہے اور حضور ﷺ نے بارہا اس کی ترغیب دی ہے۔ حدیث میں ہے:

اَلسِّوَاکُ مُطَھِّرَۃٌ لِلْفَمِ مُرْضَاۃٌ لِلرَّبِّ۔ (۵)

مسواک منہ کے لئے پاکی کا باعث اور خدا کی رضا کا موجب ہے۔

اسی طرح دانتوں کی صفائی کے لئے روزے کی حالت میں پیسٹ کا استعمال بھی جائز ہے۔ البتہ اس بات کی احتیاط لازمی ہے کہ اس کا کوئی حصہ پیٹ میں نہ چلا جائے۔ کیوں کہ جو چیز پیٹ میں چلی جاتی ہے وہ روزہ توڑنے کا باعث بنتی ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ روزے کی حالت میں پیسٹ کے استعمال سے پرہیز کیا جائے۔ لیکن اگر کوئی شخص پیسٹ کا استعمال غایت درجہ احتیاط کے ساتھ کرتا ہے اور اس کے باوجود اس کا کچھ حصہ پیٹ میں چلا جائے تو میرے نزدیک اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا۔ کیوں کہ جان بوجھ کر اس نے وہ چیز پیٹ میں نہیں پہنچائی بلکہ غلطی سے چلی گئی اور اللہ کے نزدیک یہ بھول چُوک معاف ہے۔ حدیث میں ہے:

رُفِعَ عَنْ اُمَّتِیَ الْخَطَاءُ وَالنِّسْیَانُ وَمَا اسْتُکْرِھُوْا عَلَیْہِ۔

میری اُمت بھول چوک کے معاملے میں اور زبردستی کوئی غلط کام کرائے
جانے کے معاملے میں مرفوع القلم ہے۔

کس سفر میں روزہ معاف ہے؟

سوال: کتنی مسافت کے سفر میں روزے کی قضا درست ہے؟ کیا یہ ۸۱ کلومیٹر ہے؟ فرض کریں اگر کسی سفر میں کوئی مشقت نہ ہو تو کیا یہ بات جائز ہے کہ روزے کو قضا نہ کیا جائے؟

جواب: اس بات پر تمام اُمت کا اتفاق ہے کہ سفر کی حالت میں روزہ قضا کیا جا سکتا ہے' کیوں کہ اس سلسلے میں قرآن کی واضح ہدایت موجود ہے:

مَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ (البقرۃ:۱۸۵)
اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرے۔

البتہ مسافت کی وہ مقدار جس پر سفر کا اطلاق ہو'اس سلسلے میں علماء کا اختلاف ہے۔ آپ نے جس مقدار کا تذکرہ کیا ہے، میرا خیال ہے کہ تمام فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اتنی مسافت کے سفر کو نماز قصر کرنے اور روزہ قضا کرنے کے لئے کافی تصور کیا جائے۔ کیوں کہ جمہور فقہاء نے ۸۴ کلومیٹر کی مقدار کو متعین کیا ہے اور ۸۱ اور ۸۴ میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے ایسی کوئی روایت منقول نہیں ہے کہ انہوں نے سفر کی پیمائش میٹر یا کلومیٹر سے کی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بعض فقہاء کے نزدیک مسافت کی کوئی شرط نہیں ہے۔ ان کے نزدیک ہر اس سفر کو جسے عرفِ عام میں سفر کہا جا سکے، اس میں نماز کی قصر اور روزہ کی قضا جائز ہے۔

سفر کی حالت میں اس بات کا اختیار ہے کہ روزہ رکھا جائے یا اسے قضا کیا جائے۔ روایتوں میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر پر ہوتے تھے۔ ان میں بعض روزے کی حالت میں ہوتے تھے اور بعض بغیر روزے کے ہوتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

ان دونوں میں کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی۔ یعنی دونوں ہی حضور ﷺ کی نظر میں یکساں تھے۔

سفر اگر پُر مشقت ہو اور اس میں روزہ رکھنا تکلیف دہ ہو تو ایسی حالت میں روزہ رکھنا مکروہ ہے' بلکہ شاید حرام ہو کیوں کہ ایک روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے ایک شخص کو اس حالت میں دیکھا کہ لوگ اس پر سایہ کیے ہوئے تھے۔ وہ روزے کی وجہ سے بدحال تھا اور وہ مسافر بھی تھا۔ آپ ﷺ نے اس شخص کے بارے میں دریافت کیا تو لوگوں نے بتایا کہ وہ روزے سے ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ اَلصِّيَامُ فِي السَّفَرِ. (بخاری)

سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی کا کام نہیں ہے۔

سفر اگر پُر مشقت نہ ہو اور روزہ رکھنے میں کوئی تکلیف نہ ہو تو روزہ رکھنا اور اس کی قضا کرنا دونوں ہی جائز ہے' جیسا کہ میں نے اوپر تذکرہ کیا۔ البتہ اس بارے میں علماء میں اختلاف ہے کہ ان دونوں صورتوں میں افضل صورت کون سی ہے؟ بعض نے روزہ رکھنے کو افضل قرار دیا ہے جب کہ بعض نے روزہ توڑنے کو افضل قرار دیا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان دونوں صورتوں میں سے جو زیادہ آسان ہو' وہی افضل ہے۔ روایت میں ہے کہ حمزہ بن عامر الاسلمی رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ میں اکثر سفر پر رہتا ہوں۔ بسا اوقات رمضان میں بھی سفر کرتا ہوں، میں نوجوان ہوں اور بہ آسانی سفر میں روزہ رکھ سکتا ہوں۔ میرا روزہ رکھنا زیادہ افضل اور باعثِ اجر ہے یا روزہ قضا کرنا؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

اَىَّ ذٰلِكَ شِئْتَ يَا حَمْزَةَ (ابوداؤد)

ان دونوں میں سے جو تم چاہو اے حمزہ۔

یعنی جو تمہیں آسان لگے وہی کرو اور وہی افضل ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے جواب دیا:

هِيَ رُخْصَةٌ مِّنَ اللّٰهِ لَكَ فَمَنْ اَخَذَ بِهَا فَحَسَنٌ وَمَنْ اَحَبَّ اَنْ يَّصُوْمَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ۔ (نسائی)

یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے لئے چھوٹ ہے جس نے اس چھوٹ سے فائدہ اٹھایا تو بہتر ہے اور جس نے روزہ رکھا تو کوئی حرج نہیں۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس آیت میں مسافر کے لئے روزے کی قضا کی اجازت دی ہے یا اس میں رخصت کی علت سفر بتائی ہے، نہ کہ سفر کی مشقت۔ اس آیت میں یہ نہیں بتایا کہ سفر میں مشقت ہو تو قضا کی رخصت ہے ورنہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے صرف سفر کی بنا پر ہمیں یہ رخصت عطا کی ہے اور ہمیں بھی چاہئے کہ ہم اس رخصت سے فائدہ اٹھائیں۔ خواہ مخواہ کی باریکیوں میں پڑ کر اس رخصت کو برباد نہ کریں۔ جو لوگ اکثر سفر میں رہتے ہیں وہ یہ بات بہ خوبی سمجھتے ہیں کہ سفر بہ ذاتِ خود تکلیف دہ ہوتا ہے، چاہے گاڑی کا سفر ہو یا ہوائی جہاز کا۔ انسان کا اپنے وطن سے دور ہونا بہ ذاتِ خود پریشانیوں کا سبب ہے' کیوں کہ اس کی روزمرہ کی زندگی بری طرح متاثر ہوتی ہے اور انسان نفسیاتی طور پر بے چین رہتا ہے۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ نے اس وجہ سے ہمیں صرف سفر کی بنا پر یہ رخصت عطا کی ہو۔

صدقۃ الفطر کی مقدار

سوال: صدقۃ الفطر کی مقدار کیا ہر سال تبدیل ہوتی رہتی ہے؟

جواب: صدقۃ الفطر کی مقدار سال بہ سال تبدیل نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک محدود اور متعین مقدار ہے جسے نبی ﷺ نے مقرر کیا ہے۔ یہ مقدار ایک صاع یعنی تقریباً دو کلو گرام اناج ہے۔ میرے خیال میں صدقۃ الفطر کو اناج کی صورت میں مقرر کرنے میں دو حکمتیں پوشیدہ ہیں۔

۱- پہلی حکمت یہ ہے کہ اس زمانے میں عربوں' خاص کر دیہات میں رہنے والوں کے پاس دینار و درہم (پیسوں) کے مقابلے میں اناج اور غلہ زیادہ موجود ہوتا تھا۔ بہت

سارے ایسے لوگ تھے جن کے پاس غلہ اور اناج تو ہوتا تھا' لیکن نقد رقم کی صورت میں ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔(٦) صدقۃ الفطر کو پیسوں کی صورت میں ادا کرنا ہوتا تو شاید بہت سارے لوگ پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتے۔

۲- دوسری حکمت یہ ہے کہ پیسوں کی قوتِ خرید ہمیشہ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ آج اگر پانچ روپے کا ایک کلو چاول مل رہا ہے، تو کل اس ایک کلو چاول کی قیمت دس روپے بھی ہو سکتی ہے۔ اسی لئے حضور ﷺ نے صدقۃ الفطر کو اناج اور غلے کی صورت میں مقرر کر دیا تاکہ مقرر شدہ اناج کی پوری مقدار غریبوں تک پہنچتی رہے۔

احناف کے نزدیک اس مقرر شدہ اناج کی قیمت بھی ادا کی جا سکتی ہے۔ حضور ﷺ نے صدقۃ الفطر کے لئے اناج کی محض چند قسموں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان قسموں کے علاوہ دوسری قسموں کو بطورِ صدقۃ الفطر ادا نہیں کیا جا سکتا۔ علمائے کرام کہتے ہیں کہ جس جگہ صدقۃ الفطر ادا کیا جا رہا ہے' وہاں اناج کی جتنی قسمیں مستعمل ہیں، ان میں سے کسی بھی قسم سے صدقۃ الفطر نکالا جا سکتا ہے۔ چاہے گیہوں ہو یا چاول یا کھجور یا مکئی یا اس کے علاوہ دوسری کوئی چیز۔

اگر آدمی صاحب حیثیت ہے تو اسے چاہئے کہ اس مقرر شدہ اناج کے علاوہ کچھ رقم ادا کرے' کیوں کہ اس دور میں کھانا فقط چاول یا روٹی پر مشتمل نہیں ہوتا' بلکہ اس کے ساتھ سالن کی صورت میں دوسرے لوازمات بھی ضروری ہوتے ہیں۔

دوسرے رمضان سے قبل ہی قضا روزوں کی ادائی

سوال: اگر کسی عذر کی بنا پر رمضان کے چند روزے چھوٹ گئے ہوں اور دوسرے رمضان کے آنے تک چھوٹے ہوئے روزوں کو نہ رکھا جا سکے تو ان کی قضا کی کیا صورت ہو گی؟ کیا قضا کے ساتھ ساتھ فدیہ بھی دینا ہو گا؟ اگر اس بات میں شک ہو کہ کتنے روزے چھوٹے ہیں تو ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے؟

جواب: شافعی اور حنبلی مسلک کے لحاظ سے اگر چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا

دوسرے رمضان کے آنے تک نہ ہو سکی تو ایسی صورت میں قضا کے ساتھ ساتھ فدیہ بھی واجب ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے یہی منقول ہے۔ فدیہ یہ ہے کہ ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلایا جائے۔ جمہور علماء کے نزدیک صرف قضا واجب ہے فدیہ نہیں۔

میری رائے یہ ہے کہ چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا تو بہرحال لازمی ہے، اس سے کوئی مفر نہیں۔ البتہ فدیہ بھی ادا کر دیا جائے تو زیادہ بہتر ہے ورنہ کوئی بات نہیں کیوں کہ براہِ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ایسی روایت نہیں ہے جس میں فدیہ ادا کرنے کی بات ہو۔

شک کی صورت میں انسان اسی پر عمل کرے جس کا اسے یقین ہو یا کم از کم غالب گمان ہو۔ بہرحال مزید اطمینان کی خاطر زیادہ روزے رکھ لینا بہتر ہے۔

شعبان کے بعض دنوں کو روزے کے لئے مخصوص کرنا

سوال: کیا ماہِ شعبان میں کچھ ایسے متعین ایام ہیں جن میں روزہ رکھنا مستحب ہے؟

جواب: رمضان کے علاوہ شعبان وہ مہینہ ہے، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم روزے کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرتے تھے۔ لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے مطابق صرف رمضان ہی ایسا مہینہ ہے، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پورے مہینے روزے رکھتے تھے۔ بعض عرب ملکوں میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو رجب، شعبان اور رمضان تینوں مہینے لگاتار روزے رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے۔ اسی طرح بعض لوگ شعبان کے کچھ متعین ایام میں روزوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ (۷)

اسلامی شریعت میں یہ بات جائز نہیں کہ بغیر کسی شرعی دلیل کے کسی بھی دن یا مہینے کو روزے یا کسی دوسری عبادت کے لئے خاص کر لیا جائے۔ کسی دن کو کسی عبادت کے لئے خاص کرنا، صرف شارع یعنی اللہ کا حق ہے۔ وہی ایسا کر سکتا ہے۔ کوئی بندہ نہیں۔ اسی لئے روزوں کے لئے ہم ان ہی ایام کو مخصوص کر سکتے ہیں، جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل

موجود ہو۔ مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب روزہ رکھنا شروع کرتے تو ایسا لگتا کہ اب ہمیشہ رکھیں گے۔ اور جب روزہ نہیں رکھتے تھے تو ایسا لگتا کہ اب کبھی روزہ نہیں رکھیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سوموار اور جمعرات کے روزوں کا اہتمام کرتے تھے۔ اسی طرح ہر مہینے کے تین روشن دنوں میں روزوں کا اہتمام کرتے تھے۔ اسی طرح ماہِ شعبان میں زیادہ سے زیادہ روزے رکھتے تھے۔ غالباً رمضان کی تیاری کے لئے ایسا کرتے تھے۔ لیکن ایسی کوئی روایت نہیں ہے کہ شعبان کی کسی خاص تاریخ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے کے لئے مخصوص کیا ہو۔

حواشی وحوالہ جات

(۱) حاکم اور دار قطنی کی روایت ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔

(۲) ترمذی، احمد

(۳) بخاری، مسلم اور اصحاب سنن کی روایت ہے۔

(۴) بخاری کی روایت ہے۔

(۵) بخاری، نسائی، ابنِ خزیمہ اور ابنِ حبان کی روایت ہے۔

(۶) آج بھی دیہاتوں میں اس قسم کی صورتِ حال موجود ہے۔

(۷) برصغیر میں لوگ شعبان کی پندرہویں تاریخ کو روزوں کا خاص اہتمام کرتے ہیں' حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا کوئی عمل ثابت نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

ساتواں باب

حج اور عمرہ

نفلی حج افضل ہے یا صدقہ کرنا؟

سوال: بعض مسلمان متعدّد بار اور بعض ہر سال حج کرتے ہیں۔ حج کے موقع پر کتنی بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے۔ اس سے کوئی بے خبر نہیں ہے۔ اس بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے ہر سال کئی جانیں جاتی ہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ نفلی حج پر خرچ کرنے کے بجائے یہی پیسے غریبوں اور محتاجوں کو دے دیئے جائیں یا اسلامی مدارس و مراکز کو روانہ کئے جائیں کیوں کہ ان مدارس یا مراکز کو ہمیشہ پیسوں کی قلت کا سامنا ہوتا ہے؟ یا ان صدقات کے مقابلے میں نفلی حج ادا کرنا زیادہ افضل ہے؟

جواب: یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ بندۂ مومن سب سے پہلے دینی فرائض و واجبات کو ادا کرنے کا مکلّف ہے۔ رہیں نفلی عبادتیں تو ان کے ذریعے زیادہ سے زیادہ اللہ کا قرب حاصل کیا جاسکتا ہے۔ حدیثِ قدسی ہے:

مَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِمِثْلِ اَدَاءِ مَا افْتَرَضْتُہٗ عَلَیْہِ وَلَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّہٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُہٗ کُنْتُ سَمْعَہُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِہٖ...... الخ (بخاری)

فرض کاموں سے زیادہ کوئی چیز میرے بندے کو مجھ سے قریب نہیں کرتی اور میرا بندہ نوافل کے ذریعے مسلسل مجھ سے قریب ہوتا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ میرا محبوب ہو جاتا ہے۔ جب وہ میرا محبوب ہو جاتا ہے تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں

جن سے وہ سنتا ہے......الخ

اس تمہید کے بعد چند شرعی اصول پیش کرتا ہوں۔

۱- اللہ تعالیٰ اس وقت تک نفل عبادت قبول نہیں کرتا جب تک فرض ادا نہ کیا جائے۔ اس قاعدے کی بنا پر ہر وہ شخص جو سال بہ سال حج اور عمرے ادا کرتا ہے' لیکن زکوٰۃ وصدقات کی ادائی میں بخل سے کام لیتا ہے اس کے حج اور عمرے بے کار ہیں۔ اسے نفلی حج کرنے کے بجائے پہلے زکوٰۃ، صدقات کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اسی طرح وہ تاجر جو قرضوں میں پھنسا ہوا ہو، اسے قرض اتارنے کی فکر کرنی چاہیے۔

۲- اللہ تعالیٰ اس نفل کو قبول نہیں کرتا جو کسی غلط کام کا سبب بن جائے' کیوں کہ نفل کام کرنے سے زیادہ اہم ہے غلط کام سے محفوظ رہنا۔ چنانچہ اگر نفل حج کرنے والوں کی کثرت کی وجہ سے ایام حج میں اتنی بھیڑ ہو جاتی ہو کہ لوگوں کی جانیں خطرہ میں پڑ جائیں' تو ایسی صورت میں نفلی حج کرنے کے مقابلے میں بھیڑ کم کرنا زیادہ اہم اور ضروری ہے۔

۳- منفعت حاصل کرنے کے مقابلے میں فساد اور خرابی دور کرنا زیادہ ضروری ہے۔ نفل حج کرنے میں اگرچہ ثواب ہے، لیکن ساتھ ہی یہ خرابی ہے کہ بھیڑ کی زیادتی کی وجہ سے حاجیوں کو تکلیف پہنچتی ہے۔ اس لئے ثواب حاصل کرنے کے مقابلے میں یہ خرابی دور کرنا زیادہ اہم اور ضروری ہے۔

۴- ثواب کمانے اور اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لئے نفل کاموں کی تعداد بے شمار ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ آدمی نفل حج کر کے ہی ثواب کمائے۔ خاص کر ایسی صورت میں کہ اس نفل کی وجہ سے دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہو۔ ثواب کمانے کے لئے وہ ان پیسوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کر سکتا ہے۔ محتاجوں کی مدد کر سکتا ہے۔ غریبوں کا پیٹ بھر سکتا ہے۔ بسا اوقات یہ صدقہ کرنا واجب ہوتا ہے، جیسا کہ اس حدیث میں ہے:

لَيْسَ بِمُؤْمِنٍ مَنْ بَاتَ شَبْعَانَ وَجَارُهُ اِلٰى جَنْبِهٖ جَائِعٌ۔ (حاکم، طبرانی)

وہ شخص مومن نہیں ہے جو خود تو شکم سیر رہے اور اس کے بغل میں اس کا پڑوسی بھوکا ہو۔

یہ بات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ دینی مدارس اور مراکز ہمیشہ پیسوں کی قلت کا شکار رہتے ہیں۔ کتنے ہی دینی مراکز صرف اسی وجہ سے بند ہو جاتے ہیں کہ کوئی ان کی مالی معاونت نہیں کرتا۔ اس لئے نفل حج کرنے والوں سے میری گزارش ہے کہ وہ ایک حج ہی پر اکتفا کریں اور اللہ نے انہیں جو مال عطا کیا ہے اسے دوسرے خیر کے کاموں میں صرف کریں، جن کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اگر دوبارہ حج کرنے کی بہت خواہش ہو تو کم از کم پانچ سال کا وقفہ ضرور رکھیں۔

عورت کا کسی محرم کے بغیر سفرِ حج کرنا

سوال: ایک عورت ہے جو دولت مند بھی ہے اور جسمانی طور پر تندرست بھی، لیکن اس کے ساتھ کوئی محرم نہیں ہے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ مردوں یا عورتوں کی جماعت میں شامل ہو کر حج ادا کرے؟ یہ بات ملحوظ رہے کہ اس دور میں سفر کافی محفوظ اور پُر امن ہوتا ہے اب وہ زمانہ نہیں کہ اکیلی عورت کے لئے سفر پر خطر ہو۔

جواب: اسلامی شریعت کا یہ قاعدہ ہے کہ اکیلی عورت کا سفر کرنا جائز نہیں ہے۔ خواہ وہ حج کا سفر ہو یا کوئی اور سفر۔ عورت کے ساتھ شوہر یا کسی محرم کا ہونا ضروری ہے۔

حدیث ہے:

لَا تُسَافِرُ الْمَرْأَةُ اِلَّا مَعَ ذِیْ مَحْرَمٍ۔ (بخاری)

عورت کسی محرم کے ساتھ ہی سفر کر سکتی ہے۔

دوسری حدیث ہے:

لَا یَحِلُّ لِاِمْرَأَۃٍ تُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ تُسَافِرَ مَسِیْرَۃَ یَوْمٍ وَّلَیْلَۃٍ لَیْسَ مَعَھَا مَحْرَمٌ۔ (بخاری، مسلم، ترمذی)

کسی ایسی عورت کے لئے جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتی ہو حلال نہیں ہے

کہ وہ ایک دن اور ایک رات کا سفر کسی محرم کے بغیر کرے۔

عورتوں کے لئے اس حکم سے یہ ہرگز نہ سمجھ لیا جائے کہ دینِ اسلام عورتوں کی طرف سے بدظن ہے اور عورتوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ حکم خود عورتوں کی بہتری اور ان کے فائدے کے لئے ہے' تاکہ ان کے سب سے قیمتی زیور یعنی ان کی عزت وکرامت پر کوئی آنچ نہ آئے۔ ہر عقل مند شخص اس بات کو بہ خوبی سمجھ سکتا ہے کہ سفر میں اکیلی عورت کی عزت کس قدر خطرے کی زد میں ہوتی ہے۔

تاہم عورت اگر حج کی استطاعت رکھتی ہو اور وہ شوہر یا محرم سے محروم ہو تو اسے کیا کرنا چاہئے، اس سلسلے میں مختلف اقوال ہیں:

۱۔ بعض فقہاء نے مذکورہ احادیث کے عموم پر عمل کرتے ہوئے اکیلی عورت کے لئے ہر قسم کے سفر کو ناجائز قرار دیا ہے' چاہے وہ حج کے لئے ہی سفر کیوں نہ ہو۔

۲۔ بعض فقہاء نے اس حکم سے ایسی بوڑھی عورت کو مستثنیٰ قرار دیا ہے جو کسی کے لئے توجہ کا مرکز نہ بن سکتی ہو۔

۳۔ بعض فقہاء نے اس حکم سے اس عورت کو مستثنیٰ قرار دیا ہے جو بھروسا مند عورتوں کی جماعت کے ساتھ سفر کر رہی ہو۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تو صرف ایک صالح عورت کی معیت بھی کافی ہے۔

۴۔ شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اگر اس بات کا یقین ہو کہ سفر پُر امن اور محفوظ ہے تو اکیلی عورت بھی حج کے لئے جا سکتی ہے۔

میری رائے یہ ہے کہ اگر سفر محفوظ ہو جیسا کہ آج کل ہوائی جہاز کا سفر ہوتا ہے اور ساتھ میں نیک عورتوں یا مردوں کی جماعت ہو تو عورت بغیر کسی محرم اور شوہر کے حج یا کسی اور سفر کے لئے نکل سکتی ہے۔ دلیل کے طور پر دو حدیثیں پیش کرتا ہوں۔

۱۔ حجتہ الوداع کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض بیویوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے ساتھ سفر پر روانہ کیا تھا۔ اس واقعہ پر کسی

صحابی نے اعتراض نہیں کیا۔ (بخاری)

۲- عدی بن حاتم رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے پیشین گوئی کی تھی کہ چند برسوں میں اسلام کا یوں غلبہ ہو گا اور راستے اتنے پُرامن ہوں گے کہ اکیلی عورت حیرہ (عراق) سے حج کی نیت سے مکے کا سفر اکیلی کرے گی۔ اسے خدا کے علاوہ کسی سے ڈر نہیں ہو گا۔ (بخاری، مسلم)

اس حدیث میں نہ صرف اس بات کی پیشین گوئی ہے کہ ایسا واقعہ وقوع پذیر ہو گا بلکہ سفر پُرامن ہونے کی صورت میں اکیلی عورت کے سفر پر نکلنے کے جواز کی بھی دلیل ہے، کیوں کہ حضور ﷺ نے اس واقعے کی پیشین گوئی تعریف اور مدح کے صیغے میں فرمائی ہے۔

یہاں میں دو نکات کا ذکر کرتا ہوں۔

۱- عبادات اور معاملات میں فرق یہ ہے کہ معاملات کے سلسلے میں جو اسلامی احکام ہیں ان کی روح اور ان مقاصد پر نظر رہنی چاہیے جن کی وجہ سے یہ احکام دیئے گئے۔ برخلاف عبادات کے، کیوں کہ عبادات کی روح یہ ہے کہ انہیں ویسے ہی بجالایا جائے جیسے حکم دیا گیا ہے چاہے ان کے مقاصد اور حکمت وعلّت سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں۔

۲- دوسرا فائدہ یہ ہے کہ جو چیز فی نفسہٖ حرام قرار دی گئی ہے، وہ کبھی حلال نہیں ہو سکتی۔ سوائے اس کے کہ کسی وقت شدید ضرورت پیش آجائے۔ مثلاً سوٗر کا گوشت ہمیشہ حرام رہے گا تاہم جان پر بنی ہو تو اس کا گوشت جان بچانے کے لئے کھایا جا سکتا ہے۔ البتہ وہ چیز جو کسی خرابی یا فساد کو دور کرنے یا اس سے بچنے کے لئے حرام کی گئی ہو ضرورت پڑنے پر وہ چیز حلال بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اکیلی عورت کا سفر اس لئے حرام ہے، کہ اس کی عزت کے لئے کوئی خطرہ نہ ہو۔ اس لئے اگر اکیلی سفر کرنے کے باوجود عورت اپنی عزت کو محفوظ رکھ سکتی ہے تو اس کا اکیلی سفر کرنا جائز ہے۔

حج کے لئے پیدل سفر کرنا

سوال: ہوائی جہاز یا کار وغیرہ سے حج کے لئے سفر کرنا زیادہ افضل ہے یا پیدل سفر کرنا۔ کچھ لوگ پاکستان ۔ سے پیدل ہی آئے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ پیدل سفر کرنے کی وجہ سے انہیں زیادہ ثواب ملے گا۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟

جواب: عبادات میں زیادہ ثواب ملنے کا انحصار صرف محنت اور مشقت پر نہیں ہے' بلکہ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ عبادت خالصتہً اللہ کے لئے کی جائے اور اس طریقے سے کی جائے جو قرآن وسنت میں بیان ہوا ہے۔ اور یہ کہ عبادت کے ارکان وآداب کا پورا خیال رکھا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان چیزوں کے بعد محنت ومشقت کا بھی ثواب کی زیادتی میں دخل ہے۔

تصور کریں کہ کسی شخص کا گھر مسجد کے پاس ہی ہے۔ لیکن وہ مسجد تک پہنچنے کے لئے خواہ مخواہ لمبے راستے طے کرتا ہے تاکہ اسے زیادہ ثواب ملے۔ کیا شریعت کی نظر میں اس کا ایسا کرنا قابلِ تعریف ہے؟ ہرگز نہیں۔ البتہ اگر اس کا گھر مسجد سے کافی دور ہو اور وہ لمبی مسافت طے کر کے مسجد آئے تو اس مشقت کے لئے یقیناً اسے زیادہ ثواب ملے گا۔

اسی طرح ہوائی جہاز اور کار وغیرہ کی سہولت موجود ہوتے ہوئے اگر کوئی شخص پیدل حج کے لئے روانہ ہوتا ہے تو اس غیر ضروری مشقت کی وجہ سے وہ ہرگز زیادہ ثواب کا حقدار نہیں ہوگا بلکہ اس کے برعکس اس کا یہ عمل شریعت کی نظر میں سرے سے قابلِ تعریف نہیں ہے۔ البتہ زیادہ ثواب کا حقدار اس صورت میں ہوگا کہ ہوائی جہاز کے ٹکٹ کے پیسے نہ ہوں یا کار وغیرہ کی سہولت نہ ہو اور حج کے لئے پیدل ہی روانہ ہو جائے۔

بچپن کا حج

سوال: کیا سنِ بلوغ سے قبل حج کرنے سے فرض حج ادا ہو جائے گا؟ اس سن میں اگر کسی نے حج کیا اور اس کے بعد گناہ کی زندگی گزاری تو کیا اس کا حج باطل ہو جائے گا؟

اور اسے دوبارہ حج کرنا ہوگا؟

جواب: سنِ بلوغ سے قبل حج کرنے سے حج کی فرضیت ساقط نہیں ہوتی۔ حج کی فرضیت اسی وقت ساقط ہوتی ہے، جب اسے سنِ بلوغ کے بعدادا کیا جائے۔

حج کی ادائیگی کے بعد بھی کوئی شخص بُرے کاموں میں ملوث رہا تو اس سے اس کا حج باطل نہیں ہوگا۔ کیوں کہ بُرے کاموں کی وجہ سے اچھے اور نیک اعمال رائیگاں نہیں ہوتے۔ البتہ ان کے ثواب میں کمی ضرور ہو جاتی ہے۔ قیامت کے دن ہر شخص کے سامنے اس کے چھوٹے بڑے، اچھے اور بُرے سارے اعمال پیش کیے جائیں گے اور انہیں اعمال کی بنیاد پر اس کا حساب وکتاب ہوگا۔ فرمان الٰہی ہے:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (الزلزال: ۷،۸)

جو کوئی ذرّہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا اور جوئی ذرّہ برابر بدی کرے وہ اس کو دیکھ لے گا۔

بہرحال، بندۂ مومن سے یہی امید کی جاتی ہے کہ حج کا اثر اس کے اعمال میں ظاہر ہو۔ اپنی گزشتہ زندگی میں جن بُرے کاموں میں وہ ملوث رہا، ان سے سچی توبہ کرے اور آئندہ زندگی اللہ کی اطاعت میں گزارنے کا پکا ارادہ کرے اور اس کے لئے پوری کوشش کرے۔ اللہ سے اپنے رشتے کو مضبوط کرے۔ اور یہی وہ حج مبرور ہے جس کا صلہ جنت ہے۔

اگر صاحبِ سوال نے سنِ بلوغ سے پہلے حج کیا ہے، تو انہیں اب دوبارہ حج کرنا چاہئے تاکہ فرضیت ساقط ہو جائے۔ البتہ پہلے حج کا ثواب انہیں ضرور ملے گا۔

حجرِ اسود

سوال: ایک کتابچہ ہمارے سامنے ہے جس میں صاحب مقالہ نے حجرِ اسود کے سلسلہ میں کلام کیا ہے۔ صاحب مقالہ نے ان تمام احادیث کو ماننے سے انکار کر دیا جو حجرِ

اسود کو بوسہ دینے اور اسے لمس کرنے کے سلسلے میں وارد ہوئی ہیں۔ محض اس بنیاد پر کہ حجرِ اسود کو بوسہ دینا عقیدۂ توحید کے خلاف ہے اور اس میں پتھروں کو پوجنے سے مشابہت ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: اس عہد میں ہمارے بعض اہلِ علم کا سطحی مطالعہ ایک بڑی مصیبت ہے۔ علم اور تجربے میں پختہ ہونے سے قبل اور کسی جیّد عالم کی طرف رجوع کیے بغیر فتوے بازی اسی سطحی مطالعے کی دَین ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ دین کے معاملے میں شک پیدا کرنے والے یا تو جاہل لوگ ہوتے ہیں یا ایسے اہلِ علم لوگ جن کے اذہان میں کچھ خاص باتیں بیٹھ جاتی ہیں۔ حجرِ اسود کو بوسہ دینا اور اس جیسے دوسرے مسائل میں شک وشبہ پیدا کرنا اور اس سلسلہ میں وارد احادیث کو جھٹلانا واضح گمراہی اور علمِ حدیث سے ناواقفیت ہے۔

علمِ حدیث کے چند قواعد اور اصول ہیں۔ علماءِ حدیث نے یہ اصول اسی لئے وضع کیے ہیں تاکہ صحیح اور ضعیف کے درمیان تمیز کی جا سکے۔ گھڑی ہوئی حدیثوں کی نشاندہی کی جا سکے۔ اس راہ میں علماءِ حدیث نے جو قابلِ قدر کارنامے انجام دیئے ہیں اور جتنی محنت کی ہے، اس سے کوئی بے خبر نہیں ہے۔

ذیل میں، میں حجرِ اسود کو بوسہ دینے کے سلسلے میں چند صحیح احادیث کا تذکرہ کرتا ہوں۔

بخاری شریف کی حدیث ہے کہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہ سے حجرِ اسود کو بوسہ دینے کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ ابنِ عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسے لمس کرتے اور بوسہ دیتے ہوئے دیکھا ہے۔

بخاری اور مسلم کی حدیث ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حجرِ اسود کو بوسہ دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ میں جانتا ہوں کہ تو محض ایک پتھر ہے۔ نفع ونقصان تیرے بس میں نہیں۔ اگر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے نہ دیکھتا تو میں کبھی تجھے بوسہ نہ

دیتا۔

امام طبری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسا اس لئے کہا تھا کہ لوگ ابھی ابھی جہالت اور پتھروں کو پوجنے کے دور سے نکلے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر لوگوں پر واضح کر دیا کہ حجرِ اسود کو بوسہ دینا صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں ہے۔ پتھروں کی تعظیم و تکریم کی خاطر نہیں۔

یہ وہ احادیث ہیں جن کے صحیح ہونے پر تمام علماء اُمت کا اتفاق و اجماع ہے۔ مزید برآں حجرِ اسود کو بوسہ دینا ایک ایسی سنت ہے، جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے آج تک ہر دور میں عمل ہوتا آیا ہے اور آج تک کسی نے بھی اس سلسلے میں کسی شک و شبہ کا اظہار نہیں کیا۔ گویا تمام اُمتِ مسلمہ کا اس پر اِجماع و اتفاق ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ میری اُمت کسی گمراہی پر متفق نہیں ہوسکتی ہے۔ گویا پوری اُمت کا کسی بات پر متفق ہونا ہی اس بات کے صحیح ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

اس مسئلے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسلام میں بہت سارے اعمال ایسے ہیں، جن کا تعلّق ایمان بالغیب سے ہے۔ جنہیں ہم ''امر تعبدی'' بھی کہتے ہیں یعنی وہ عبادات یا عمل جسے ہم محض اس لئے ادا کرتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے خواہ اس کی حکمت ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ ان تعبدی عبادات اور اعمال کی ایک بڑی حکمت یہ ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے اپنے بندوں کو آزماتا ہے کہ کون اللہ کے احکام کا تابع ہے اور کون اپنی عقل کے تابع ہے۔ حجرِ اسود کا بوسہ لینا بھی امر تعبدی ہے۔

ذرا غور کریں، حجرِ اسود کا بوسہ لینا کیوں کر پتھروں کو پوجنے کے مشابہ ہوسکتا ہے جب کہ حج کے دوران ہم جو کچھ کرتے ہیں اور جہاں جہاں جاتے ہیں وہاں ابراہیم علیہ السلام کا نام اور ان کی یاد وابستہ ہوتی ہے اور یہ ابراہیم علیہ السلام کون تھے؟ یہ وہ تھے جنہوں نے ایک کلہاڑی سے پتھروں کی تمام مورتیوں کو مسمار کر ڈالا تھا۔

کس پتھر سے تبرک حاصل کرنا شرک ہے؟

سوال: مصر میں طنطا شہر میں ایک ایسا پتھر ہے جس میں لوگوں کے کہنے کے مطابق حضور ﷺ کے قدموں کے نشان ہیں۔ لوگ یہاں آتے ہیں' اسے چھوتے ہیں، چومتے اور تبرک حاصل کرتے ہیں اور اپنی ضرورتیں مانگتے ہیں۔ کیا واقعی اس پتھر میں حضور ﷺ کے قدموں کے نشان ہیں؟ کیا اس سے تبرک حاصل کرنا جائز ہے؟

جواب: مسلمانوں کو جس چیز نے تباہ و برباد کر ڈالا' وہ ان کا اِفراط و تفریط میں مبتلا ہونا ہے۔ بعض اِفراط کا شکار ہیں اور ان کا عقیدہ اس قدر کمزور ہوتا ہے کہ خرافات پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ پتھروں اور آثارِ قدیمہ سے تبرک حاصل کرتے ہیں جس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اور بعض مسلمان تفریط کا شکار ہیں کہ عقیدہ اور غیب سے متعلق کسی بات پر مشکل ہی سے کان دھرتے ہیں۔ حتیٰ کہ حجرِ اسود سے متعلق بھی شک و شبہ میں مبتلا ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام اِفراط و تفریط کے درمیان ایک دینِ وَسط ہے۔ اسلام نے تمام قسم کے پتھروں سے تبرک حاصل کرنے کو باطل قرار دیا ہے۔ صرف حجرِ اسود اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔ چنانچہ وہ پتھر جس کا آپ نے تذکرہ کیا ہے، وہ بھی انہی پتھروں میں شامل ہے۔ اس پتھر کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں ہے۔ اس بات کی کوئی سند اور دلیل نہیں ہے کہ اس پتھر پر حضور ﷺ کے قدم پڑے تھے اور یہ آپ ﷺ کے قدموں کے نشان ہیں۔

اگر فرض بھی کر لیں کہ اس پر واقعی حضور ﷺ کے قدموں کے نشان ہیں تو حضور ﷺ نے کبھی اپنی اُمت کو اس بات کا حکم نہیں دیا کہ وہ ان کے قدموں کے نشان کو لمس کریں۔ انہیں مقدس سمجھ کر ان سے تبرک حاصل کریں۔ اس کے برعکس آپ ﷺ نے ہر اس فعل سے منع فرمایا ہے، جس میں تعظیم و تکریم میں غلو اور تقدس کا پہلو نمایاں ہونے لگے۔ چنانچہ آپ ﷺ کا حکم ہے کہ:

لَا تَتَّخِذُوا قَبْرِیْ عِیْدًا۔

میری قبر کو تم جشن کی جگہ مت بناؤ۔

دوسری حدیث ہے:

لَا تَتَّخِذُوا قَبْرِیْ وَثْنًا یُّعْبَدُ۔

میری قبر کو بت کی مانند نہ بناؤ جس کی پوجا کی جائے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی اسی سنت پر ہمیشہ عمل کیا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رضوان کے اس مشہور درخت کو کٹوا ڈالا تھا جس کے نیچے مسلمانوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں پر بیعت کی تھی۔ اس لئے کہ انہوں نے دیکھا کہ لوگ اس درخت کے پاس تبرک حاصل کرنے کے لئے جانے لگے ہیں۔

حج بدل کرنا

سوال: میرے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ انہوں نے فریضۂ حج ادا نہیں کیا تھا۔ کیا میں ان کے بدلے حج ادا کر سکتا ہوں؟

جواب: عبادات اور خاص کر جسمانی عبادتوں میں' ہونا تو یہی چاہئے کہ انسان خود ہی اسے انجام دے۔ لیکن اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو سکا ہو تو اس کے بعد اس کی اولاد، اس کی طرف سے یہ فرض انجام دے سکتی ہے۔ کیوں کہ اولاد والدین کے وجود کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ اَوْلَادَکُم مِّنْ کَسْبِکُمْ۔

بے شک تمہاری اولاد تمہاری اپنی کمائی ہے۔

کسی بھی شخص کا عمل' اس کی موت پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ تاہم اس کی اولاد اس عمل کو آگے بڑھا سکتی ہے۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِذَا مَاتَ ابْنُ آدَمَ انْقَطَعَ عَمَلُہٗ اِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ صَدَقَۃٌ جَارِیَۃٌ اَوْ عِلْمٌ یُنْتَفَعُ بِہٖ اَوْ وَلَدٌ صَالِحٌ یَدْعُوْ بِہٖ۔ (بخاری، مسلم)

جب کوئی آدمی مرتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، سوائے تین

چیزوں کے، اس نے کوئی صدقہ جاریہ کیا ہو، کوئی علمی کام کیا ہو جو لوگوں کے لئے نفع بخش ہو یا صالح اولاد، جو اس کے لئے دعا کرتی ہو۔

معلوم ہوا کہ صالح اولاد اپنے والدین کی عملی زندگی کے سلسلے کو آگے بڑھا سکتی ہے۔ اس لئے اگر والدین کوئی کام ادھورا چھوڑ جائیں یا کوئی فرض ان سے رہ گیا ہو تو اولاد کو چاہئے کہ ان کی طرف سے وہ فرض انجام دیں۔ خود نہیں کر سکتے تو کسی اور سے یہ کام کرائیں۔

حدیث میں ہے کہ ایک عورت نے حضور ﷺ سے سوال کیا کہ اس کے والدین نہایت ضعیف ہیں اور حج نہیں کر سکتے تو کیا وہ ان کی طرف سے حج کر لے؟ آپ ﷺ نے فرمایا بے شک کر لو۔

ایک دوسری عورت نے سوال کیا کہ اس کی ماں نے حج کی منت مانی تھی لیکن وہ اس کی ادائیگی سے قبل ہی مرگئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اس کے بدلے حج کر لو۔ فرض کرو تمہاری ماں کسی کی مقروض ہوتی تو کیا تم اس کا قرض نہ چکاتیں؟ اللہ کا قرض تو سب سے پہلے چکانا چاہئے۔

ایک بات ذہن میں رہے کہ جو شخص اپنے والدین یا کسی اور کے بدلے میں حج کر رہا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے وہ اپنا حج ادا کرے۔

☆☆☆☆☆

آٹھواں باب

تیوہار اور عید

شب برأت کی حقیقت

سوال: شعبان کی پندرہویں تاریخ یعنی شب برأت کے موقع پر لوگ مسجدوں میں اکٹھے ہو کر نمازوں اور دعاؤں کا اہتمام کرتے ہیں' اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا اس سلسلے میں صحیح احادیث موجود ہیں؟

جواب: شب برأت کی فضیلت کے سلسلے میں ایک بھی حدیث ایسی نہیں ہے، جسے صحیح قرار دیا جا سکے۔ البتہ چند احادیث کے بارے میں علماءِ حدیث نے کہا ہے کہ یہ صحیح تو نہیں ہیں' البتہ حسن کے درجے میں ہیں۔ لیکن بعض علماء انہیں حسن بھی نہیں قرار دیتے۔ ان کے نزدیک شب برأت کے سلسلے میں وارد تمام حدیثیں ضعیف ہیں۔

بالفرض اگر ہم ان چند احادیث کو حسن بھی تسلیم کر لیں، تب بھی حضور ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلفِ صالحین رحمۃ اللہ علیہم سے یہ روایت نہیں ملتی کہ انہوں نے شب برأت کے موقعے پر مسجدوں میں جمع ہو کر نمازوں اور دعاؤں کا اہتمام کیا ہو۔ جو کچھ ان روایتوں میں ہے، وہ یہ کہ حضور ﷺ نے اس رات دعا مانگی اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کی۔ کوئی خاص اور متعیّن قسم کی دعا حضور ﷺ سے وارد نہیں ہے۔ لوگ اس رات کچھ خاص دعاؤں کا اہتمام کرتے ہیں، ان کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب میں بہت چھوٹا تھا تو لوگوں کی دیکھا دیکھی میں بھی اس رات نمازیں پڑھتا تھا اور دو رکعت درازیٔ عمر کی نیّت سے، دو رکعت لوگوں سے بے نیازی کی نیت سے نمازیں پڑھتا تھا۔

سورہ یٰسین کی قرأت کا خاص اہتمام کرتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ چیزیں ایسی ہیں کہ حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ان پر عمل منقول نہیں ہے، عبادت کے معاملے میں یہ قاعدہ کلّیہ ہے کہ ہم اسی چیز پر توقف کریں جو حضور ﷺ سے منقول ہے۔ اپنی طرف سے کسی نئی چیز کی ایجاد کسی بھی طور پر جائز نہیں ہے۔ علماءِ کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عبادات جنہیں اصطلاحاً امرِ تعبدی بھی کہتے ہیں ان کے ادا کرنے میں اسی وقت ثواب ہوتا ہے جب یہ عین خدا اور اس کے رسول کے فرمان کے مطابق ہوں نہ زیادہ نہ کم۔ کیوں کہ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہوتی ہے اور یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے کہ وہ کس طرح اپنی عبادت کروائے۔ اس نے جس طرح عبادت کا حکم دے دیا ہے' ہمیں چاہئے کہ ہم اسی طریقے سے عبادت کریں۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے بارے میں ناراضی کا اظہار کرتا ہے، جو عبادات میں اپنی طرف سے نئی چیزیں ایجاد کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَمْ لَهُمْ شُرَكَاؤُا شَرَعُوا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللّٰهُ ط

(شوریٰ:۲۱)

کیا یہ لوگ خدا کے کچھ ایسے شریک رکھتے ہی جنہوں نے ان کے لئے دین کی نوعیت رکھنے والا ایسا طریقہ مقرر کر دیا ہے۔ جس کا حکم اللہ نے نہیں دیا تھا۔

ہمیں چاہئے کہ اس رات کو ہم صرف اتنا ہی کریں جتنا حضور ﷺ سے مروی ہے اور وہی دعائیں مانگیں جو حضور ﷺ سے ماثور ہیں۔

ماہِ رجب کی فضیلت

سوال: جمعے کے خطبوں کے موقع پر اکثر ہم ماہِ رجب کی فضیلت کے سلسلے میں مختلف احادیث سنتے ہیں اور یہ کہ اللہ نے اس شخص کے لئے اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے جو اس مہینے میں خواہ ایک دن ہی سہی روزہ رکھے۔ (۱) ان حدیثوں میں سے ایک حدیث جو

اکثر سننے میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ”رجب اللہ کا مہینہ ہے۔شعبان میرا مہینہ ہے اور رمضان میری اُمت کا مہینہ ہے۔“ان احادیث کے سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا یہ صحیح ہیں؟

جواب: صحیح احادیث میں اس مہینے کی فضیلت سے متعلق جو کچھ آیا ہے وہ یہ کہ یہ مہینہ چار حرام مہینوں میں سے ایک ہے۔ چار حرام مہینے یہ ہیں: رجب، ذوالقعد، ذوالحجہ اور محرم۔ اور بے شبہ یہ چاروں مہینے اہمیت وفضیلت کے حامل ہیں۔کوئی ایسی صحیح حدیث نہیں ہے جس میں خاص طور پر صرف ماہِ رجب کی فضیلت بیان کی گئی ہو۔ رہی وہ حدیث جس کا تذکرہ آپ نے کیا ہے یعنی ”رجب اللہ کا مہینہ ہے۔شعبان میرا مہینہ اور رمضان میری اُمت کا مہینہ ہے“ تو یہ حدیث نہ صرف ضعیف ہے‘ بلکہ علماءِ حدیث نے اسے موضوع یعنی گھڑی ہوئی قرار دیا ہے۔اسی طرح ہر وہ حدیث جو اس مہینے کی فضیلت کے سلسلے میں مروی ہے کہ جس نے اس مہینے میں نماز پڑھی یا روزہ رکھا یا استغفار کیا تو اسے یہ اجر ملے گا اور وہ اجر ملے گا، یہ سب گھڑی ہوئی احادیث ہیں ان کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ ان احادیث کے بے سند ہونے کی ایک بڑی علامت یہ ہے کہ ان میں مبالغے کی حد تک ثواب یا عذاب کا وعدہ ہوتا ہے۔علماءِ کرام کہتے ہیں کہ اگر کسی چھوٹی نیکی پر عظیم اجر کا وعدہ ہو یا کسی چھوٹے گناہ پر بڑے عذاب کی دھمکی ہو تو یہ علامت ہے اس بات کی کہ یہ حدیث گھڑی ہوئی ہے۔ ماہِ رجب سے متعلق وارد احادیث بھی اسی قبیل سے ہیں۔

علماء وخطباء کا فرض ہے کہ وہ عوام النّاس کو ان موضوع اور گھڑی ہوئی احادیث سے متنبہ کریں۔ کسی حدیث کو بیان کرنے سے قبل خود انہیں بھی اس حدیث کے صحیح ،ضعیف یا موضوع ہونے کا علم ہونا چاہیئے۔ اس سلسلے میں حدیث کی متعدّد کتابوں سے مدد لے سکتے ہیں۔خاص کر ان کتابوں سے جو موضوع احادیث کے سلسلے میں تصنیف کی گئی ہیں۔

امت مسلمہ کی یہ بدقسمتی ہے کہ ضعیف اور موضوع احادیث کے سہارے بہت

ساری ایسی روایات ہماری ثقافت کا حصہ بن گئی ہیں جن کا دینِ اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مزید مصیبت کی بات یہ ہے کہ یہی غلط روایات اہم تر ہو کر لوگوں کی توجہ اور اہتمام کا مرکز بن گئی ہیں۔ اور جو بنیادی اسلامی تعلیمات وروایات ہیں' انہیں یا تو لوگوں نے بھلا رکھا ہے یا پھر انہیں ثانوی حیثیت دے عطا رکھی ہے۔ ہماری بہتری اور بھلائی اسی میں ہے کہ ہم رسول ﷺ اور ان کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتباع کریں اور جو باتیں بعد کے زمانوں میں غلط طور پر ترویج پا چکی ہیں ان سے اپنے دامن کو بچائے رکھیں۔

رہی بات اس مہینے میں روزہ رکھنے کی تو کوئی ایسی روایت نہیں ہے کہ حضور ﷺ نے رمضان کے علاوہ کسی دوسرے مہینے میں پورے مہینے کے روزے رکھے ہوں۔ بعض لوگ پورے رجب، شعبان اور رمضان اور اس کے علاوہ شوال کے چھ دن روزے رکھتے ہیں۔ صرف یکم شوال کے علاوہ۔ اس طرح کا روزہ رکھنا حضور ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔ جو شخص نیکی اور اجر کا طالب ہے اسے چاہئے کہ رسوم کو چھوڑ کر حضور ﷺ کا اتباع کرے۔ اسی میں اس کی بھلائی ہے۔

یوم عرفہ کا روزہ

سوال: عرفہ کے دن روزہ رکھنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب: یوم عرفہ سال کے افضل ترین دنوں میں سے ہے۔ اس کی فضیلت کے سلسلے میں متعدد احادیث حضور ﷺ سے مروی ہیں۔ حضور ﷺ نے اس دن روزہ رکھنے کی تاکید بھی فرمائی ہے اور اس کی بڑی فضیلت بیان کی ہے۔ حدیث ہے:

صِیَامُ یَوْمِ عَرَفَةَ اَحْتَسِبُ عَلَی اللّٰہِ تَعَالٰی اَنْ یُّکَفِّرَ ذُنُوْبَ سَنَتَیْنِ۔

میں اللہ تعالیٰ سے امید کرتا ہوں کہ یوم عرفہ کا روزہ دو سال کے گناہوں کو معاف کر دے گا۔

ہم میں سے کون ایسا ہے جو گناہوں سے پاک ہے اور اس سے خطائیں نہیں

ہوتیں۔ ہر مسلمان کو چاہئے کہ یومِ عرفہ سے پہلے آٹھ روزے اگر نہیں رکھ سکتا تو کم از کم عرفہ کے دن ضرور روزہ رکھے اور اس کا اہتمام کرے۔ البتہ حاجیوں کے لئے یہ روزہ رکھنا مسنون نہیں ہے، تاکہ خالی پیٹ ذکر و عبادت میں خلل نہ ہو۔

مسئلہ قربانی

سوال: قربانی کا شرعی حکم کیا ہے؟ قربانی کب کرنی چاہئے؟ اگر کوئی صاحبِ حیثیت شخص قربانی نہ کرے تو اس کے لئے کیا حکم ہے؟ اور قربانی کے گوشت کی تقسیم کس طرح ہوگی؟

جواب: جمہور فقہاء کے نزدیک قربانی سنّتِ مؤکدہ ہے۔ جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قربانی کرنا واجب ہے۔ احناف کے یہاں واجب۔ فرض اور سنّت کے درمیان ہے۔ اور واجب کا ترک کرنے والا گناہ گار ہوتا ہے۔

حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

مَنْ كَانَ لَهُ سَعَةٌ وَلَمْ يُضَحِّ فَلَا يَقْرُبَنَّ مُصَلَّانَا۔ (حاکم عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ)

جو صاحبِ حیثیت ہے اور قربانی نہ کرے تو وہ ہماری عیدگاہ کے قریب نہ آئے۔

ایک دوسری حدیث ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے قربانی کے بارے میں دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

سُنَّةُ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ۔ (ترمذی، حاکم)

تمہارے باپ ابراہیم کی سنّت ہے۔

ان دونوں حدیثوں کی بنیاد پر کسی نے قربانی کو صاحبِ حیثیت کے لئے واجب قرار دیا اور کسی نے سنّت قرار دیا۔ جنہوں نے اسے سنّت قرار دیا ہے، ان کے نزدیک صاحبِ حیثیت کا قربانی نہ کرنا مکروہ ہے۔

قربانی کا وقت عید کی نماز کے بعد شروع ہوتا ہے۔ عید کی نماز سے قبل قربانی کرنا

جائز نہیں ہے۔ اگر پہلے دن قربانی کرنا ممکن نہ ہو تو دوسرے اور تیسرے دن بھی کی جاسکتی ہے۔

قربانی کا گوشت تین حصوں میں تقسیم کرنا چاہئے۔ ایک حصہ اپنے لئے، دوسرا پڑوسیوں کے لئے اور تیسرا حصہ فقراء و مساکین کے لئے۔ اگر سارا کا سارا گوشت پڑوسیوں اور غریبوں میں تقسیم کردے تو یہ اور بھی بہتر ہے۔ البتہ تھوڑا بہت گوشت بطورِ برکت خود بھی کھانا چاہئے۔

بے شبہ قربانی ایک عبادت ہے اور جیسا کہ ہم نے متعدّد مقام پر کہا ہے کہ عبادت کے لئے ضروری ہے کہ اسی طریقے اور وقت پر ادا کی جائے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے متعیّن کردیا۔ قربانی بھی ایک عبادت ہے۔ اس کا بھی ایک وقت اور طریقہ متعیّن ہے۔ اس لئے ہمیں چاہئے کہ اس طریقہ اور وقت کا پورا پورا خیال رکھیں۔

قربانی سے متعلق چند دوسرے سوالات

سوال: قربانی کا وقت کون سا ہے؟ کس جانور کی قربانی کی جاسکتی ہے؟ گھر کے ہر فرد کی طرف سے ایک ایک قربانی ضروری ہے یا ایک قربانی تمام گھر والوں کی طرف سے کافی ہے؟ قربانی کرنا زیادہ افضل ہے یا قربانی کے پیسے کو صدقہ کردینا۔

جواب: قربانی حضور ﷺ کی سنّت مؤکدہ ہے۔ نبی ﷺ نے اپنی اور اپنے گھر والوں کی طرف سے دو تندرست مینڈھے ذبح کئے تھے اور فرمایا تھا کہ ''اے اللہ یہ میری طرف سے، میرے گھر والوں کی طرف سے اور میری اُمت میں سے جن لوگوں نے قربانی نہیں کی، ان لوگوں کی طرف سے ہے۔''

قربانی کا وقت عید کی نماز کے فوراً بعد شروع ہو جاتا ہے۔ اس سے قبل قربانی کرنا جائز نہیں۔ اس سے قبل جو قربانی ہوگی اس کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا:

شَاتُهٗ شَاةُ لَحْمٍ۔

اس کی بکری گوشت کھانے کی بکری ہے۔

یعنی ایسی بکری محض گوشت کھانے کے لئے ہے۔ یہ قربانی تصور نہیں کی جائے گی۔
قربانی ایک عبادت ہے۔ نماز کی طرح۔ جس طرح نماز کا وقت معین ہے اسی طرح قربانی کا وقت معین ہے۔ جس طرح ظہر کی نماز وقت سے قبل نہیں پڑھی جاسکتی' اسی طرح وقت سے قبل قربانی بھی نہیں ہوسکتی۔

قربانی کا وقت عید کی نماز کے بعد سے شروع ہو کر عید کے تیسرے دن اور بعض فقہاء کے نزدیک عید کے چوتھے دن تک رہتا ہے۔ قربانی کا افضل وقت زوال تک ہے۔ زوال تک قربانی نہ کی تو دوسرے دن قربانی کرنی چاہئے۔ بعض فقہاء کے نزدیک رات اور دن میں کسی بھی وقت قربانی کرنا صحیح ہے۔ میری رائے میں بہتر یہ ہوگا کہ ایک ہی دن سارے لوگ قربانی نہ کریں' تاکہ ایک دم سے ضرورت سے زائد گوشت نہ جمع ہو جائے، بلکہ کچھ لوگ دوسرے دن اور کچھ تیسرے دن قربانی کریں' تاکہ غریبوں کو ہر دن گوشت ملتا رہے۔

قربانی میں اونٹ، گائے (۲) اور بکرے کی قربانی کی جاسکتی ہے۔ کیوں کہ یہ جانور چوپایوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کی قربانی کی جاسکتی ہے۔ ایک بکرا ایک گھر والوں کی طرف سے کافی ہے۔ اونٹ اور گائے میں سات حصے لگائے جائیں گے اور ہر ایک حصہ ایک مستقل قربانی تصور کی جائے گی اور ایک گھر والوں کی طرف سے کافی ہے۔ شرط یہ ہے کہ اونٹ پانچ سال سے کم کا نہ ہو۔ گائے دو سال سے کم کی نہ ہو اور بکرا ایک سال سے کم کا نہ ہو۔ قربانی کا جانور جتنا صحت مند اور تگڑا ہو' اسی قدر افضل ہے' کیوں کہ قربانی اللہ کی خدمت میں ہدیہ ہے اور مسلمان کو چاہئے کہ بہتر سے بہتر ہدیہ اللہ کی خدمت میں پیش کرے۔ اسی لئے لاغر، لنگڑا، اندھا، کانا، ٹوٹے سینگ والا، کٹے کانوں والا یا کسی قسم کے عیب والا جانور قربانی کے لئے جائز نہیں ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ قربانی زیادہ افضل ہے یا قربانی کے روپے کو صدقہ کرنا۔ تو میری رائے یہ ہے کہ بے شبہ قربانی کرنا زیادہ افضل ہے۔ کیوں کہ قربانی ایک عبادت ہے جس کا

مقصد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت کو برقرار اور زندہ رکھنا ہے۔ یہ عبادت ہمیشہ اس عظیم الشان واقعے کی یاد دلاتی رہتی ہے جب ابراہیم علیہ السلام اپنے جگر کے ٹکڑے کو اپنے رب کے حکم کی تعمیل میں اسی کی بارگاہ میں قربانی کرنے چلے تھے۔ اپنے رب سے محبت کی یہ ایسی مثال ہے جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے پیارے بندے کو اس کا یہ صلہ دیا کہ اس کے اس فعل کو قیامت تک کے لئے یادگار بنا دیا۔ ہر قوم اپنے اہم دن مثلاً آزادی کا دن یا جنگ میں فتح کا دن وغیرہ کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ہر سال اس کا جشن مناتی ہے۔ ہمیں بھی چاہئے کہ قربانی کر کے اس عظیم الشان واقعے کی یاد تازہ رکھیں۔ اس لئے قربانی کرنا قربانی کی قیمت کو صدقہ کرنے کے مقابلے میں زیادہ افضل اور احسن ہے۔

البتہ اگر قربانی کسی میت کی طرف سے کی جا رہی ہے تو میری رائے یہ ہے کہ اگر قربانی کسی ایسے علاقے میں کی جائے جہاں لوگوں کو گوشت کی زیادہ ضرورت ہے تو وہاں قربانی کرنا زیادہ افضل ہے اور اگر قربانی کسی ایسے علاقے میں کی جائے، جہاں پہلے سے کافی گوشت موجود ہو اور لوگوں کو پیسوں کی زیادہ ضرورت ہو تو وہاں قربانی کی قیمت کو صدقہ کرنا زیادہ افضل ہے۔

گھر کے تمام افراد کی طرف سے صرف ایک قربانی کا جانور کافی ہے۔ کیوں کہ نبی ﷺ نے جب قربانی کی تو فرمایا کہ اے اللہ یہ محمد اور اس کے گھر والوں کی طرف سے ہے۔ ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے زمانے میں ہم میں سے ہر شخص اپنی اور اپنے گھر والوں کی طرف سے صرف ایک بکری ذبح کرتا تھا۔ لیکن اس کے بعد لوگوں نے فخر و مباحات کے لئے زیادہ قربانیاں کرنی شروع کر دیں جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو۔

بقرعید کے چاند کے بعد بال یا ناخن کٹوانا

سوال: کیا بقرعید کا چاند دیکھنے کے بعد اس شخص کے لئے ناخن یا بال کٹوانا جائز

ہے جو قربانی کرنا چاہتا ہو؟

جواب: حنبلی مسلک کے مطابق قربانی کرنے والے شخص کے لئے چاند دیکھنے کے بعد بال یا ناخن کٹوانا جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ حُجاج کرام احرام کی حالت میں یہ چیزیں نہیں کٹواتے۔ اس لئے اس کیفیت کو زندہ رکھنے کے لئے قربانی کرنے والے کو بھی یہ چیزیں نہیں کٹوانی چاہئیں۔

البتہ راجح قول یہ ہے کہ ایسا کرنا صرف مکروہ ہے۔ اگر کسی نے ناخن کٹوائے یا بال بنوا لئے تو اس پر کوئی فدیہ نہیں ہے۔ اسے چاہئے کہ اللہ سے مغفرت طلب کرے اور بس۔ اگر کسی شخص کو زیادہ دن تک ناخن یا بال چھوڑنے سے تکلیف ہوتی ہو اور اس نے یہ چیزیں کٹوالیں تو کوئی حرج کی بات نہیں۔

یوم عاشورا کا روزہ

سوال: یوم عاشورا کے روزے سے کیا پورے سال کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں یا صرف چھوٹے گناہ بخشے جاتے ہیں یا گناہِ کبیرہ بھی بخش دیئے جاتے ہیں؟

جواب: یوم عاشورا کے روزے کی فضیلت کے سلسلے میں متعدد صحیح احادیث وارد ہوئی ہیں۔ مسلم شریف کی حدیث ہے:

صَوْمُ يَوْمِ عَرَفَةَ يُكَفِّرُ سَنَتَيْنِ مَاضِيَةً مُسْتَقْبِلَةً وَصَوْمُ يَوْمِ عَاشُوْرَآءَ يُكَفِّرُ سَنَةً مَاضِيَةً۝

یوم عرفہ کا روزہ دو سال، ایک پچھلا اور ایک اگلا سال، کے گناہوں کو دھو ڈالتا ہے۔ عاشورہ کا روزہ گزرے ہوئے ایک سال کے گناہوں کو دھو ڈالتا ہے۔

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ عاشورا کا روزہ پچھلے پورے سال کے گناہوں کا کفارہ ہے۔ ہم میں سے کون ہے جو اس بات کا دعویٰ کر سکے کہ اس سے گناہ سرزد نہیں ہوتے۔ ہم مسلمانوں پر یہ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ مختلف بہانوں سے ہمارے گناہوں کی معافی کا

دروازہ کھول رکھا ہے۔ بلکہ یوں کہنا بہتر ہوگا کہ تمام نیکیاں نہ صرف باعثِ ثواب ہوتی ہیں' بلکہ گناہوں کو دھونے والی بھی ہوتی ہیں۔قرآن میں ہے:

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (ہود:۱۱۴)

بے شبہ نیکیاں برائیوں کو دھوڈالتی ہیں۔

اور حضور ﷺ کا فرمان ہے:

وَاَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا۔

ہر برائی کے بعد کوئی نیک کام کرلیا کرو' وہ اس برائی کو مٹادے گا۔

ہم بندوں کو چاہئے کہ زیادہ سے زیادہ نیکیاں کمانے کی سعی کریں' تاکہ یہ نیکیاں ہماری برائیوں کے لئے کفّارہ بن سکیں۔

بعض علماء کے نزدیک گناہِ کبیرہ وصغیرہ دونوں معاف ہو جاتے ہیں کیوں کہ مذکورہ بالا حدیث میں اس بات کی قید نہیں ہے کہ صرف گناہِ صغیرہ ہی معاف ہوتے ہیں۔اس کے برعکس بعض علماء کے نزدیک صرف گناہِ صغیرہ ہی معاف ہوتے ہیں۔گناہِ کبیرہ براہِ راست توبہ واستغفار اورحق کی ادائی کے بعد ہی معاف ہوتے ہیں۔ دلیل کے طور پر انہوں نے یہ حدیث پیش کی ہے:

الصلوات الخمس والجمعة الى الجمعة ورمضان الى رمضان مكفرات ما بينهن اذا اجتنبت الكبائر۔ (مسلم)

پنج وقتہ نمازیں، ایک جمعے سے دوسرا جمعہ اور ایک رمضان سے دوسرے رمضان۔ یہ سب گناہوں کو بخشنے والے ہیں' بہ شرطے کہ گناہِ کبیرہ سرزد نہ ہوا ہو۔

عاشوراء کا روزہ یہودیوں سے مخالفت کا حکم

سوال: روایت ہے کہ حضور ﷺ جب مدینہ تشریف لائے اور انہوں نے یہودیوں کو عاشوراء کا روزہ رکھتے دیکھا تو آپ ﷺ نے بھی اس دن روزہ رکھا اور

صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی روزہ رکھنے کی تاکید کی۔ دوسری روایت یہ بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کو یہودیوں کی مخالفت اوران کی اقتدا نہ کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ان دونوں روایتوں میں کیوں کر تطبیق ہوسکتی ہے؟

جواب: جس پہلی روایت کا آپ نے تذکرہ کیا ہے وہ بخاری اور مسلم کی صحیح حدیث ہے۔حدیث یوں ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے اور یہودیوں کو عاشورہ کے دن روزہ رکھتے دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی۔ان لوگوں نے جواب دیا کہ یہ ایک مبارک دن ہے۔اس دن اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات دلائی تھی۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے اس دن روزہ رکھا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم موسیٰ علیہ السلام کے زیادہ حقدار ہیں۔پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود روزہ رکھا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی اس کی تاکید فرمائی۔

وہ حدیث بھی صحیح ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود ونصاریٰ کی مخالفت اوران کی اقتدا نہ کرنے اوران سے مشابہت اختیار نہ کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔تاہم ان دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔حقیقت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عاشورا کا روزہ یہودیوں کی اقتدا میں نہیں رکھا بلکہ روایتوں میں ہے کہ وہ ہجرت سے قبل بھی روزہ رکھتے تھے۔اہلِ عرب بھی دورِ جاہلیت میں اس دن روزے کا اہتمام کرتے تھے۔عکرمہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ دورِ جاہلیت میں قریش نے ایک بڑا گناہ کیا۔اس بات سے ان کے دل بوجھل ہوگئے۔ان سے کہا گیا کہ عاشورا کا روزہ رکھو' تمہارے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

آپ مذکورہ بالا حدیث پر غور کریں تو یہ بات واضح ہوگی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن روزہ یہودیوں کی اقتدا میں نہیں رکھا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کی وجہ بیان فرمادی کہ ہم موسیٰ علیہ السلام کے زیادہ حق دار ہیں۔ یہود ونصاریٰ نے تو موسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کو فراموش کر دیا لیکن میں انہیں تعلیمات کو لے کر آیا ہوں جنہیں موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے۔اس لئے ہمارا رشتہ ان سے زیادہ قریب و مضبوط تر ہے اور ہمارا حق بنتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی اقتدا

میں ہم بھی یہ روزہ رکھیں۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی اقتدا میں (نہ کہ یہودیوں کی اقتدا میں) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ روزہ رکھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی اس کی تاکید فرمائی۔

مدینہ آنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس دن روزہ رکھنے کی تاکید فرمائی۔ اس میں یہ مصلحت پوشیدہ ہے کہ یہ اسلام کا ابتدائی دور تھا۔ اس دور میں یہودیوں کے تالیفِ قلب کے لئے اور انہیں اسلام اور مسلمانوں سے قریب کرنے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا کہ مسلمان بھی اس دن روزہ رکھیں۔ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ یہودیوں سے مشابہت ایک ایسے کام میں کی گئی جو ایک پسندیدہ اور باعثِ ثواب کام ہے یعنی روزہ رکھنا۔ لیکن جب اسلام کو غلبہ نصیب ہوا اور یہودیوں کی دشمنی کھل کر سامنے آئی اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا ہی سوال کیا کہ ''اہلِ کتاب سے مخالفت کے حکم کے باوجود ہم ان کی اقتدا میں یہ روزہ کیوں رکھیں؟ تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگلے سال سے ان شاء اللہ ہم نویں تاریخ کو بھی روزہ رکھا کریں گے۔ لیکن اگلا سال آنے سے قبل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہودیوں کی دشمنی کھل کر سامنے آنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہر حال ان سے مخالفت کا ایک پہلو بیان کر دیا۔ یعنی عاشورہ سے قبل ایک روزہ یا عاشورہ کے بعد ایک روزے کی تلقین کی تاکہ یہودیوں سے مشابہت کی صورت جاتی رہے۔

محرم کی دسویں تاریخ کو جشن منانا

سوال: کیا احادیث میں محرم کی دسویں تاریخ کو روزہ رکھنے کے علاوہ دوسرے کاموں مثلاً سرمہ لگانا، اچھے کپڑے پہننا اور عمدہ پکوان پکانے کی بھی ترغیب آئی ہے؟ کیا محرم کے مہینے میں شادی بیاہ جائز نہیں ہے؟

جواب: اس دن روزہ رکھنے کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہیں ہے، جس کے کرنے کی ترغیب کسی حدیث میں موجود ہو۔ اس سلسلہ میں بعض حدیثوں کا تذکرہ آیا ہے، لیکن علماءِ حدیث کہتے ہیں کہ یہ ساری حدیثیں ضعیف اور موضوع یعنی گھڑی ہوئی ہیں۔ اس

دن اچھے کپڑے پہننا اچھے کھانے پکانا اور سرمہ لگانا دراصل ایک بدعت ہے، جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والوں نے ایجاد کی۔ بہتر ہوگا کہ اس بدعت کا مختصر تاریخی تعارف بھی قارئین کے لئے پیش کردوں۔

اللہ تعالیٰ کی مرضی تھی کہ اسی دسویں تاریخ کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید کیے گئے۔ چنانچہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے متبعین اور چاہنے والوں نے اس دن کو رنج والم کا دن قرار دیا۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اس پورے مہینے کو ماہِ ماتم بنا ڈالا۔ ہر قسم کی خوشیاں اور خوشیوں کی تقریبات' اس مہینے میں اپنے اوپر حرام کر ڈالیں اور ایسے ایسے اقدامات وحرکات ایجاد کیے جوان کے رنج وغم کو ظاہر کرسکیں۔

ان کے برعکس وہ گروہ جس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا انہوں نے اس دن کو خوشی اور مسرت کا دن قرار دیا اور ایسی ایسی بدعتیں ایجاد کیں' جن سے مسرت کا اظہار ہو سکے۔ مسرت کے اظہار کو انہوں نے اللہ سے تقرّب کا ذریعہ قرار دے دیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنی طرف سے متعدّد احادیث بھی گھڑ ڈالیں۔

یہ دونوں گروہ غلوّ اور تعصّب کا شکار ہیں۔ حق یہ ہے کہ ہم تعصّب کا شکار ہو کر ایسے کام نہ کریں' جن کی مثال حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اعمال میں نہ ملتی ہو۔ ہماری سلامتی اسی میں ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کریں اور ایسے کاموں کو رواج نہ دیں' جن میں اسلامی روح اور اتباع رسول کا وصف مفقود ہو۔

انہیں غلط رواجوں میں ایک رواج یہ ہے کہ حزن وغم کے اظہار کے لئے لوگ اس مہینے میں شادی بیاہ سے پرہیز کرتے ہیں۔ حالانکہ نہ کوئی حدیث ہے اور نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل کہ انہوں نے اس مہینے میں شادی سے منع کیا ہو۔ بلکہ اس کے برعکس محرّم کا مہینہ ان چار محترم مہینوں میں سے ایک ہے جن کی فضیلت کا تقاضا یہ ہے کہ یہ مہینہ شادی وغیرہ کے لئے زیادہ موزوں ہو۔ ویسے اسلام کی نظر میں شادی کے لئے تمام مہینے یکساں ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

(۱) برصغیر میں اس مہینہ کی ۲۷ ویں تاریخ کی فضیلت بیان کی جاتی ہے اور لوگ اس دن روزے کا اہتمام کرتے ہیں۔

(۲) جہاں نقضِ امن کا اندیشہ ہو وہاں گائے کی قربانی سے اجتناب کرنا چاہئے۔

☆☆☆☆☆

نواں باب

قسموں اور منتوں کے مسائل

منت پوری کرنا

سوال: میری شادی کو آٹھ سال ہو چکے ہیں۔ اللہ کی مرضی کہ اس طویل مدت میں اولاد کی نعمت سے محروم رہا۔ بہت علاج معالجہ کرایا لیکن بے سود۔ بظاہر ہم دونوں میں کوئی بیمار بھی نہیں تھا۔ ایک دن میں اذان کی آواز سن کر گھر سے باہر آیا۔ آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور اللہ کی طرف ہاتھ اٹھا کر میں نے منّت مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اولاد کی نعمت سے نوازا تو میں اپنے دوستوں کو ایک شاندار دعوت دوں گا۔ اللہ کی مرضی کہ اس کے بعد میرے گھر ولادت ہوئی۔ میں نے دعوت کرنی چاہی لیکن بعض وجوہ کی بنا پر میں ایسا نہ کر سکا۔ حالانکہ دعوت کرنے کا میرا پکا ارادہ تھا۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ میری بچی بیمار ہوئی اور کمزور ہوتی چلی گئی۔ میں نے ہر قسم کا علاج کرایا لیکن وہ ہمیں چھوڑ کر اللہ کے پاس چلی گئی۔

میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا نذر پوری نہ کرنے کی وجہ سے وہ انتقال کر گئی؟ میں اب بھی یہ نذر پوری کرنا چاہتا ہوں تو کیا میں ایسا کر سکتا ہوں۔ حالانکہ اب تو وہ انتقال کر چکی ہے؟

جواب: سب سے پہلے تو میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کو اولاد کی نعمت سے نوازے اور متوفیہ کو آپ کے لئے آخرت کے دن باعثِ اجر بنائے۔ آمین۔

آپ کی بچی کی موت اللہ تعالیٰ کی لکھی ہوئی تقدیر تھی جسے کوئی انسان بدل نہیں سکتا

ہے۔اس کی موت نذر پوری نہ کرنے کی وجہ سے نہیں ہوئی ہے۔کیوں کہ منّت پوری نہ کرنا اور موت کا واقع ہونا' ان دونوں میں کوئی تعلق نہیں ہے۔موت تو ایک فیصلہ ہے۔ جب اس کا وقت آتا ہے تو کوئی طاقت اسے ٹال نہیں سکتی۔ ہر انسان کی مدتِ عمر اس کی ولادت سے قبل لکھی جا چکی ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ (فاطر:۱۱)

کوئی پانے والا عمر نہیں پاتا اور نہ کسی کی عمر میں کچھ کمی ہوتی ہے مگر یہ سب ایک کتاب میں لکھا ہوتا ہے۔

البتہ آپ نے جو نذر مانی تھی' اس کا پورا کرنا آپ پر فرض ہے۔کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے نذر پوری کرنے کا حکم دیا ہے اور ان لوگوں کی تعریف کی ہے جو نذریں پوری کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ (الحج:۲۹)

اور اپنی نذریں پوری کریں۔

يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا ۝ (الدھر:۷)

یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں نذر پوری کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہر طرف پھیلی ہوگی۔

سورہ توبہ کی آیت نمبر ۷۵ اور ۷۶ میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو نذریں پوری نہیں کرتے اور اللہ سے کیے گئے وعدے کو ایفا نہیں کرتے۔

ایک عورت نے منّت مانی تھی کہ وہ آپ ﷺ کے سر پر' خوشی کے اظہار کے لئے دف بجائے گی' اس عورت نے آپ ﷺ سے اس بات کا تذکرہ کیا۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنی نذر پوری کرو۔(ابوداؤد)

بچی کے انتقال کی وجہ سے آپ کی نذر ختم نہیں ہوگی۔کیوں کہ آپ کی نذر اولاد کی ولادت کے ساتھ مشروط تھی۔سو اللہ نے آپ کو اولاد عطا کی۔اب آپ پر فرض ہے کہ

آپ اپنی نذر پوری کریں۔ نذر کے سلسلے میں دو باتیں بتانا چاہتا ہوں:

۱- جمہور علماء کے نزدیک نذریں اور منتیں ماننا مکروہ ہے۔ اگرچہ کسی اچھے کام مثلاً نفل نماز پڑھنا یا قربانی کرنے کی ہو۔ اس کی دلیل یہ حدیثِ نبوی ﷺ ہے:

نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ عَنِ النَّذْرِ وَقَالَ اِنَّهٗ لَا يَرُدُّ شَيْئًا وَاِنَّمَا يُسْتَخْرَجُ بِهٖ مِنَ الْبَخِيْلِ۔ (بخاری، مسلم، احمد)

نبی ﷺ نے نذر ماننے سے منع فرمایا ہے اور فرمایا ہے کہ اس سے تقدیر نہیں بدلتی۔ البتہ اس کے ذریعے سے کسی بخیل شخص سے کچھ مال نکالا جا سکتا ہے۔

اس کراہت کی وجہ یہ ہے کہ لوگ نذریں مان کر یہ اعتقاد کرنا شروع کر دیں کہ نذر اور منّت تقدیر کے فیصلے کو بدل سکتی ہے۔ نذر ماننے میں ایک قباحت یہ بھی ہے کہ بندہ کسی اچھے کام کی منت اس شرط کے ساتھ مانتا ہے کہ اس کا ذاتی فائدہ پورا ہو جائے۔ مثلاً اگر اللہ نے مجھے اولاد عطا کی تو میں ایک جانور ذبح کروں گا یا ایک مسجد بنواؤں گا۔ گویا کہ آپ نے ایک اچھے کام کو اپنے ذاتی مفاد کے ساتھ مشروط کر دیا۔ اگر آپ کو یہ فائدہ نہ پہنچا تو آپ وہ اچھا کام بھی نہ کریں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی نیت اللہ کو خوش کرنا نہیں ہے، بلکہ اپنا ذاتی فائدہ حاصل کرنا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ ایک اچھی بات نہیں ہے۔

بہر حال نذر ماننا مکروہ ہی سہی، لیکن نذر ماننے کے بعد اس کا پورا کرنا تمام علماء کے نزدیک فرض ہے۔

۲- دوسری بات یہ ہے کہ منّت اگر ماننی ہو تو کسی ایسی چیز کی ماننی چاہیے جس میں اللہ کی عبادت اور اس کا تقرّب مقصود ہو۔ مثلاً نفل نماز پڑھنا، قربانی کرنا یا روزے رکھنا وغیرہ۔ حدیثِ نبوی ﷺ ہے:

لَا نَذْرَ اِلَّا فِيْمَا ابْتُغِيَ بِهٖ وَجْهِ اللّٰهِ۔

نذر نہیں ہے سوائے اس چیز میں جس سے اللہ کی خوشنودی مقصود ہو۔

اسی لئے بعض علماء نے کہا ہے کہ اگر نذر کسی ایسے کام کی مانی جائے جس سے اللہ کی خوش نودی مقصود نہ ہو تو وہ سرے سے نذر ہی نہیں ہے۔

اس حدیث کی رُو سے آپ کو چاہئے تھا کہ دوستوں کو دعوت دینے یا تقریب منانے کی منّت کے بجائے کسی ایسے کام کی منّت مانتے جس سے اللہ کا تقرّب مقصود ہو۔ دوستوں کو دعوت دینا بھی اللہ کے تقرّب کا ذریعہ ہو سکتا ہے اگر دوستی اللہ کے لئے ہو۔

قسم کا کفّارہ

سوال: مجھ پر قسم کا کفّارہ واجب ہے۔ یعنی دس مسکینوں کو کھانا کھلانا۔ کیا انہیں صرف ایک وقت کا کھانا کھلاؤں یا پورے دن کا؟ کیا ایک ہی مسکین کو دس دن تک کھلانے سے یہ کفّارہ ادا ہو جائے گا؟

جواب: قرآن کی رُو سے قسم کا کفّارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ کھلانے کی تین شکلیں ہو سکتی ہیں:

۱- انہیں دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلایا جائے۔ وہی کھانا جو وہ خود اور اپنے گھر والوں کو کھلاتا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک ایک ایک وقت پیٹ بھر کھلانا بھی کافی ہے۔

۲- دوسری شکل یہ ہے کہ پکے ہوئے کھانے کے بجائے اناج دیا جائے۔ اناج کی مقدار کیا ہوگی، اس سلسلے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک نصف صاع اور بعض کے نزدیک اس سے کم یا زائد۔ بہر حال اناج کی اتنی مقدار دی جائے جس سے پیٹ بھر کر کھانا تیار ہو سکے۔

۳- تیسری شکل یہ ہے کہ اس کے پیسے دیئے جائیں۔

میرے نزدیک پہلی شکل زیادہ افضل ہے، کیوں کہ قرآن نے ''اِطعَام'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور پہلی شکل اس لفظ سے زیادہ قریب تر ہے۔

آیت کی رُو سے ایک ہی مسکین کو دس دن تک کھانا کھلانا کافی نہیں ہے۔ آیت کا

مقصود یہ ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے۔ اس لئے اس عدد کی رعایت ضروری ہے۔ البتہ احناف کے نزدیک ایک ہی مسکین کو دس دن تک کھانا کھلانا جائز ہے۔

قسم کی قسمیں

سوال: میرے اور میری پڑوسن کے درمیان لڑائی ہوگئی۔ میں نے اللہ کی قسم کھائی کہ اس عورت کو کبھی اپنے گھر آنے نہیں دوں گی۔ اپنے گھر والوں کو بھی میں نے تاکید کر دی کہ اس سے بات چیت نہ کریں۔ ایک دن وہ عورت معذرت کرتی ہوئی اور سلام کرتی ہوئی میرے گھر میں داخل ہوگئی۔ کیا اس طرح میری قسم ٹوٹ گئی اور مجھے کفارہ ادا کرنا ہو گا؟

جواب: شریعت میں قسم کی تین قسمیں ہیں:

۱- جھوٹی قسم: یعنی جان بوجھ کر کسی جھوٹی بات پر قسم کھانا۔ ایسا شخص دنیا و آخرت دونوں جگہ عذاب کا مستحق ہے۔

۲- لغو قسم: یعنی وہ قسم جو انسان یوں ہی بلا مقصد بات بات میں کھاتا ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ بہ خدا آج بہت گرمی ہے یا واللہ آج تو میرے گھر پر دعوت میں آنا پڑے گا۔ وغیرہ۔ اس طرح کی قسموں کا مقصد قسم کھانا نہیں ہوتا اس لئے اللہ کے نزدیک یہ قابلِ گرفت نہیں ہیں۔

اللہ ان قسموں کے بارے میں فرماتا ہے:

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ط (البقرۃ:۲۲۵)

جو بے معنی قسمیں تم بے ارادہ کھالیا کرتے ہو ان پر اللہ گرفت نہیں کرتا۔ مگر جو قسم تم سچے دل سے کھاتے ہو ان کی باز پُرس وہ ضرور کرے گا۔

۳- تیسری قسم وہ ہے جو کسی مستقبل کی کسی بات پر کھائی جاتی ہے اور قسم کھانے کی غرض سے یہ قسم کھائی جاتی ہے۔ مثلاً بہ خدا اب کبھی سگریٹ نہیں پیوں گا وغیرہ۔ یہ قسم

چونکہ قسم کھانے کی غرض سے کھائی جاتی ہے۔ اس لئے قسم کھانے والا اس بات کا ذمہ دار ہے کہ اپنی قسم کی حفاظت کرے۔ اگر حفاظت نہیں کر سکا اور قسم ٹوٹ گئی تو اسے قسم کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔

اس طرح کی قسمیں عموماً دو چیزوں کے لئے کھائی جاتی ہیں۔ ان چیزوں کے لئے جو شرعاً جائز اور نیک کام ہیں یا ان چیزوں کے لئے جو شرعاً ناجائز اور غلط کام ہیں۔ جائز اور نیک کاموں کے لئے قسم کھانے کی مثال یہ ہے کہ مثلاً کوئی یہ کہے کہ بہ خدا میں اب کبھی سگریٹ نہ پیوں گا۔ بُرے کاموں کے لئے قسم کھانے کی مثال یہ ہے کہ مثلاً کوئی کہے کہ خدا کی قسم میں فلاں رشتے دار سے قطع تعلّق کرلوں گا۔ رشتے دار سے قطع تعلّق کرنا ناجائز ہے اور ناجائز کام پر قائم رہنا باعثِ گناہ ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس ناجائز کام کو پہلی فرصت میں ترک کیا جائے اور قسم ٹوٹنے کی وجہ سے قسم کا کفّارہ ادا کیا جائے۔

آپ نے چوں کہ ایک غلط اور شرعاً ناجائز کام کی قسم کھائی تھی اور اس عورت نے آپ کے گھر میں آکر آپ کی قسم توڑ بھی دی، اس لئے آپ پر قسم کا کفّارہ واجب ہے۔ قسم کا کفّارہ ہے دس مسکینوں کو پیٹ بھر کھانا کھلانا یا ایک غلام آزاد کرنا۔ یہ نہیں کر سکتا تو تین دن روزے رکھنا۔

کعبے کی قسم کھانا

سوال: کیا کعبے کی قسم کھانا یا عزت کی قسم یا اپنے والدین کی قسم کھانا، لغو قسم میں شمار ہوگی؟ یا لغو قسم سے مراد وہ قسم ہے جو بلا ضرورت کھائی جائے؟

جواب: اللہ تعالیٰ یا اس کی صفات حمیدہ کے علاوہ کسی اور کی قسم کھانا اسلام میں حرام ہے۔ حدیثِ نبوی ﷺ ہے:

لَا تَحْلِفُوْا بِاٰبَائِكُمْ مَنْ كَانَ حَالِفًا فَلْيَحْلِفْ بِاللّٰهِ اَوْلِيَذَرْ۔

اپنے باپوں کی قسم نہ کھاؤ، جسے قسم کھانی ہے وہ اللہ کی قسم کھائے ورنہ قسم نہ کھائے۔

دوسری حدیث ہے:

مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللّٰهِ فَقَدْ اَشْرَكَ۔

جس نے اللہ کے علاوہ کسی اور کی قسم کھائی اس نے شرک کیا۔

کیوں کہ قسم اس کی کھائی جاتی ہے جس کی بڑائی اور کبریائی کا اعتراف ہو۔ بڑائی اور کبریائی خدا کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہیں۔ کعبے یا کسی اور چیز کی قسم کھانا حرام اور شرک ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے غیر اللہ کی سچی قسم کھانے کے مقابلے میں اللہ کی جھوٹی قسم کھانا زیادہ پسند ہے۔ کیوں کہ غیر اللہ کی سچی قسم کھا کر آپ نے سچ بات تو ضرور کہی لیکن شرک کے مرتکب ہوئے' جب کہ اللہ کی جھوٹی قسم کھا کر ایک جھوٹ بولنے کا گناہ کیا اور شرک سے محفوظ رہے۔ ظاہر ہے کہ جھوٹ کے مقابلے میں شرک زیادہ بڑا گناہ ہے۔

مباح چیزوں کی نذر ماننا

سوال: میں نے نذر مانی تھی کہ میں اپنے بیٹے کے غسلِ صحت کے بعد ایک شاندار پارٹی دوں گی۔ اس کے بعد میرے ماموں دس سال کے لئے جیل چلے گئے اور میں دس سال تک یہ نذر پوری نہ کر سکی۔ کیا اب میں یہ نذر پوری کروں یا صدقہ وغیرہ کروں؟

جواب: سب سے پہلی بات یہ ہے کہ نذر ان چیزوں کی ماننی چاہئے جن میں اللہ کی عبادت، اس کی خوشنودی اور تقرّب کا پہلو موجود ہو۔ مثلاً نمازیں پڑھنا یا روزے رکھنا وغیرہ۔

پارٹیاں دینے یا اس جیسے کسی دوسرے مباح کام کی اگر نذر مانی ہے، تو اس میں علماء کی دو رائیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس نے جو نذر مانی ہے وہی پوری کرے اور دوسری یہ کہ قسم کا کفارہ ادا کرے یعنی دس مسکینوں کو کھانا کھلائے یا غلام آزاد کرے۔ ایسا نہیں کر سکتا تو تین دن روزے رکھے۔ علماء نے ان دونوں کا اختیار دیا ہے۔ اب آپ ان میں سے کوئی ایک شکل اختیار کریں۔

دسواں باب

عورت اور خاندانی مسائل

کیا عورت سراپا شر ہے؟

سوال: نہج البلاغہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف ایک قول منسوب ہے کہ انہوں نے فرمایا:

المرأة شر كلها. یعنی عورت سراپا شر ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے یہ قول کس حد تک درست ہے؟

جواب: سب سے پہلے میں دو باتیں واضح طور پر بتانا چاہوں گا۔

۱- پہلی بات یہ کہ کسی بھی مسئلے میں صرف قرآن اور حدیث ہی ایسے دو مراجع ہیں، جو اسلامی نقطہ نظر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان دونوں کے علاوہ کسی اور کی بات قبول بھی کی جاسکتی ہے اور رد بھی۔

۲- محققین کے نزدیک نہج البلاغہ میں بہت سارے اقوال ایسے ہیں، جن کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف انتساب صحیح نہیں ہے۔ ایک ہوش مند قاری اس بات کو محسوس کرسکتا ہے کہ یہ باتیں حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی اور عالمِ دین کی نہیں ہو سکتیں۔ اسلامی قاعدے کے مطابق کسی قول کو اس کے قائل کی طرف منسوب کرنے کے لئے معتبر سند کی ضرورت ہوتی ہے۔ معتبر سند کے بغیر کسی قول میں کوئی وزن نہیں ہوتا۔ آپ ذرا مجھے بتائیں کہ نہج البلاغہ میں ایسی کسی معتبر سند کا تذکرہ کہاں ہے؟ اگر کسی معتبر سند سے بھی یہ قول حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ثابت ہو تب بھی پہلی فرصت میں اس قول کو رد کیا

جا سکتا ہے کیوں کہ یہ قول واضح طور پر قرآن وسنت اور اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس طرح کی بات کیسے کہہ سکتے ہیں اس لئے کہ وہ قرآن پڑھتے تھے اور جانتے تھے کہ قرآن نے اصل خلقت میں اور مکلف ہونے میں عورت اور مرد دونوں کو مساوی قرار دیا ہے۔ حتیٰ کہ جزا و سزا میں بھی دونوں یکساں ہیں۔

قرآن کا ارشاد ہے:

يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً (النساء:۱)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سارے مرد اور عورت دنیا میں پھیلا دیئے۔

اور قرآن کہتا ہے:

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِنْكُمْ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ (آل عمران:۱۹۵)

جواب میں ان کے رب نے فرمایا، میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع نہیں کروں گا خواہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو ایک نعمت سے تعبیر کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اَلدُّنْيَا مَتَاعٌ وَخَيْرُ مَتَاعِهَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ.

دنیا ایک متاع ہے۔ اس دنیا کی بہترین متاع صالحہ عورت ہے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چار چیزیں جسے عطا ہوئیں اسے دنیا کی تمام نعمتیں عطا ہوئیں۔ ان میں سے ایک نعمت صالحہ عورت ہے۔ (۱)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بارے میں فرماتے ہیں:

حُبِّبَ إِلَيَّ مِنْ دُنْيَاكُمُ النِّسَاءُ وَالطِّيبُ.

تمہاری دنیا میں سے مجھے عورت اور خوش بو محبوب ہے۔

ان کے علاوہ متعدّد احادیث ہیں، جن میں حضور ﷺ نے صالحہ عورت کو نعمت قرار دیا ہے۔ قرآن میں عورت کی تخلیق کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ اسے مرد کے لئے باعثِ سکون بنایا گیا ہے۔ (۲) اگر عورت سراپا شر ہوتی تو وہ دنیا کی عظیم نعمت کیسے ہوتی اور مردوں کے لئے باعثِ سکون کیونکر قرار پاتی؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ قرآن وحدیث کی مخالفت کرتے ہوئے یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ عورت سراپا شر ہے۔ اگر انہوں نے یہ بات کہی تو ان کا اپنی زوجہ یعنی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں کیا خیال ہے۔ جن کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ جنت کی عورتوں کی سردار ہوں گی۔ کیا ان کے بارے میں بھی یہی کہا جائے گا کہ وہ سراپا شر ہیں؟

عورت کی فطرت مرد کی فطرت سے بہت مختلف نہیں ہے۔ جس طرح مرد نیکی اور بدی دونوں کے مرتکب ہوتے ہیں، اسی طرح عورتیں بھی نیک اور بد دونوں طرح کی ہوتی ہیں۔ البتہ ایک حدیث ہے جس میں عورتوں کے فتنے سے خبردار کیا گیا ہے۔ حدیث ہے:

مَا تَرَكْتُ بَعْدِیْ فِتْنَةً اخر عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَآءِ۔ (بخاری)

میرے بعد کوئی ایسا فتنہ نہیں رہ جائے گا جو مردوں کے لئے خطرناک ہو، عورتوں سے بڑھ کر۔

اس حدیث میں عورتوں کے فتنے سے خبردار کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عورتیں سراپا شر ہیں' بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں میں ایسی کشش اور جاذبیت ہوتی ہے کہ اس بات کا بڑا خدشہ ہوتا ہے کہ مردِ ان میں الجھ کر خدا اور آخرت کو فراموش کر بیٹھیں۔ اور یہ ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے مال و دولت اور اولاد کے فتنے سے بھی خبردار کیا ہے:

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ؕ (التغابن:۱۵)

تمہارے مال اور اولاد تو ایک آزمائش ہیں۔

لیکن اس کے باوجود کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مال و دولت اور اولاد سراپا شر ہیں۔ اس کے برعکس قرآن نے مال و دولت کو ''خیر'' سے تعبیر کیا ہے اور اولاد کو نعمت قرار دیا ہے اور ساتھ ہی یہ دونوں چیزیں فتنہ بھی ہیں کہ ان میں انسان کو مشغول کر کے خدا سے غافل کرنے کی پوری صلاحیت ہوتی ہے، یہی حال عورت کا ہے کہ نعمت ہونے کے باوجود وہ فتنہ بھی ہے۔

مسلم عورتوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان چالوں کو سمجھیں اور ان چیزوں سے دور رہیں جو ترقی اور آزادی کے نام پر ان کی عزت و آبرو کو تباہ و برباد کر سکتی ہیں۔ ان کے لئے فلاح اور کامیابی اس میں ہے کہ خدا کے مقرر کردہ حدود کے اندر پوری آزادی کے ساتھ زندگی بسر کریں، جس طرح قرون اولیٰ کی صالحہ عورتیں بسر کرتی تھیں۔

بیوٹی پارلر جانا اور وِگ لگوانا

سوال: کیا مسلمان عورت کا میک اپ کی خاطر بیوٹی پارلر جانا جائز ہے؟ شرعاً وِگ کا استعمال کیسا ہے؟ کچھ لوگ اس دعوے کی بنیاد پر وگ کا استعمال جائز قرار دیتے ہیں کہ عورتوں کے بال ستر میں داخل ہیں اور وگ کے ذریعے ان بالوں کو ڈھاکا جا سکتا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟

جواب: اسلام وہ مذہب ہے جو زینت و زیبائش کو پسند کرتا ہے' بلکہ اس کی ترغیب دیتا ہے' لیکن اعتدال اور توازن کے ساتھ۔ اسلام اس بات کا سخت مخالف ہے کہ انسان بلاوجہ اپنے اوپر تقشّف، بے چارگی اور پھوہڑ پن کی صورت طاری کئے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو سخت ناپسند کرتا ہے جنہوں نے حلال اور جائز زینت و زیبائش کو حرام قرار دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ (الاعراف:۳۲)

کہو اللہ کی زینت کو کس نے حرام قرار دیا' جسے اس نے اپنے بندوں کے لئے تخلیق کیا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے نماز سے قبل زینت اختیار کرنے کی تاکید کی ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف:۳۱)

ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو۔

عورتوں کی فطرت کا لحاظ رکھتے ہوئے اسلام نے زینت کی وہ چیزیں بھی عورتوں کے لئے جائز کر دی ہیں جو مردوں کے لئے حرام ہیں۔ مثلاً سونا، ریشم وغیرہ۔ تاہم زینت و زیبائش کے وہ طور طریقے جن میں فطرت اور اعتدال سے رُو گردانی ہو یا اللہ کی تخلیق میں تبدیلی ہو، مرد اور عورت دونوں کے لئے یکساں طور پر حرام ہیں۔ اللہ کی خِلقت میں تبدیلی کرنا ایک شیطانی عمل ہے جس کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے:

وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ۝

(شیطان نے کہا تھا) اور میں لوگوں کو حکم دوں گا پس وہ اللہ کی خِلقت میں تبدیلی کریں گے۔

اور اسی لئے حضور ﷺ نے ان عورتوں پر لعنت فرمائی ہے جو ہاتھوں یا جسم کے کسی دوسرے حصے پر گدواتی ہیں یا دانتوں کو کاٹ کاٹ کر نوکیلا بناتی ہیں یا ابرو کے بال ترشوا کر دیدہ زیب بناتی ہیں۔ یا اصلی بالوں میں نقلی بال لگاتی ہیں۔ زینت کے ان طریقوں پر لعنت بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ طریقے حرام ہیں۔ اسی سے وگ کا استعمال کرنے کا حکم معلوم ہوتا ہے کہ یہ حرام ہے' کیوں کہ وگ درحقیقت اصلی بالوں میں نقلی بال کا اضافہ ہے۔ یہ کہنا کہ وگ عورتوں کے بال کو چھپانے کا کام دیتا ہے' خلاف حقیقت ہے۔ کیوں کہ بال چھپانے کے طریقے اور چیزیں سب کو معلوم ہیں۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ وگ کا استعمال زیب و زینت کے طور پر کیا جاتا ہے۔ بلکہ بعض احادیث میں حضور ﷺ نے

وگ کو ''زُوْر'' سے تعبیر کیا یعنی یہ وہ چیز ہے جو لوگوں کو دھوکے میں رکھتی ہے اور اس کے بارے میں فرمایا کہ:

اِنَّمَا هَلَكَتْ بَنُوْ اِسْرَائِيْلُ حِيْنَ اِتَّخذَ هٰذِهٖ نِسَآؤُهُمْ۔ (بخاری)

بے شبہ بنی اسرائیل ہلاک ہوئے' جب ان کی عورتوں نے اسے اپنالیا۔

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

۱- پہلی بات یہ کہ وگ ایسی لعنت کو ایجاد کرنے اور رواج دینے والے یہود ہیں۔

۲- حضور ﷺ نے اسی شے کو ''زُوْر'' سے تعبیر کر کے اس کی حرمت کے سبب کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔ یعنی یہ وگ دھوکے اور فریب کی ایک قسم ہے اور اسلام دھوکے اور فریب کو ناجائز قرار دیتا ہے۔

اسی طرح عورتوں کا بیوٹی پارلر جا کر مردوں سے میک اپ کرانا بالکل حرام ہے۔ کیوں کہ شریعت کی رُو سے عورتوں کا اجنبی مرد کے ساتھ تنہا ہونا اور اجنبی مرد کا اجنبی عورت کے بدن کا کوئی حصہ چھونا دونوں ہی بالکل حرام ہیں۔

درحقیقت بیوٹی پارلر کا رواج بھی اس وقت عمل میں آیا جب آرائش وزیبائش اور میک اپ میں اعتدال اور توازن مفقود ہو گیا اور عورتوں کے لئے دنیا کی سب سے اہم ترین شے میک اپ کرنا قرار پایا۔ عورتوں کے لئے میک اپ جائز سہی' لیکن یہ ایسی چیز تو نہیں جو ان کا سب سے بڑا مسئلہ بن جائے اور اس کی خاطر وہ اپنی دوسری اہم ذمہ داریاں فراموش کر بیٹھیں' حتیٰ کہ بچوں کی تربیت بھی متاثر ہو جائے۔ میک اپ جائز ہے' لیکن حدود کے اندر اور میک اپ کے لئے بیوٹی پارلر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ گھر میں بھی تو میک اپ کر سکتی ہیں۔ انہیں چاہیئے کہ گھر ہی میں رہ کر میک اپ کریں اور اپنے شوہر کے لئے کریں' نہ کہ راہ چلنے والوں کے لئے۔

بہر حال اگر بیوٹی پارلر جانا ناگزیر ہو تو یہ اسی صورت میں جائز ہو سکتا ہے جب کہ بیوٹی پارلر میں کام کرنے والی ساری کی ساری عورتیں ہوں اور مردوں کا داخلہ ممنوع ہو۔

برقع اور پردے کا مسئلہ

سوال: پردے کے سلسلے میں ہمارے یہاں زبردست بحث چھڑی ہوئی ہے۔ خاص طور پر عورت کے چہرے کے سلسلے میں کہ اسے چھپانا ضروری ہے یا نہیں؟ امید کہ آپ اس مسئلے پر خاطر خواہ روشنی ڈالیں گے۔

جواب: دینِ اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جس معاشرے کی طرف دعوت دیتا ہے اس کی بنیاد ایمان ویقین کے ساتھ ساتھ شرافت، نجابت، اخلاقِ فاضلہ اور مرد وعورت کے مابین پاک صاف رشتے پر استوار ہوتی ہے۔ اس کی خاطر اسلام نے ہر اس امکانی ذریعے اور دروازے کو بند کر دیا ہے جو اباحیت، بداخلاقی اور جنسی بے راہ روی کی طرف لے جاتا ہو۔ عورتوں کے لئے پردے کا حکم، عورتوں اور مردوں کو نگاہیں نیچی رکھنے اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کا حکم اور ان جیسے دوسرے احکام کا مقصود بھی تو یہی ہے کہ معاشرہ جنسی بے راہ روی کی آغوش میں نہ چلا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ

(النور: ۳۰)

اے نبی ﷺ! مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔

آگے چل کر مزید فرمایا گیا ہے:

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۪ (النور: ۳۱)

اور اے نبی ﷺ! مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رکھیں۔

ابنِ عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنهَا'' سے مراد ہتھیلی، انگوٹھی اور چہرہ ہے۔ ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس سے مراد چہرہ اور ہتھیلی ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہی مروی ہے۔ بعد کے فقہاء میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی اس سے مراد چہرہ اور ہتھیلی ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے دو اقوال ہیں۔ ان میں سے ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد صرف چہرہ ہے۔ نیل الاوطار میں امام شوکانی نے فقہاء کے تمام اقوال بالتفصیل درج کیے ہیں۔

چہرہ پردے میں شامل نہیں ہے:

جمہور فقہاء نے چہرے کو پردے کے حدود سے خارج شمار کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول یہ ہے کہ چہرہ پردے میں شامل ہے۔ بعض شافعیہ بھی یہی کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چند فقہاء کے علاوہ تمام فقہاء کے نزدیک چہرہ پردے میں شامل نہیں ہے۔ قرآن وحدیث کے نصوص بھی اسی قول کی حمایت کرتے ہیں۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ، ابنِ عمر رضی اللہ عنہ، عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کی بھی یہی رائے ہے۔

بخاری شریف کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی عید کے موقع پر خطبہ دیا۔ پھر عورتوں کی طرف آئے۔ ان کے ساتھ بلال رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عورتوں کو نصیحت کی، وعظ فرمایا اور صدقہ کرنے کی تاکید کی۔ کیوں کہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ جو اس حدیث کے راوی ہیں کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ عورتیں اپنے ہاتھوں سے بلال رضی اللہ عنہ کے کپڑے میں مال و دولت ڈالتی جاتی تھیں۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے عورتوں کے ہاتھوں کو دیکھا۔ یعنی ہاتھ پردے میں شامل نہیں ہیں۔

ایک دوسری حدیث بخاری ومسلم میں درج ہے کہ ایک نہایت خوبصورت عورت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سوال کر رہی تھی اور فضل بن عباس رضی اللہ عنہ بار بار مڑ کر اس عورت کو دیکھ رہے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم بار بار ان کا چہرہ دوسری طرف پھیر دیتے تھے۔ عباس رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم فضل کا چہرہ بار بار دوسری طرف... کیوں پھیر رہے

ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے ایک نوجوان مرد اور ایک نوجوان عورت کو اس حال میں دیکھا کہ شیطان انہیں بہکانے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس حدیث سے جمہور فقہاء نے یہ استدلال کیا ہے کہ اس عورت کا چہرہ کھلا ہوا تھا تب ہی تو پتا چلا کہ وہ خوبصورت عورت تھی اور فضل رضی اللہ عنہ بار بار ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور آپ ﷺ نے بھی اسے چہرہ چھپانے کا حکم نہیں دیا تھا' حالانکہ وہ مسلم عورت تھی۔ آپ ﷺ نے صرف یہ کیا کہ فضل رضی اللہ عنہ کا چہرہ دوسری طرف کر دیا تاکہ ان کی نظر اس کے چہرے سے دور رہے۔ یہ واقعہ حجتہ الوداع کے موقع کا ہے جب کہ پردے کا حکم نازل ہوئے پانچ سال گزر چکے تھے۔

نگاہیں نیچی رکھنے کا مطلب:

نگاہیں نیچی رکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آنکھیں بند ہوں یا سر نیچے کی جانب ہو تاکہ کسی پر نظر نہ پڑے' کیوں کہ مستقل ایسا کیئے رہنا ناممکن ہے۔ نگاہیں نیچی رکھنے کا مفہوم یہ ہے کہ انسان بار بار اس چیز کی طرف اپنی نگاہ نہ لے جائے جو اس کے لئے فتنے کا باعث بن سکتی ہو۔ اسی لئے عورتوں اور مردوں کا ایک دوسرے کو ستر کے مقام کے علاوہ دیکھنا بالکل جائز ہے بہ شرطے کہ ایسا دیکھنا شہوت کے ساتھ نہ ہو۔ اگر یہ دیکھنا شہوت کے ساتھ ہو تو یہ حرام ہے۔

مُسند احمد کی روایت ہے کہ کچھ حبشی عید کے دن حضور ﷺ کے پاس کچھ تماشا دکھا رہے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں حضور ﷺ کے کندھوں پر چڑھ کر یہ تماشا دیکھتی رہی حتیٰ کہ دل بھر گیا۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عورتیں مردوں کو بغیر شہوت کے دیکھ سکتی ہیں۔

بعض شافعی حضرات کے نزدیک مردوں کا نہ عورتوں کو دیکھنا جائز ہے اور نہ عورتوں کا مردوں کو۔ ان کی دلیل ترمذی کی یہ حدیث ہے کہ نبی ﷺ نے اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا اور میمونہ رضی اللہ عنہا کو عبداللہ بن اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہ سے پردہ کرنے کا حکم دیا تھا' حالانکہ وہ نابینا تھے۔

ان دونوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول وہ تو اندھے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ اندھے ہیں تم تو اندھی نہیں ہو، تم تو انہیں دیکھ سکتی ہو۔

لیکن علماءِ حدیث کے نزدیک یہ حدیث ضعیف ہے اور استدلال کے قابل نہیں ہے۔ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ عرب اس زمانے میں پاجامے کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ بہت ممکن ہے کہ اٹھتے بیٹھتے وقت عبداللہ بن اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہ کے ستر کا کوئی حصہ کھل جائے اور انہیں اس بات کا احساس نہ ہو۔ بہر حال علماءِ حدیث نے اسے ضعیف حدیث قرار دیا ہے۔ اس حدیث کے مقابلے میں دوسری حدیث زیادہ صحیح اور استدلال کے قابل ہے جس میں حضور ﷺ نے فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو حکم دیا کہ عبداللہ بن مکتوم رضی اللہ عنہ کے گھر میں عدت کے ایام گزاریں اور فرمایا کہ وہ نابینا ہیں اس لئے تم ان کے سامنے اپنا پردہ اتار سکتی ہو۔ یہ بخاری اور مسلم کی حدیث ہے۔

پردے کا رواج:

رہی پردے اور برقعے کی بات تو بعض اسلامی معاشروں میں حد درجہ احتیاط کی وجہ سے پردے میں غلوّ سے کام لیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس غلو کا اسلام نے انہیں حکم نہیں دیا ہے۔ چنانچہ تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عورتیں مسجدوں میں چہرہ اور ہاتھ کھول کر نماز پڑھ سکتی ہیں بہ شرطے کہ ان کی صفیں مردوں سے پیچھے ہوں۔ اسی طرح یہ بات بھی جائز ہے کہ عورتیں درس وتدریس کی مجلسوں میں علم حاصل کرنے کی خاطر شریک ہوں۔ تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ عورتیں مردوں کے ساتھ جہاد کے میدان تک سفر کرتی تھیں۔ زخمیوں کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال کرتی تھیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بیویوں نے جنگِ یرموک میں مردوں کی مدد کی تھی۔ اسی طرح احرام کی حالت میں چہرہ کھولنا سب کے نزدیک جائز ہے، بلکہ جمہور علماء کے نزدیک احرام کی حالت میں چہرہ کھولے رکھنا ضروری ہے اور چہرہ چھپانا حرام ہے۔ کیوں کہ نبی ﷺ کا فرمان ہے:

لَا تَنْتَقِبُ الْمَرْأَةُ الْمُحْرِمَةُ وَلَا تَلْبَسُ الْقُفَازَيْنِ۔ (بخاری)

احرام والی عورت نقاب نہیں لگا سکتی اور نہ دستانہ ہی استعمال کرسکتی ہے۔

عورتوں کا شرعی لباس

سوال: آج کل بعض مسلمان عورتیں ذرا تنگ اور مختصر لباس پہنے ہوئے دیکھی جاتی ہیں۔ان کا یہ لباس شریعت کی نظر میں حرام ہے یا حلال؟ (۳)

جواب: حد درجہ افسوس کی بات ہے کہ آج کل لوگ اس قسم کے سوال بھی کرنے لگے ہیں جن کا جواب روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے' یہ تو شریعت نے بالکل واضح کردیا ہے۔ حلال وحرام کے درمیان بہت ساری ایسی باتیں ہیں جو مشتبہ یعنی مبہم ہیں اور واضح نہیں ہیں' جیسا کہ حدیث میں ہے:

الحلال بین والحرام بین وبینهما امور مشتبهات لا یعلمهن کثیر من النّاس۔ (بخاری ومسلم)

حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے۔ ان کے درمیان کچھ مبہم باتیں ہیں جنہیں بہت سارے لوگ نہیں جانتے۔

ہونا تو یہ چاہئے کہ ان مبہم اور غیر واضح چیزوں کے بارے میں سوال ہو۔ لیکن ایسی چیز کے بارے میں سوال کرنا، جس کا حرام ہونا بالکل واضح ہے۔ یقیناً باعثِ افسوس ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عورتوں کے لئے اس قسم کا تنگ اور مختصر لباس پہن کر لوگوں کے سامنے آنا' شریعت کی نظر میں بالکل حرام ہے۔

شریعت نے عورتوں کے لئے جو لباس جائز کیا ہے' اس میں درج ذیل صفات ہونی چاہئیں:-

۱- وہ لباس جسم کے سارے حصے کو ڈھانکنے والا ہو' سوائے اس حصے کے جس کی اللہ نے اجازت دی ہے یعنی چہرہ اور ہتھیلیاں۔

۲- کپڑا اتنا باریک نہ ہو کہ جسم جھلکنے لگے' کیوں کہ ایسا لباس ساتر نہیں ہوتا اور

نبی ﷺ نے اسی لباس کے بارے میں فرمایا ہے کہ بعض جہنمی عورتیں ایسی ہوں گی جو لباس پہننے کے باوجود ننگی ہوتی ہیں۔(۴) یعنی ان کا لباس اتنا باریک ہوتا ہے کہ سارا جسم جھلکتا ہے۔

۳-لباس اتنا تنگ نہ ہو کہ جسم کے نشیب وفراز نمایاں ہوں۔

۴- ایسا لباس نہ ہو جو صرف مردوں کے لئے مخصوص ہو۔یعنی جس لباس کو عرف عام میں مردوں کا لباس کہا جاتا ہو۔کیوں کہ نبی ﷺ نے ان عورتوں پر لعنت فرمائی ہے جو مردوں سے مشابہت اختیار کرتی ہیں۔عورتوں کا مردوں سے مشابہت اختیار کرنا درحقیقت اس فطرت سے بغاوت ہے، جس پر اللہ نے عورتوں کو پیدا کیا ہے۔اسی طرح مردوں کا عورتوں سے مشابہت اختیار کرنا بھی باعثِ لعنت ہے۔

یہ وہ اوصاف ہیں جو عورتوں کے شرعی لباس میں ہونے چاہئیں۔ان میں سے اگر ایک وصف بھی کسی لباس میں مفقود ہو تو وہ لباس شریعت کی نظر میں جائز نہیں ہے۔لیکن افسوس کی بات ہے کہ فیشن کے چکر میں آکر عورتوں نے اللہ کے احکام کو فراموش کر دیا ہے۔مرد حضرات بھی اتنے کمزور پڑ گئے ہیں کہ اپنی عورتوں کو شریعت کی حدود میں نہیں رکھ پا رہے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے انہیں ''قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ'' عورتوں کے گارجین کی حیثیت عطا کی ہے۔مردوں کو چاہئے کہ خوابِ غفلت سے بیدار ہوں اور اپنی حیثیت کا استعمال کرتے ہوئے دورِ جدید کے اس فتنے کا مردانہ وار مقابلہ کریں۔

عورتوں کا ختنہ

سوال: عورتوں کے ختنے کے سلسلے میں اسلام کا کیا حکم ہے؟

جواب: اس سلسلے میں علماء اور خود ڈاکٹروں کے درمیان زبردست اختلاف ہے۔ ان میں ایک گروہ ہے جو اس کے حق میں ہے اور دوسرا گروہ اس کی مخالفت کرتا ہے۔

میری رائے میں بہتر صورت یہ ہے کہ عورتوں کا ہلکا سا ختنہ ہونا چاہئے' کیوں کہ یہ ہلکا ختنہ ان کے چہرے پر تازگی اور ان کے شوہر کے لئے زائد لذت کا باعث بن سکتا

ہے۔ اس سلسلے میں دلیل کے طور پر ایک حدیث پیش کی جا سکتی ہے، اگر چہ یہ صحیح حدیث نہیں ہے۔ حدیث یہ ہے کہ نبی ﷺ نے اس عورت سے جو عورتوں کا ختنہ کرتی تھی فرمایا:

اشمی ولا تنھکی فانہ انضر للوجہ واحظی عند الزوج۔

تھوڑا ختنہ کرو اور بالکل جڑ سے نہ کاٹ ڈالو، کیوں کہ یہ چیز عورت کے چہرے کے لئے باعثِ تازگی اور اس کے شوہر کے لئے باعثِ لذت ہے۔

بہر حال یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ اس میں کسی قسم کی سختی اور تشدد سے کام لیا جائے۔ جو لوگ اپنی بیٹیوں کا ختنہ کرانا چاہتے ہیں وہ ایسا کر سکتے ہیں اور میں بھی اسی کے حق میں ہوں اور جو لوگ نہیں کرانا چاہتے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

البتہ بچوں کا ختنہ کرانا اسلامی شعائر میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسی لئے علماء کہتے ہیں کہ اگر کسی شہر والوں نے یہ سنّت چھوڑ دی ہو تو امامِ وقت ان کے خلاف اس وقت تک جنگ کر سکتا ہے، جب تک کہ وہ اس سنّت پر عمل نہ کرنے لگیں۔

نکاح سے قبل منگیتر سے تنہائی میں ملنا

سوال: میں نے اپنی پسند کی لڑکی کے رشتے کے لئے اس کے گھر والوں کو پیغام دیا، جسے انہوں نے بہ خوشی قبول کر لیا اور ہماری منگنی ہو گئی۔ اس کے لئے ہم نے ایک پارٹی بھی دی جس میں ہماری منگنی کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ کیا رشتے کی باہم رضا مندی اور اس کا اعلان اس بات کے لئے شرعاً کافی ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے تنہائی میں مل سکیں؟

جواب: منگنی اور نکاح ہر اعتبار سے دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ منگنی تو نکاح کی طرف محض ایک پیش قدمی ہے۔ اسلامی شریعت نے بھی منگنی اور نکاح کے درمیان بڑا فرق رکھا ہے۔ منگنی کی چاہے جس قدر تشہیر اور اعلان ہو جائے اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ فریقین نکاح کے لئے راضی ہیں۔ اسی لئے نکاح پر جس طرح کچھ حقوق

مرتب ہوتے ہیں، منگنی پر نہیں ہوتے۔ نکاح اس باہمی رضامندی کو عملی جامہ پہنانے کا نام ہے۔ یہ ایک مضبوط بندھن ہے۔ یہ بندھن کچھ شرطوں اور اصولوں کی تکمیل کے بعد وجود میں آتا ہے۔

مختصر یہ کہ نکاح سے قبل منگیتر کی حیثیت ایک اجنبی عورت کی ہوتی ہے۔ منگنی سے قبل جس طرح اس کے ساتھ تنہائی میں ملنا حرام تھا، منگنی کے بعد بھی اسی طرح حرام ہے یہاں تک کہ دونوں کے درمیان نکاح ہو جائے۔

لڑکوں اور لڑکیوں کے والدین سے اور خود لڑکوں سے میری گزارش ہے کہ منگنی کے بعد جتنی جلد ہو سکے نکاح کا مرحلہ بھی طے ہو جانا چاہئے کہ اس میں ہمارے معاشرے کی بھلائی ہے۔

ہیجان انگیز مناظر سے متاثر ہونا

سوال: میں کالج کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ میں ایک دین دار لڑکا ہوں اور الحمد للہ نماز روزے اور دوسری عبادات کا پابند ہوں، لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک غلط عادت میں مبتلا ہوں۔ میں جب بھی کوئی ہیجان انگیز منظر دیکھتا ہوں میری شہوت جاگ اٹھتی ہے اور میرے کپڑے گیلے ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے مجھے بار بار غسل کرنا پڑتا ہے اور یہ بات میرے لئے پریشانی کا باعث ہے۔ اس مصیبت سے چھٹکارا پانے میں آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ امید ہے آپ میری رہنمائی فرمائیں گے۔

جواب: سب سے پہلے تو میں آپ کو اس بات پر مبارکباد دیتا ہوں کہ نوجوانی کی عمر میں بھی آپ کو دین سے الفت و محبت ہے اور آپ نماز روزے اور دوسری عبادتوں کے بھی پابند ہیں۔ امید ہے کہ اپنی آئندہ زندگی میں بھی آپ دین کو اسی مضبوطی کے ساتھ تھامے رہیں گے۔ امید ہے کہ آپ قیامت کے دن ان سات قسم کے لوگوں میں شامل ہوں گے جنہیں اللہ تعالیٰ کا سایہ نصیب ہوگا۔ اس دن جب کہ اللہ کے سایہ کے علاوہ اور کوئی سایہ نہیں ہوگا اور سورج سوا نیزے پر ہوگا۔ ان سات قسموں میں سے ایک

قسم ان نوجوانوں کی ہے جنہوں نے اپنی جوانی اللہ کی عبادت میں گزاری ہے۔

آپ کو اپنی اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لئے سب سے پہلے یہ کرنا ہوگا کہ آپ ہر ممکن طریقہ سے ان مناظر اور ان جگہوں سے اپنے آپ کو بچائیے جو آپ کے لئے ہیجان انگیز ثابت ہو رہے ہوں۔ آپ ہر ممکن کوشش کیجئے کہ آپ کا التفات ان مناظر کی طرف نہ ہو۔ عربی میں ایک کہاوت ہے کہ عقل مند وہ نہیں ہے جو برائیوں میں گھرنے کے بعد ان سے نکلنے کی تدبیر کرے' بلکہ عقل مند وہ ہے جو اس بات کی تدبیر کرے کہ وہ برائیوں میں گھرنے ہی نہ پائے۔

ساتھ ہی ساتھ آپ کسی اسپیشلسٹ ڈاکٹر سے بھی رجوع کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ جنسیات کے ماہرین کے پاس کوئی ایسی دوا ہو جس سے آپ کا علاج ہو سکے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ "اللہ نے ہر بیماری کے ساتھ ساتھ اس کا علاج بھی پیدا کیا ہے"۔

آخر میں آپ سے یہ کہوں گا کہ ہیجان انگیز مناظر دیکھنے کے بعد جو چیز بھی عضوِ تناسل سے نکلتی ہے کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ منی ہی ہو۔ کبھی منی کے بجائے صرف مذی نکلتی ہے اور انسان سمجھتا ہے کہ منی نکل گئی۔ غسل کرنا صرف منی میں واجب ہے۔ مذی میں غسل نہیں ہے۔ صرف وضو کر لینا اور مذی کی جگہ پر پانی کے چھینٹے مار لینا کافی ہے۔ ترمذی اور ابوداؤد کی روایت ہے کہ سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہیں مذی کی وجہ سے کافی پریشانی ہوتی تھی کہ بار بار انہیں غسل کرنا پڑتا تھا۔ انہوں نے اس پریشانی کا تذکرہ حضور ﷺ کے سامنے کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وضو کر لینا اور مذی کی جگہ پر پانی کے چھینٹے مار لینا کافی ہے۔ غسل کرنا ضروری نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ہم بندوں پر احسان ہے کہ اس نے مذی میں غسل کو واجب نہیں کیا۔

ناخن پالش کا استعمال

سوال: عورتوں کے ناخن پالش استعمال کرنے کے سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ یہ حرام ہے یا حلال؟

جواب: اس کا مختصر جواب یہ ہوگا کہ چوں کہ ناخن پالش وضو کے پانی کو جلد تک نہیں پہنچنے دیتا' اس لئے اس کے استعمال سے وضو نہیں ہوتا اور جب وضو نہیں ہوتا تو ظاہر ہے نماز بھی نہیں ہوتی۔ اب آپ خود فیصلہ کرلیں کہ اس کا استعمال ان عورتوں کے لئے کیسے جائز ہوسکتا ہے، جو نمازی ہیں۔ رہی بات ان عورتوں کی جو نماز نہیں پڑھتیں تو ان کے لئے اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ناخن پالش حرام ہے یا حلال۔ کیوں کہ نماز تو دین کا اہم ترین فریضہ ہے اور کفر و ایمان کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ جس نے نماز ہی ترک کر دی اس کے بعد بچا ہی کیا؟

عورتوں کا سر کے بال چھپائے رکھنا

سوال: میرے اور بعض دوستوں کے درمیان عورتوں کے سر چھپانے کے سلسلے میں بحث چھڑی ہوئی ہے۔ میرے بعض دوستوں کا کہنا ہے کہ عورتوں کا سر چھپانا ضروری نہیں ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ سر چھپانے کے سلسلے میں قرآن و حدیث کی کوئی واضح دلیل نہیں ہے۔ آپ سے تسلی بخش جواب مطلوب ہے۔

جواب: مسلم معاشرے کے لئے یہ بات کسی فتنے سے کم نہیں ہے کہ ان باتوں کو موضوعِ بحث بنالیا جائے جو یقینی ہیں اور ان پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔ اس بحث کی آڑ لے کر وہ لوگ بڑے بڑے گُل کھلاتے ہیں جو اسلام کے دشمن ہیں اور ہمارے مذہبی امور میں شک و شبہ ڈالنا چاہتے ہیں۔

یہ بات یقینی ہے کہ ہر دور میں تمام علماء و فقہاء کا اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ عورتوں کے بال وہ زینت ہے، جس کے چھپانے کا حکم قرآن میں اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ اجنبی مردوں کے سامنے بالوں کا کھولنا کسی طور پر جائز نہیں ہے۔ قرآن میں اللہ کا ارشاد ہے:

وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا (النور: ۳۱)

اور اپنا بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی زینت غیر محرموں کے

سامنے نہ کھولیں سوائے اس زینت کے جو خود بہ خود ظاہر ہو جاتی ہے۔ کسی بھی عالمِ دین نے یہ نہیں کہا ہے کہ بال بھی اس زینت میں شامل ہیں جو خود بہ خود ظاہر ہو جاتی ہے۔ خود بہ خود ظاہر ہونے والی زینت سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس سے مراد عورت کا لباس ہے۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے نزدیک اس سے مراد چہرہ، ہتھیلی اور لباس ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ عورت ہر ممکن طریقے سے اپنے آپ کو مکمل چھپانے کی کوشش کرے، لیکن اس کے باوجود اگر کچھ ظاہر ہو جاتا ہے تو یہ بات قابلِ معافی ہے اور ''اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنهَا'' سے یہی مراد ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں۔ ان کے بدن پر باریک لباس تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ کر چہرہ دوسری طرف پھیر لیا اور فرمایا کہ اے اسماء (رضی اللہ عنہا)! جب عورت حیض کی عمر کو پہنچ جائے تو اس کے بدن کا کوئی حصہ ظاہر نہیں ہونا چاہئے سوائے اس کے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چہرہ اور ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ اس حدیث سے واضح ہے کہ چہرہ اور ہاتھ کھولے رکھنا جائز ہے۔

آیتِ مذکورہ میں اللہ کا حکم ہے کہ وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوبِهِنَّ (عورتوں کو چاہئے کہ اپنے سینوں پر دوپٹا ڈال لیں) اس آیت میں ''خمار'' کے استعمال کا حکم ہے۔ عربی زبان میں خمار اس کپڑے کو کہتے ہیں جس سے سر ڈھکا جاتا ہے۔ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بخاری کی شرح میں لکھا ہے کہ عورتوں کے لئے خمار ویسے ہی ہے جیسے مردوں کے لئے عمامہ۔ اس آیت میں بھی خمار سے مراد وہ اوڑھنی ہے جو عورتیں سروں پر رکھتی ہیں۔ اس کی دلیل اس آیت کا سببِ نزول بھی ہے۔

اس آیت کا سببِ نزول یہ ہے کہ پہلے عورتیں دوپٹا اپنے سر پر رکھتی تھیں اور دوپٹا کا باقی حصہ پیچھے کی طرف لٹکا لیتی تھیں۔ اس کی وجہ سے ان کا سینہ کھلا رہتا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ سر کے دوپٹے کو پیچھے کرنے کے بجائے سینہ پر رکھ لیا کرو تاکہ سینہ ڈھکا رہے۔

محبت اور شادی

سوال: میں ایک لڑکے سے محبت کرتی ہوں اور ہم دونوں نے اللہ کو حاضر ناظر جان کر شادی کا عہد و پیمان بھی کرلیا ہے۔اس کے بعد اس لڑکے نے میرے گھر والوں سے میرا رشتہ مانگا تو میرے گھر والوں نے انکار کردیا۔ کیوں کہ وہ میری شادی کسی اور سے کرانا چاہتے ہیں۔تو کیا اس عہد و پیمان کے بعد میرا کسی اور سے شادی کرنا جائز ہوگا؟

جواب: اسلامی شریعت کے مطابق شادی ایک ایسا بندھن ہے جسے درج ذیل متعلّقین کی باہمی رضامندی کے بعد ہی عمل میں آنا چاہئے:

۱- اسلام نے حکم دیا ہے کہ لڑکی کی رائے ضرور معلوم کرنی چاہئے۔اس پر کسی قسم کی زبردستی نہ ہو۔اس کی شادی زبردستی اس شخص سے نہ کرائی جائے، جسے وہ ناپسند کرتی ہو۔ نبی ﷺ نے ایسے نکاح کو منسوخ قرار دیا جس میں لڑکی کی شادی ایسے شخص کے ساتھ کرا دی گئی جسے وہ ناپسند کرتی تھی۔ایک دوسری حدیث ہے کہ ایک لڑکی حضور ﷺ کے پاس آئی اور بیان کیا کہ میرے والد میری شادی ایسے شخص سے کرانا چاہتے ہیں جسے میں سخت ناپسند کرتی ہوں۔آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ تم اُسی شخص سے شادی کرلو، جس سے تمہارے والد چاہتے ہیں۔اس نے کہا کہ میں اس شخص کو ناپسند کرتی ہوں۔آپ ﷺ نے پھر فرمایا کہ اپنے والد کی بات مان لو۔لڑکی نے بار بار انکار کیا اور آپ ﷺ نے بار بار اسے اپنے والد کی بات مان لینے پر اصرار کیا۔ اس لڑکی کے مصمم انکار کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہیں اس بات کا پورا حق ہے کہ تم اس شادی سے انکار کردو اور اس کے والد کو حکم دیا کہ اس کی پسند سے شادی کرائی جائے۔اس پر لڑکی نے کہا کہ اب میں اپنے والد کی پسند سے شادی کرتی ہوں۔ میں تو صرف لوگوں کو یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ اپنی لڑکیوں پر اس قسم کی زبردستی جائز نہیں ہے۔

۲- اس طرح لڑکی کے ولی کی رضامندی بھی ضروری ہے۔حدیث ہے:

أَيَمَا اِمْرَأَةٍ اَنْكَحَتْ نَفْسَهَا بِغَيْرِ اِذْنِ وَلِيِّهَا فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ

بَاطِلٌ بَاطِلٌ.

جس عورت نے بغیر اپنے ولی کی اجازت کے خود سے اپنی شادی کر لی، اس کا نکاح باطل ہے، باطل ہے، باطل ہے۔

شریف لڑکی کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ اپنا رشتہ خود تلاش کرے اور خود سے اپنی شادی کر لے۔ آج کل اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لڑکے بھولی بھالی لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر گھر سے بھگا لے جاتے ہیں اور کسی اور جگہ جا کر شادی کر لیتے ہیں۔ اس میں لڑکے کے گھر والوں کی رضا مندی شامل نہیں ہوتی ہے۔ لڑکی کو ہوش اس وقت آتا ہے، جب اسے یہ پتا چلتا ہے کہ اس کے ساتھ زبردست دھوکا ہوا ہے۔ لیکن اب وہ دھوکے بازوں کے دام میں اس طرح پھنس چکی ہوتی ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ شریعت نے ولی کی رضا مندی کو ضروری قرار دے کر لڑکی کی عزت و شرافت کی حفاظت کا بندوبست کیا ہے۔

۳- اسی طرح لڑکی کی ماں سے مشورہ کرنا بھی ضروری ہے۔ حدیث ہے:

اٰمِرُوا النِّسَآءَ فِیْ بَنَاتِهِنَّ. (مسند احمد)

عورتوں سے ان کی بیٹیوں کے سلسلے میں مشورہ کرو۔

اس حدیث کی رُو سے لڑکیوں کی شادی سے متعلق ان کی ماؤں سے مشورہ کرنا بھی ضروری ہے۔ کیوں کہ مائیں باپوں کے مقابلے میں اپنی بیٹیوں کی طبیعت، ان کی پسند و ناپسند اور ان کے میلان و رجحان کو زیادہ بہتر طور پر جانتی ہیں۔

جب یہ تینوں متعلقین کسی رشتے کے لئے باہم رضا مند ہوں تب ایسی شادی عمل میں آتی ہے جسے ہم واقعی خانہ آبادی سے تعبیر کر سکتے ہیں اور جسے اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء میں مودّت و رحمت اور سکون کا ذریعہ قرار دیا ہے۔

جہاں تک آپ کے سوال کے جواب کا تعلق ہے تو میں یہی کہوں گا کہ آپ کا بغیر اپنے ولی کی اجازت کے کسی لڑکے کے ساتھ شادی کا عہد و پیمان کر لینا' صحیح نہیں ہے۔

کیوں کہ جیسا کہ میں نے بتایا ولی کی رضامندی کسی بھی شادی کے لئے ضروری ہے۔ اور آپ کا معاملہ یہ ہے کہ ولی کی رضامندی تو دور کی بات ہے آپ کے ولی کو اس رشتے کا علم ہی نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ اس عہد و پیمان کو توڑ دیں۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس عہد و پیمان کی کوئی حیثیت بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ آپ کے ولی کی رضامندی اس میں شامل نہیں ہے۔ اس عہد کے ٹوٹنے کا خوف آپ کو نہیں ہونا چاہئے۔ ساتھ ہی میں ولیوں سے گزارش کروں گا کہ وہ اپنی بیٹیوں کی پسند و ناپسند کا ضرور خیال کریں' اس لئے کہ شادی کو کامیاب بنانے میں اس پسند و ناپسند کا بڑا دخل ہے۔

منگنی سے قبل لڑکی کو دیکھنا

سوال: کیا منگنی سے قبل لڑکا لڑکی کو دیکھ سکتا ہے؟

جواب: یہ ایک اہم سوال ہے۔ لوگ اس معاملے میں مختلف نظریات رکھتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا نظریہ ہے کہ شادی سے قبل لڑکا لڑکی کو نہ صرف دیکھ لے بلکہ بہتر یہ ہوگا کہ کچھ مدّت تک دونوں ایک ساتھ گھومیں پھریں تاکہ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ یہ ان لوگوں کا نظریہ ہے جنہیں ہم مغربی تہذیب کا غلام کہہ سکتے ہیں اور ہر باشعور شخص سمجھ سکتا ہے کہ اگر اس نظریہ پر عمل کیا جائے تو لڑکی کی عزت کس قدر محفوظ ہو سکتی ہے۔ خاص کر ایسے صورت میں جب کہ دونوں ایک ساتھ ایک مدّت تک رہ چکے ہوں اور اس کے بعد لڑکا اس رشتے سے انکار کر دے۔ پھر جتنے منہ ہوں گے لڑکی کے سلسلے میں اتنی باتیں ہوں گی اور اس کی عزت و شرافت خاک میں مل جائے گی۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے بعد اس کے لئے کوئی پیغام ہی نہ آئے۔

اس نظریہ کے برخلاف ایک دوسرا نظریہ بھی ہے۔ اس کے حاملین اتنے سخت ہوتے ہیں کہ کسی بھی قیمت پر انہیں یہ گوارا نہیں ہوتا کہ شادی سے قبل لڑکا لڑکی کو کسی بھی طرح دیکھ سکے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو پرانے رسم و رواج کے پابند ہیں۔

اسلام کی نظر میں یہ دونوں نظریے غلط ہیں اور صحیح نظریہ وہ ہے جو ان دونوں کے بیچ

بیچ ہے۔ جس میں نہ اِفراط ہے نہ تفریط۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر معاملے میں اسلام کا نظریہ اِفراط وتفریط سے پاک ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں اسلامی شریعت کا نظریہ یہ ہے کہ لڑکے کو شادی سے قبل اپنی ہونے والی بیوی کو دیکھ لینا چاہئے۔ حدیث میں ہے کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا کہ میں نے انصار کی ایک لڑکی کو پیامِ رشتہ دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا، کیا تم نے اسے دیکھ بھی لیا ہے؟ صحابی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے دیکھ لو۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنی منگنی کی خبر دینے آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا کہ کیا تم نے اس لڑکی کو دیکھ لیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے دیکھ لو۔ کیوں کہ اسے دیکھ لینا شادی کی پائیداری کا سبب بنتا ہے۔

ایک دوسری حدیث جس کا مفہوم یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی عورت سے شادی کرنا چاہے تو شادی سے قبل اسے اس عورت میں کوئی ایسی چیز دیکھ لینا چاہئے جو شادی کا باعث بنے۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ شادی سے قبل میں اپنی بیوی کو درخت کی آڑ سے چھپ کر دیکھا کرتا تھا حتیٰ کہ مجھے اس میں وہ چیز نظر آ گئی جس نے مجھے شادی پر آمادہ کر دیا۔

ان سب احادیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شادی سے قبل لڑکی کو دیکھ لینا نہ صرف یہ کہ جائز ہے، بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ایسا کرنا واجب ہے۔ کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے اور حکم اس چیز کے لئے دیا جاتا ہے جو واجب ہو۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کا حکم دیا ہو، بے شبہ اسی میں ہمارے لئے بہتری ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ شادی سے قبل لڑکا اور لڑکی دونوں کو ایسے مواقع فراہم کئے جائیں کہ ایک دوسرے کو دیکھ لیں۔ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ لڑکا لڑکی کو اس طرح دیکھے کہ لڑکی کو اس بات کا علم نہ ہو۔ تاکہ اس کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے۔ مثلاً اس طرح کہ لڑکی

کسی کام سے گھر سے باہر نکلی ہو اور اس حالت میں اسے دیکھا جائے جیسا کہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کیا۔ اس احتیاط کی اس لئے بھی شدید ضرورت ہے کہ دیکھنے کے بعد لڑکا اس رشتے سے انکار کر سکتا ہے اور اس صورت میں لڑکی زبردست احساسِ کمتری میں مبتلا ہو سکتی ہے۔

غیر مسلم لڑکیوں سے شادی کرنا

سوال: ایک اہم مسئلہ ہمارے معاشرے کو درپیش ہے۔ یہ مسئلہ غیر مسلم عورتوں خصوصاً اہلِ کتاب کی عورتوں سے شادی کرنے کا ہے۔ اسلام کی نظر میں اہلِ کتاب کی عورتوں سے شادی کرنا جائز ہے' لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرح کی شادیاں مسلم معاشرے کے لئے نقصان دہ ہیں۔ کیوں کہ اہلِ کتاب عورتیں اپنے بچوں کی تربیت اسلامی انداز پر نہ کرتے ہوئے بالکل مغربی انداز پر کرتی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلام نے ایک ایسی چیز کو کیسے حلال کیا ہے جو بہر صورت مسلم معاشرے کے لئے نقصان دہ ہے؟ امید ہے کہ تسلی بخش جواب دیں گے۔

جواب: مجھے یورپ اور امریکا جانے کا اکثر اتفاق ہوتا رہتا ہے۔ وہاں بہت سارے مسلم بھائیوں سے میری ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ ان میں سے چند بغرض ملازمت وہاں مقیم ہیں، چند تعلیم کی خاطر اور چند نے شہریت لے کر وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔ وہاں پر مسلم لڑکوں کا مسیحی یا یہودی (اہلِ کتاب) لڑکیوں سے شادی کرنے کی طرف بھی کافی میلان ہے۔ اس لئے بہت سارے لوگوں نے مجھ سے اس قسم کی شادی کے بارے میں دریافت کیا ہے کہ شرع کی نظر میں اس کا کیا حکم ہے؟

اس سلسلے میں اسلامی شریعت کا حکم بیان کرنے کے لئے ضروری ہوگا کہ میں غیر مسلم عورتوں کی ہر قسم کا حکم علیحدہ علیحدہ بیان کروں۔ کیوں کہ غیر مسلم عورت بت پرست بھی ہو سکتی ہے، مشرک و ملحد بھی ہو سکتی ہے۔ مرتد بھی ہو سکتی ہے اور کتابیہ بھی۔

اسلامی شریعت کے مطابق ہر اس عورت سے شادی حرام ہے جو شرک اور کفر کی

مرتکب ہو۔ اللہ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ (البقرۃ:۲۲۱)

تم مشرک عورتوں سے ہرگز نکاح نہ کرنا جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن لونڈی مشرک شریف زادی سے بہتر ہے۔ خواہ وہ (مشرکہ) تمہیں بہت ہی پسند ہو۔

دوسری آیت ہے:

وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ (الممتحنہ:۱۰)

اور تم خود بھی کافر عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ روکے رہو۔

ان آیات کی رُو سے ہر وہ عورت جو بت پرستی، کفر یا شرک میں مبتلا ہو اس سے شادی کرنا حرام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ توحید اور شرک دو الگ الگ راہیں ہیں۔ شادی دو ذہنوں اور دو دلوں کا ملاپ ہے' لیکن جب دونوں الگ اور مختلف عقائد کے حامل ہوں تو ان کے ذہنی ملاپ کی کوئی صورت نہیں۔ اس کی طرف اللہ اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اُولٰۗىِٕكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ښ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ (البقرۃ:۲۲۱)

یہ لوگ تمہیں آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنے اِذن سے تم کو جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے۔

کافر و مشرک عورتوں کے ضمن میں وہ عورتیں بھی آئیں گی جو ملحد ہیں' یعنی سرے سے جن کا کوئی دین ہی نہ ہو۔ مثلاً کمیونسٹ عورتیں۔ الحاد شرک سے بھی بدترین گناہ ہے' کیوں کہ مشرک خدا کو مانتا ہے اگرچہ اس کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتا ہے' جب کہ ملحد سرے سے کسی خدا کو نہیں مانتا۔

اسی طرح ان عورتوں سے بھی شادی حرام ہے، جو مرتد ہیں۔ یعنی پہلے وہ مسلمان تھیں لیکن اب وہ اسلام سے نکل کر شرک یا مسیحیت یا یہودیت کی طرف چلی گئیں۔ اسلام کسی کو زبردستی اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتا، لیکن جب کوئی شخص اپنی رضا اور خوشی سے اسلام قبول کرلیتا ہے تو پھر اس کے لئے اسلام سے خارج ہونا کسی طور پر جائز نہیں ہے۔ اسی لئے مرتد کی سزا قتل ہے۔

اسی طرح بہائی عورتوں سے شادی کرنا' جائز نہیں' کیوں کہ ان کا شمار یا تو مشرک عورتوں میں ہوگا یا مرتد عورتوں میں۔

اب رہا مسئلہ ان عورتوں کا جو اہلِ کتاب کہلاتی ہیں یعنی ایک ایسے دین کی حامل ہیں جو آسمانی ہے یعنی مسیحیت یا یہودیت۔

جمہور علماء وفقہاء کے نزدیک اہلِ کتاب عورتوں سے شادی کرنا مباح ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ نے قرآن میں ان کے ذبیحے اور ان کی عورتوں سے شادی کو جائز قرار دیا ہے۔

وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۖ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۡ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ (المائدہ:۵)

اہلِ کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لئے اور پاک دامن عورتیں بھی تمہارے لئے حلال ہیں خواہ وہ اہلِ ایمان میں سے ہوں یا ان میں سے جن کو تم سے قبل کتاب دی گئی تھی۔ بشرطیکہ تم ان کے مہر ادا کر کے نکاح میں ان کے محافظ بنو' نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو یا چوری چھپے آشنائیاں کرو۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک اہلِ کتاب عورتوں سے شادی جائز نہیں ہے۔ امام

بخاری رحمۃ اللہ علیہ ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ جب ان سے مسیحی یا یہودی لڑکی سے شادی کے متعلق سوال کیا جاتا تو وہ فرماتے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کے لئے مشرک عورتوں سے شادی کو حرام قرار دیا ہے اور اس سے بڑھ کر شرک اور کیا ہوسکتا ہے کہ عیسیٰ کو خدا تسلیم کیا جائے۔ حالانکہ وہ اللہ کے بندے ہیں۔

بعض شیعہ حضرات بھی ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کی طرح اہلِ کتاب عورتوں سے شادی کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ ان کی دلیل بھی وہی ہے جو ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کی ہے۔

لیکن میری نظر میں راجح رائے وہی ہے جو جمہور علماء کی ہے۔ کیوں کہ سورہ مائدہ کی متذکرہ آیت اس امر میں بالکل واضح ہے کہ کتابیات سے شادی جائز ہے۔ رہی سورہ بقرہ کی آیت تو وہ ایک عام حکم ہے کہ تمام مشرک عورتوں سے شادی جائز نہیں۔ اس عام حکم سے ہٹ کر کتابیات کے لئے ایک خاص حکم ہے جس کا تذکرہ سورہ مائدہ کی آیت میں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ قرآن میں اہلِ کتاب کے لئے مشرک کا لفظ کہیں بھی استعمال نہیں ہوا ہے۔ جہاں بھی مشرک کا لفظ ہے، اس سے مراد عرب کے وہ مشرکین ہیں جو دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے۔ اسی لئے متعدّد آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب کے ساتھ مشرکین کا الگ سے تذکرہ کیا ہے۔ یا پھر مشرکین کے بعد اہلِ کتاب کا الگ سے تذکرہ کیا ہے:

مثلاً

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ (البینۃ:۶)

بے شبہ وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اہلِ کتاب میں سے اور مشرکین جہنم کی آگ میں ہوں گے۔

دوسری آیت ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصَّابِئِيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (الحج:۱۷)

جولوگ ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور صابئ اور نصاریٰ اور مجوس اور جن لوگوں نے شرک کیا' ان سب کے درمیان قیامت کے روز اللہ فیصلہ کرے گا۔

اس لئے راجح قول یہی ہے کہ کتابیات سے شادی جائز ہے' لیکن یہ جواز بھی چند شرطوں کے ساتھ ہے۔ ذیل میں ان شرطوں کا تذکرہ کرتا ہوں:

۱- پہلی شرط یہ ہے کہ وہ عورت کسی ایک آسمانی دین پر یقینِ کامل رکھتی ہو اور فی الجملہ وہ عورت اللہ، رسالت اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتی ہو۔

آج کل مغربی معاشرہ کچھ ایسا ہے کہ مسیحی گھر میں نشوونما پانے والی ہر لڑکی کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ مسیحی ہوگی۔ وہ مسیحی بھی ہوسکتی ہے اور کمیونسٹ بھی اور ملحد بھی۔

۲- دوسری شرط یہ ہے کہ پاک دامن اور شریف عورت ہو۔ اس شرط کا تذکرہ خود اس سورہ مائدہ والی آیت میں بھی ہے' اس لئے کہ اللہ نے ''محصنات'' کے ساتھ شادی کو جائز قرار دیا ہے اور محصنات کا مطلب ہے پاک دامن اور شریف عورتیں۔

آج کل مغربی معاشرے میں عورتوں نے جو وضع قطع اختیار کر رکھی ہے یا اجنبی مردوں کے ساتھ ان کا جس قدر آزادانہ میل ملاپ ہے' وہ سب پر عیاں ہے۔ ان کی پاک دامنی کی گواہی مشکل ہی سے دی جاسکتی ہے۔ درحقیقت ہم جس پاک دامنی اور شرافت کی بات کرتے اور اہمیت دیتے ہیں' مغربی عورت کے نزدیک اس کی سرے سے کوئی قدر و قیمت ہی نہیں ہے۔

امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے دریافت کیا کہ کس کتابیہ سے شادی کی جاسکتی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ کیا کتابیہ سے شادی کرنا ضروری ہے؟ کیا مسلمان عورتوں کی کمی ہے؟ تاہم اگر ان سے شادی کرنا ضروری ہو تو ایسی لڑکی ہو جو پاک دامن ہو اور ''مسافحہ'' نہ ہو۔ پوچھا گیا کہ مسافحہ کون ہوتی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ مسافحہ وہ

عورت ہے جو کسی اجنبی شخص کے ایک اشارے پر اس کے پیچھے کھنچی چلی آتی ہے۔

۳- تیسری شرط یہ ہے کہ کتابیات نہ خود اسلام اور مسلمانوں کی دشمن ہوں اور نہ کسی ایسی تنظیم یا جماعت سے وابستہ ہوں جو اسلام اور مسلم دشمن ہو۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے متعدد آیات میں مسلمانوں کو ان لوگوں کے ساتھ موالات سے منع فرمایا ہے جو اسلام و مسلم دشمن ہوں۔ اس سے بڑھ کر موالات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کے ساتھ رشتے داری قائم کی جائے، مسلم دشمن جماعت یا معاشرہ کی کسی عورت کو مسلم خاندان کا ایک فرد بنایا جائے۔ اس صورت میں اس بات کا زبردست امکان ہے کہ شادی کی آڑ لے کر مسلم دشمن عورتیں مسلم معاشرے میں جاسوسی کرتی پھریں اور یوں مسلمانوں کی تباہی کا سبب بنیں۔

اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ جب تک اسرائیل اور ہمارے درمیان جنگ کی صورت قائم ہے، کسی یہودی عورت سے شادی جائز نہیں ہے۔

۴- چوتھی شرط یہ ہے کہ کتابیہ سے شادی کرنے سے کسی قسم کے نقصان اور فتنے کا اندیشہ نہ ہو۔ یہ نقصان مختلف صورتوں میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ نقصان اور فتنے کی ایک صورت یہ ہے کہ شادی کے بعد کتابیہ اپنے بچوں کی تربیت اپنے دین و مذہب کے مطابق کرے گی اور وہ بچوں کو اسلام سے دور کر دے گی۔ ایسے گھرانوں میں جہاں عورتیں حکمرانی کرتی ہیں اور مرد حضرات ان کے سامنے بھیگی بلی بنے رہتے ہیں، اس بات کا امکان اور بھی زیادہ ہے۔

یا اس بات کا اندیشہ ہو کہ اس طرح کی شادی مسلم معاشرے میں رواج کی صورت اختیار کر لے۔ پھر تو یہ ہو گا کہ لوگ جس قدر کتابیات سے شادی کریں گے مسلم لڑکیاں اسی قدر شادی سے محروم رہ جائیں گی۔ اسی اندیشے کے پیشِ نظر عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کو جنھوں نے مدائن میں ایک یہودی لڑکی سے شادی کر لی تھی، خط لکھا کہ میرا خط ملتے ہی تم اس یہودیہ کو طلاق دے دو، کیوں کہ مجھے اندیشہ ہے کہ وہاں

کے مسلمان تمہاری دیکھا دیکھی ذِمّی عورتوں سے ان کی خوبصورتی کی بنا پر شادی کرنے لگیں گے اور مسلمان عورتیں بیٹھی رہ جائیں گی۔ (۵)

اس صورتِ حال کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ بعض لڑکے تعلیم یا نوکری کی غرض سے امریکا یا یورپ جاتے ہیں۔ چند سالوں کے بعد وہ وہاں کسی امریکی یا یورپی لڑکی سے شادی کر لیتے ہیں۔ پھر دونوں مل کر جو گھر آباد کرتے ہیں تو اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اس پر مغربی تہذیب کا نقش گہرا ہوتا ہے۔ ان لڑکوں کے والدین جب اپنے بیٹوں اور بہوؤں سے ملنے کے لئے ان کے گھر جاتے ہیں تو وہاں ایک عجیب وغریب قسم کی اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ جب تک اس گھر میں رہتے ہیں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔ انہیں محسوس ہونے لگتا ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو کھو دیا۔

آخر میں، میں ایک اہم بات کی طرف دھیان دلانا چاہتا ہوں۔ اسلام نے اگر کتابیہ سے شادی کی اجازت دی ہے تو دو باتوں کا خیال کرتے ہوئے:

۱- یہ کتابیہ چونکہ خود ایک آسمانی دین پر ایمان رکھتی ہے اس لئے کسی بھی مسلم کی طرح وہ خود بھی اللہ، اس کی رسالت، یومِ آخرت اور اعلیٰ اور عمدہ اخلاق پر ایمان ویقین رکھتی ہے۔ اس لئے کسی بھی دوسری مشرک عورت کے مقابلے میں وہ اسلام سے زیادہ قریب ہے۔

۲- یہ بھی خیال رہے کہ یہ کتابیہ جب شادی کر کے کسی مسلم گھرانے میں آئے تو اس کا رَول اثر انداز ہونے والا نہ ہو۔ بلکہ اثر قبول کرنے والا ہو۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی تہذیب اور مغربی اخلاق اور روایات کے ساتھ اس مسلم گھرانے پر اثر انداز ہونے لگے' بلکہ ایسا ہو کہ ایک مسلم گھرانے میں رہتے ہوئے وہ اسلامی تہذیب اور اسلامی افکار واخلاق کا اثر قبول کرے۔ کتابیہ سے شادی کی اجازت دراصل اسی بنیاد پر ہے کہ مسلم معاشرے میں آکر یہ کتابیہ اسلام اور مسلمانوں سے متاثر ہو کر ایک نہ ایک دن اسلام قبول کر لے گی۔ یہی وجہ ہے کہ کسی مسلم عورت کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ غیر مسلم

کے ساتھ شادی کرے۔

اللہ تعالیٰ نے کتابیہ سے شادی کی جو اجازت دی ہے اس میں یہی حکمت پوشیدہ ہے کہ اس کتابیہ کو مسلم گھرانے میں لاکر زیادہ سے زیادہ اسلام سے قریب کیا جائے۔ مسلمانوں اور اہلِ کتاب کے درمیان جو خلیج ہے اسے کم کیا جائے اور دونوں کے درمیان محبت وموانست اور حسن معاشرت کو پروان چڑھایا جائے۔ اگر غور کریں تو اس اجازت کا فائدہ درحقیقت اسلام اور مسلمانوں کو پہنچنا چاہئے' لیکن اگر صورتِ حال یہ ہو کہ اس اجازت سے فائدہ کے بجائے اسلام اور مسلمانوں کو الٹا نقصان ہو رہا ہو تو یہ اجازت وہیں ختم ہو جانی چاہئے۔

اس صورت میں' میں کہہ سکتا ہوں کہ اس دور میں چونکہ مسلم معاشرے میں اسلامی اقدار نہایت کمزور ہیں۔ مرد حضرات اپنی بیویوں پر اثر انداز ہونے کے بجائے ان سے متاثر ہیں اس لئے کتابیات سے شادی کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔ اِلّا یہ کہ اس بات کی نہایت شدید ضرورت ہو۔

یہاں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ کتابیات سے شادی لاکھ جائز سہی' لیکن مسلم لڑکی سے شادی ہر حال میں افضل اور بہتر ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اسلام نے صرف مسلم لڑکی سے شادی کی ترغیب نہیں دی ہے' بلکہ اس بات کی ترغیب دی ہے کہ دین دار لڑکی سے شادی کی جائے' کیوں کہ دین دار لڑکی اللہ کو زیادہ خوش رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے شوہر کا حق بھی اَدا کر سکتی ہے اور اپنے گھر اور اپنی اولاد کی تربیت اسلامی انداز میں کر سکتی ہے۔ اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا ہے:

فَاظْفُرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ تَرِبَتْ يَدَاكَ.

دین دار لڑکی کو حاصل کرو (یعنی اس سے شادی کرو) تمہارا بھلا ہو۔

شوہر پر بیوی کا حق

سوال: میری شادی ایک ایسے شخص کے ساتھ ہوئی ہے جو مجھ سے بیس سال بڑا

ہے۔لیکن عمر کا یہ فرق میرے لئے کبھی بھی مسئلہ نہیں رہا۔میں اس فرق کو ذرا بھی اہمیت نہ دیتی اگر اس کا معاملہ میرے ساتھ بہتر ہوتا۔اس نے میرے نان نفقہ میں کبھی کمی نہیں کی بلکہ میرے اوپر خوب پیسے خرچ کرتا ہے اور کبھی میرے ساتھ جھگڑتا نہیں۔لیکن ان کے علاوہ اور چیزیں بھی تو ہیں جن کی مجھے ضرورت ہے۔دو میٹھے بول کے لئے میرے کان ترس گئے ہیں۔شوہر اور بیوی کے درمیان جو جذباتی لگاؤ اور محبت ہوتی ہے وہ جذباتیت اس کے اندر مفقود ہے۔اس کا معاملہ میرے ساتھ نہایت سرد اور ہر طرح کی گرم جوشی سے خالی ہے۔وہ مجھے صرف کھانا پکانے یا بچہ پیدا کرنے کی مشین سمجھتا ہے۔میں نے ایک دفعہ اس سے اس بات کی شکایت کی تو اس نے جواب دیا کہ کیا میں نے تمہارے نان نفقہ میں کبھی کوئی کمی کی؟

میں پوچھتی ہوں کہ کیا اسلامی شریعت کی رُو سے میرا حق صرف نان نفقہ تک محدود ہے؟ کیا میرا یہ حق نہیں کہ وہ میرے ساتھ محبت اور گرم جوشی کا مظاہرہ کرے۔مجھ سے میٹھی گفتگو کرے؟ اور میری نفسیاتی ضرورتوں کو پورا کرے؟ مجھے یقین ہے کہ یہ میرا حق ہے؟ کیا میرا یقین صحیح ہے؟

جواب: آپ کا خیال سو فیصد درست ہے۔کیوں کہ اسلامی شریعت نے شوہروں پر جہاں یہ واجب کیا ہے کہ بیویوں کی مادی ضروریات معروف طریقے سے پوری کریں وہیں نفسیاتی ضرورتوں کو بھی پورا کرنے کی تاکید کی ہے' بلکہ قرآن کریم نے تو اس نفسیاتی سکون اور محبت الفت کو عورتوں کی تخلیق کا مقصد بتایا ہے۔قرآن کا ارشاد ہے:

وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَجَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً ؕ (الروم:۲۱)

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تم میں سے ہی تمہارے لئے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت و رحمت کے بیج بوئے۔

اس آیت کے مطابق شادی شدہ زندگی کے اغراض و مقاصد میں یہ بھی شامل ہے کہ دونوں کے درمیان محبت والفت اور نفسیاتی سکون کی فضا قائم ہو۔ اگر شادی شدہ زندگی میں یہ نفسیاتی اور جذباتی عنصر مفقود ہو تو یہ وہ شادی نہیں جس کی طرف قرآن نے دعوت دی ہے:

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ (النساء:۱۹)

اور ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی گزارو۔

اس آیت کی رُو سے وہ شوہر حضرات زبردست غلطی پر ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ بیوی کو نان نفقہ دے کر' اس کے کھانے کپڑے کا انتظام کر کے' حقوق زوجیت سے آزاد ہو گئے۔ وہ یہ بھول رہے ہیں کہ بیوی کو کھانے، کپڑے کے علاوہ بھی کچھ چاہئے۔ اس کے لئے جتنا کھانا، کپڑا ضروری ہے اتنا ہی محبت، مسکراہٹ، چھیڑ چھاڑ اور جنسی تعلقات بھی ضروری ہیں۔

حضور ﷺ بھی اپنی ازواجِ مطہرات کے ساتھ اس نفسیاتی اور جذباتی پہلو کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ذیل میں حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ سے چند نمونے پیش کرتا ہوں۔

روایتوں میں ہے کہ بسا اوقات آپ ﷺ کی بعض بیویاں آپ ﷺ سے تلخ کلامی کرتی تھیں۔ ایسے موقعے پر آپ ﷺ ضبط سے کام لیتے تھے اور اس تلخ کلامی کا جواب محبت سے دیا کرتے تھے۔

حضور ﷺ ان کے ساتھ مذاق بھی فرماتے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی عقل کے لحاظ سے برتاؤ کرتے تھے۔ ان کے ساتھ تفریح بھی کرتے تھے۔ روایتوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ دوڑ بھی لگائی ہے۔ خود حضور ﷺ فرماتے تھے کہ:

اِنَّ اللّٰهَ يَبْغَضُ الْجَعِظَرِيَّ الْجَوَّاظَ۔

اللہ ان سے نفرت کرتا ہے جو اپنے گھر والوں کے لئے نہایت سخت اور اپنے آپ میں متکبر ہوں (شیخی بگھارتے ہوں)۔

نبی ﷺ کی مثال ہمارے لئے سب سے بہترین مثال ہے۔ حضور ﷺ اپنی تمام تر پیغمبرانہ اور سیاسی ذمہ داریوں کے باوجود اپنی بیویوں کے حقوق ادا کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی بیویوں کی جذباتی اور نفسیاتی ضرورتوں کا خیال رکھا۔ امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"حضور ﷺ کا اپنی بیبیوں کے ساتھ سلوک، حسنِ معاشرت اور حسنِ خلق پر مبنی ہوتا تھا۔ انصار کی لڑکیاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس کھیلنے کے لئے آیا کرتی تھیں۔ آپ ﷺ نے کبھی بھی انہیں ان کے ساتھ کھیلنے سے منع نہیں فرمایا، بہ شرطے کہ اس میں کوئی قابلِ گرفت بات نہ ہو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا برتن میں جس جگہ پانی پیتیں، حضور ﷺ بھی اپنا ہونٹ وہاں رکھتے اور پانی پیتے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کی گود میں سر رکھ کر قرآن پڑھتے۔ ان کی گود میں سر رکھ کر آرام کرتے۔ جب کچھ حبشی مسجدِ نبوی کے سامنے اپنے کرتب دکھا رہے تھے حضور ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو کھیل دکھایا۔ وہ آپ ﷺ کے کندھوں کا سہارا لئے ہوئے تھیں۔ حضور ﷺ فرماتے تھے:

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي. (زاد المعارج ا ص ۷۸-۷۹)

تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لئے بہتر ہو اور میں اپنے گھر والوں کے لئے تم سب سے بہتر ہوں۔

عصر کی نماز کے بعد، حضور ﷺ اپنی تمام بیویوں کے پاس تھوڑی دیر کے لئے جاتے اور رات میں اس بیوی کے پاس قیام کرتے جس کی باری ہوتی تھی۔ حضور ﷺ نے کبھی بھی اس میں غفلت نہیں برتی۔

البتہ حضور ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا کچھ خاص خیال رکھتے تھے، اس لئے کہ آپ ﷺ کی تمام بیویوں میں وہ سب سے کم سن اور شادی کے وقت کنواری تھیں۔ ظاہر

ہے کہ بیوہ یا مطلقہ عورتوں کے مقابلے میں انہیں زیادہ التفات کی ضرورت تھی۔

آپ ﷺ نے دیکھا کہ کس طرح حضور ﷺ اپنی بیویوں کی مادی ضروریات کے ساتھ ساتھ نفسیاتی اور جذباتی ضروریات کا خیال رکھتے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی حضور ﷺ کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی تمام تر سخت مزاجی کے باوجود فرماتے تھے کہ شوہر کو اپنی بیوی کے ساتھ بچوں کی طرح سلوک کرنا چاہیے۔ ان کے ساتھ کھیل کود کرنا چاہیے اور ان کے ساتھ محبت کرنی چاہیے۔

ہمارے لئے حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مثال سے بڑھ کر کون سی مثال ہو سکتی ہے؟

شوہر اور بیوی کے درمیان جنسی تعلقات

سوال: میں نے آپ کو بار بار کہتے ہوئے سنا ہے کہ دینی امور سے متعلق سوال کرنے میں کسی قسم کی شرم اور جھجک نہیں ہونی چاہیے۔ آج میں آپ کے سامنے ایسا سوال لے کر حاضر ہوں جس کا تعلق ہماری ازدواجی زندگی اور ہمارے درمیان جنسی تعلقات سے ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مجھے جنسی تلذذ کی شدید خواہش ہوتی ہے، میں اپنی بیوی کو اس غرض سے بلاتا ہوں، لیکن وہ کسی وجہ سے انکار کر دیتی ہے اور اس کام کے لئے راضی نہیں ہوتی۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اسلامی شریعت میں شوہر اور بیوی کے جنسی تعلقات کے بھی کچھ حدود ہیں کہ ان کا لحاظ کرنا ضروری ہے یا یہ معاملہ میاں بیوی کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ جیسا چاہیں کریں۔ تسلی بخش جواب مطلوب ہے۔

جواب: اس میں کوئی شک نہیں کہ دینی امور سے متعلق سوال کرنے میں کسی قسم کی شرم نہیں ہونی چاہیے۔ اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے انصار کی بعض عورتوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ شرم اور جھجک نے انہیں اس بات سے نہیں روکا کہ وہ دینی معاملات میں تفقہ حاصل کریں۔ ان میں سے کوئی حیض اور نفاس کے بارے میں سوال کرتی تھی تو کوئی منی، جنابت اور غسل کے بارے میں۔

جنس یا سیکس اور زوجین کے مابین جنسی تعلق کا مسئلہ ایک اہم موضوع ہے۔ انسان کی عملی زندگی میں جس کا بڑا عمل دخل ہے۔ اس معاملے سے عدم واقفیت یا غفلت انسان کو بسا اوقات غلط راستے پر ڈال سکتی ہے۔ اسلام بے شبہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس نے اس موضوع کی مکمل وضاحت کی ہے۔ تہذیب و اخلاق کا لحاظ رکھتے ہوئے ہر اس جنسی موضوع کی تشریح کی ہے جس کی ہمیں ضرورت ہوتی ہے۔

بعض لوگ یہ تصوّر کرتے ہیں کہ جنس یا سیکس جیسے اہم موضوع سے متعلق اسلام کی کوئی واضح رہنمائی نہیں ہے۔ بعض دوسرے حضرات یہ تصور کرتے ہیں کہ جنس محض ایک فحش موضوع ہے اس لئے اسلام جیسے پاکیزہ مذہب کو اس گندے موضوع پر کلام نہیں کرنا چاہئے۔ یہ دونوں تصوّرات غلط اور حقیقت سے دور ہیں۔

جنس بے شبہ ایک اہم اور حساس موضوع ہے۔ اسلامی شریعت نے اس کی طرف سے ہرگز غفلت نہیں برتی ہے۔ خود دورِ حاضر میں جنس کے ماہرین نے اس کی جانب کافی توجہ دی ہے اور اس سلسلے میں ان کے کچھ ارشادات اور کچھ نصیحتیں ہوتی ہیں، جن پر عمل کرنے کا وہ مشورہ دیتے ہیں۔ اسلام نے بھی ہمیں اس معاملے میں کچھ نصیحتیں کی ہیں۔ کچھ کرنے کو کہا ہے اور کچھ کرنے سے منع کیا ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں جنس سے متعلق اسلام کی کیا رہنمائیاں ہیں:

۱- اسلام انسانی فطرت میں جنسی شہوت کے وجود کا مکمل اعتراف کرتا ہے۔ اس لئے اسلام نے قانون کے دائرے میں اس جنسی شہوت کی تسکین کا مکمل بندوبست کیا ہے اور ان لوگوں کی سخت سرزنش کی ہے، جو خصی کرا کے اس شہوت کو جڑ سے ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا جو شادی اور عورت سے علیحدہ تجرد کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔

حدیث ہے:

أَنَا أَعْلَمُكُمْ بِاللّٰهِ وَأَخْشَاكُمْ لَهُ. وَلٰكِنِّي أَقُومُ وَأَنَامُ وَأَصُومُ وَأُفْطِرُ وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي.

میں تم سے زیادہ اللہ کو جانتا ہوں اور اس سے ڈرتا ہوں' لیکن میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں' روزہ بھی رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا اور عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں۔ جس نے میری سنّت سے منہ موڑا وہ مجھ سے نہیں ہے۔

اسی لئے حضور ﷺ نے متعدّد احادیث میں اپنی اُمت کو شادی کی ترغیب دی ہے اور فرماتے تھے کہ اس دنیا میں سے دو چیزیں مجھے نہایت محبوب ہیں۔ عورت اور خوش بو۔

۲- شادی کے بعد اسلام نے شوہر اور بیوی دونوں کو اس بات کا حق دیا ہے کہ وہ اپنی جنسی خواہشوں اور شہوتوں کی تسکین کا انتظام اپنی مرضی کے مطابق کر سکتے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر اسلام نے اس جنسی تسکین کو عبادت اور عملِ خیر سے تعبیر کیا ہے۔ مسلم شریف کی حدیث ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ اللہ کے رسول ﷺ! شوہر اپنی بیوی کے ساتھ جماع کرتا ہے' کیا اس پر اسے اجر ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیوں نہیں، ذرا سوچو کہ اگر اس نے اپنی بیوی کے علاوہ کسی دوسری عورت کے ساتھ یہی کام کیا ہوتا تو کیا اسے گناہ نہ ہوتا؟ چوں کہ حلال طریقے سے اس نے اپنی بیوی کے ساتھ یہ کام کیا ہے تو اسے اس کا اجر بھی ملنا چاہئے۔

تاہم اسلام نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ شوہر چوں کہ فطری طور پر اور سماجی عادات واطوار کے لحاظ سے زیادہ جری اور Bold ہوتا ہے۔ اس لئے وہی اپنی بیوی کو اس جنسی تسکین کی طرف دعوت دیتا ہے۔ بیوی اپنی شرم وحیا کی وجہ سے اس بات کی طرف دعوت نہیں دیتی۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ عورتوں کے مقابلے میں مردوں کے اندر جنسی شہوت کہیں زیادہ ہوتی ہے اور اس معاملے میں صبر کرنے کی صلاحیت کم ہوتی ہے جب کہ عورتوں میں صبر کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے اور جنسی شہوت مردوں کے مقابلے میں کم ہوتی ہے۔ لوگوں کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ عورتوں کے اندر مردوں سے زیادہ جنسی شہوت ہوتی ہے۔

اسی لئے اسلامی شریعت نے بیوی پر یہ واجب کیا ہے کہ شوہر جب اسے اس کام کی طرف دعوت دے تو وہ انکار نہ کرے۔ حدیث ہے:

اِذَا دَعَا الرَّجُلُ زَوْجَتَهُ لِحَاجَتِهٖ فَلْتَأْتِهٖ وَاِنْ كَانَتْ عَلَى التَّنُّوْرِ۔

(ترمذی)

جب کوئی شخص اپنی بیوی کو اپنی اس ضرورت کے لئے بلائے تو بیوی کو اس کے پاس جانا چاہئے' چاہے وہ چولہے پر کھانا پکا رہی ہو۔

اور انکار کرنے کی صورت میں فرشتے اس پر لعنت بھیجتے ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے:

اِذَا دَعَا الرَّجُلُ اِمْرَأَتَهُ اِلٰی فِرَاشِهٖ فَاَبَتْ اَنْ تَجِیْئَ فَبَاتَ غَضْبَانَ عَلَیْهَا لَعَنَتْهَا الْمَلَائِكَةُ حَتّٰی تُصْبِحَ۔ (بخاری و مسلم)

جب کوئی شخص اپنی بیوی کو بستر کی طرف بلائے اور بیوی آنے سے انکار کر دے اور شوہر اس سے ناراض ہو کر رات گزارے تو صبح تک فرشتے اس بیوی پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔

اِلّا یہ کہ اس انکار کی واقعی کوئی معقول وجہ ہو۔ مثلاً بیماری ہو یا بہت زیادہ تھکاوٹ ہو یا کوئی شرعی رکاوٹ ہو وغیرہ۔

اس جنسی شہوت کی خاطر اسلام نے بیوی پر یہ فرض کیا ہے کہ وہ نفلی روزہ اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر نہ رکھے۔ حدیثِ نبوی ﷺ ہے:

لَا تَصُوْمُ الْمَرْأَةُ وَ زَوْجُهَا شَاهِدٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ۔ (بخاری و مسلم)

عورت کوئی نفلی روزہ نہ رکھے' جب کہ اس کا شوہر موجود ہو' مگر اس کی اجازت سے۔

۴- اسلام نے ایک طرف شوہروں کی شہوانی قوت کا خیال کیا ہے اور اس کی تسکین کے وسائل مہیا کئے ہیں تو دوسری طرف عورتوں کی شہوانی قوت کو بھی نظر انداز

نہیں کیا ہے اور اس کی تسکین کا سامان کیا ہے۔ اسی لئے آپ ﷺ نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے جو کہ عام طور پر دن میں روزہ رکھتے تھے اور راتیں تہجد کے نوافل میں گزار دیتے تھے، فرمایا:

اِنَّ لِبَدَنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِاَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا۔

تم پر تمہارے بدن کا بھی حق ہے اور تم پر تمہارے گھر والوں کا بھی حق ہے۔

اسی لئے علماءِ کرام نے شوہروں کو ہدایت کی ہے کہ بیویوں کی جنسی تسکین کا پورا خیال رکھیں۔ انہیں صرف اپنی جنسی تسکین سے غرض نہ ہو، بلکہ اپنی بیوی کی خواہشوں کو بھی مدّنظر رکھیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ شوہر کو چاہئے کہ ہر چوتھی رات اپنی بیوی سے مباشرت کرے۔ بیوی کا خیال کرتے ہوئے وہ اس مدّت میں کمی بیشی بھی کر سکتا ہے۔(٦)

حدیث میں ہے کہ جماع سے قبل بیوی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور بوسے بازی ہونی چاہئے تاکہ عورت کی جنسی شہوت خوب جاگے اور تب جاکر اس کی تسکین ہو۔ ایسا نہ ہو کہ ایک دم سے عورت پر ٹوٹ پڑے اور جانوروں کی طرح اپنی خواہش پوری کر کے چلتا بنے۔ حدیث ہے:

لَا يَقَعَنَّ اَحَدُكُمْ عَلٰى اِمْرَأَتِهٖ كَمَا تَقَعُ الْبَهِيْمَةُ وَلٰكِنَّ بَيْنَهُمَا رَسُوْلٌ، قِيْلَ وَمَا الرَّسُوْلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ الْقُبْلَةُ وَالْكَلَامُ۔

(مسند الفردوس)

تم میں سے کوئی اپنی بیوی پر اس طرح نہ گر پڑے جس طرح جانور گرتے ہیں۔ پہلے دونوں کے درمیان پیغام رسانی ہونی چاہئے۔ پوچھا گیا کہ پیغام رسانی کا کیا مطلب یا رسول اللہ؟ آپ ﷺ نے فرمایا بوسے بازی اور محبت بھری بات چیت۔

اسی حدیث میں آگے مرد کی تین کمزوریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک

کمزوری یہ بتائی کہ مرد اپنی بیوی کے پاس جائے اور بات چیت اور الفت ومحبت کے اظہار سے قبل اپنی بیوی سے جماع کرے۔ اپنی ضرورت پوری کر لے اور بیوی کو یونہی چھوڑ کر چلتا بنے۔(۷)

قرآن نے بھی دو مقامات پر زوجین کے مابین جنسی تعلقات کا تذکرہ نہایت ہی لطیف اور بلیغ انداز میں کیا ہے۔ پہلا تذکرہ سورہ بقرہ میں ہے:

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَآئِكُمْ ط هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ أَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ط (البقرۃ:۱۸۷)

تمہارے لئے روزوں کے زمانے میں راتوں کو اپنی بیویوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا ہے۔ وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو۔

اس آیت میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کے لئے لباس قرار دیا گیا ہے۔ کتنی شاندار اور کیسی مبنی بر حقیقت تعبیر ہے یہ۔ حقیقت یہ ہے کہ شوہر اور بیوی ایک دوسرے کے لئے لباس کی مانند ہیں کہ لباس ستر پوشی کا کام بھی دیتا ہے۔ سردی گرمی سے بچاتا ہے۔ بدن سے چپکا بھی ہوتا ہے اور باعثِ زینت وزیبائش بھی ہوتا ہے۔

دوسرا تذکرہ بھی سورہ بقرہ میں ہے:

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ (البقرۃ:۲۲۳)

تمہاری عورتیں تمہارے لئے کھیتیاں ہیں۔ تمہیں اختیار ہے، جس طرح چاہو اپنی کھیتی میں جاؤ۔

اس آیت میں بیویوں کو کھیتی سے تعبیر کیا گیا ہے اور شوہروں کو اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ اپنی کھیتی میں اپنی مرضی سے بیج بو سکتے ہیں۔

ذرا غور کریں کہ قرآن نے کس قدر بلیغ انداز میں اور نہایت اختصار کے ساتھ زوجین کے مابین جنسی تعلقات کے مسئلہ کو لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ کیا ان آیات کو

پڑھنے کے بعد بھی کوئی عقل مند کہہ سکتا ہے کہ جنس یا سیکس سے متعلق اسلام کوئی واضح ہدایت نہیں دیتا؟

ازدواجی زندگی میں جائز چھوٹ

سوال: میں نے جس شخص سے شادی کی ہے وہ بڑا شکی ہے۔ اکثر مجھ سے سوال کرتا رہتا ہے کہ کیا میں اس کے سوا کسی اور سے بھی محبت کرتی ہوں اور ہمیشہ میں اس سے یہی کہتی ہوں کہ مجھے اس کے علاوہ کسی اور سے محبت نہیں ہے اور کسی شخص سے میرے کوئی مراسم نہیں ہیں۔ وہ مجھ سے اس بات پر قسم کھانے کو کہتا ہے اور میں قسم کھالیتی ہوں۔ اس سے بھی بڑھ کر وہ مجھ سے یہ پوچھتا ہے کہ کیا شادی سے قبل میں کسی اور سے محبت کرتی تھی؟ اور اس بات پر وہ اللہ تعالیٰ کی قسم کھانے کو کہتا ہے۔ میں اس سے کہتی ہوں کہ ان سب کی کیا ضرورت ہے؟ کیا تمہارے لئے میرے پیار میں کوئی کمی ہے؟ کیا ہماری زندگی ہنسی خوشی نہیں گزر رہی ہے؟ لیکن وہ مُصر ہے کہ میں اس بات پر اللہ کا نام لے کر قسم کھاؤں کہ شادی سے قبل میں کسی اور سے محبت نہیں کرتی تھی۔ میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔ یہ سچ ہے کہ شادی سے قبل ایک دور کے رشتے دار نوجوان سے مجھے محبت ہو گئی تھی لیکن یہ ایسی محبت نہیں تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے پاگل ہوں۔ قسمت میں اس کے ساتھ شادی نہیں لکھی تھی، چنانچہ شادی کے بعد میں اس نوجوان کو بھول گئی۔ اب اس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیا اگر میں شوہر کو خوش کرنے کے لئے اور اپنے بسے بسائے گھر کو تباہی سے بچانے کے لئے میں اللہ کی جھوٹی قسم کھالیتی ہوں تو اللہ کو ناراض کروں گی؟ اگر قسم نہیں کھاتی ہوں تو اس کا شک بڑھتا جائے گا اور یقین میں تبدیل ہو جائے گا اور یوں میری ازدواجی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ میں حیران ہوں کہ کیا کروں؟

جواب: بے شبہ جھوٹ بولنا اسلام کی نظر میں حرام ہے اور گناہِ کبیرہ ہے۔ کیوں کہ جھوٹ کے نقصانات لامحدود ہیں اور اس کا بُرا اثر فرد، جماعت اور سوسائٹی سب پر پڑتا ہے، لیکن اسلام ایک ایسا دین ہے جو انسان کی فطری ضرورتوں اور پریشانیوں سے صرفِ

نظر نہیں کرتا۔ اگر اسلام نے سور کے گوشت کو حرام کیا ہے تو بوقتِ ضرورت اسے حلال بھی کیا ہے۔

اسی طرح جھوٹ بولنا جو کہ ایک حرام کام ہے بعض اضطراری صورتوں میں اسلامی شریعت نے اسے جائز کیا ہے۔ درج ذیل حدیث میں ان اضطراری صورتوں کا تذکرہ ہے۔ ام کلثوم رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

مَا سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ يُرَخِّصُ فِيْ شَيْءٍ مِّنَ الْكِذْبِ اِلَّا فِيْ ثَلَاثٍ اَلرَّجُلُ يَقُوْلُ الْقَوْلَ يُرِيْدُ بِهِ الْاِصْلَاحَ وَالرَّجُلُ يَقُوْلُ الْقَوْلَ فِي الْحَرْبِ وَالرَّجُلُ يُحَدِّثُ اِمْرَأَتَهٗ وَالْمَرْأَةُ تُحَدِّثُ زَوْجَهَا۔ (مسلم)

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی نہیں سنا کہ انہوں نے کچھ بھی جھوٹ بولنے کی چھوٹ دی ہو سوائے تین حالتوں میں۔ کوئی شخص جھوٹ بولے اور اس کے ذریعے سے لوگوں کے درمیان صلح صفائی کرنا چاہتا ہو، یا کوئی شخص جنگ کے موقع پر جھوٹ بولے یا شوہر اپنی بیوی سے اور بیوی اپنے شوہر سے جھوٹ بولے۔

دو آدمیوں کے درمیان صلح کراتے وقت اگر آپ دونوں کی دشمنی بھری باتیں ایک دوسرے کو بتائیں گے تو ظاہر ہے کہ دشمنی اور بڑھے گی۔ حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ تھوڑا بہت جھوٹ کا سہارا لے کر ان دونوں کے درمیان صلح صفائی کی کوشش کریں۔ اسی طرح اگر آپ سچ بولنے کے جنون میں حالت جنگ میں دشمنوں کو اپنے ملک کے بارے میں صحیح صحیح معلومات فراہم کرتے ہیں تو یہ بات آپ کے ملک کے لئے نہایت خطرناک ثابت ہوگی۔ حکمت و مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ دشمنوں کو صحیح معلومات فراہم نہ کریں۔

اسی طرح شوہر اپنی بیوی سے یا بیوی اپنے شوہر سے انتہائی شدید ضرورت کے

وقت جھوٹ بول سکتی ہے۔ شدید ضرورت یہ ہے کہ سچ بولنے سے گھر کی تباہی یقینی ہو یا دونوں کے تعلقات انتہائی خراب ہونے کا امکان ہو۔ حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اپنے شوہر کو اپنے ماضی کی داستان ہرگز نہ بتائیں۔ کیوں کہ جیسا کہ آپ نے بتایا کہ وہ شکی ہے اور آپ کی زبان سے حقیقت سن کر وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے شوہر کا قسم کھانے پر اصرار کرنا ہی سرے سے غلط ہے۔ اس کی دو وجوہ ہیں:

۱- وہ خواہ مخواہ ایسے ماضی کو کریدنے کی کوشش کر رہا ہے، جس سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایسا کر کے اسے کیا ملے گا؟ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ نوجوانی کی عمر میں لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ لیکن جب کسی اور سے شادی ہو جاتی ہے تو ایک دوسرے کو بھول جاتے ہیں۔ اب اس کا کیا فائدہ ہے کہ بھولی بسری باتوں کو پھر سے تازہ کیا جائے۔ شادی کے بعد اگر بیوی اپنے شوہر سے خالص محبت کرتی ہے۔ اس کی خدمت کرتی ہے اور اس کے سارے حقوق ادا کرتی ہے تو شوہر کے لئے یہ کافی ہے۔ اسے کیا ضرورت ہے کہ ماضی کی باتوں کو کرید کر اپنی بنی بنائی زندگی کو تباہ کر لے۔

۲- اللہ کی قسم کھلانے سے شوہر کو کیا فائدہ ہوگا؟ بیوی اگر دین دار نہیں ہے، اللہ سے نہیں ڈرتی ہے تو اس کے لئے اللہ کی جھوٹی قسم کھانا کیا مشکل ہے۔ اس کا قسم کھانا اور نہ کھانا دونوں برابر ہے۔ لیکن اگر بیوی دین دار ہے اور خدا سے ڈرتی ہے تو شوہر کے لئے یہی بہت کافی ہے کہ اس کی بیوی ایک صالح خاتون ہے۔ اسے سوچنا چاہئے کہ اس کے بار بار اصرار کرنے پر اس کی بیوی اللہ کی جھوٹی قسم بھی کھا سکتی ہے اور ایسی حالت میں گناہ بیوی کو نہیں ہوگا بلکہ اس گناہ کا ذمے دار وہ خود ہوگا۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جو صورتِ حال آپ کو درپیش ہے، ایسی صورت میں آپ اللہ کی جھوٹی قسم کھا سکتی ہیں، تاکہ آپ کے شوہر کا شک رفع ہو اور آپ کی ازدواجی زندگی تباہ ہونے سے بچ جائے۔ بعد میں آپ خدا سے اس بات کے لئے توبہ و استغفار کر سکتی ہیں۔

اسی طرح کا واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں پیش آیا تھا۔ ابن ابی عذرۃ الدولی اکثر اپنی بیویوں کو طلاق دے دیا کرتا تھا۔ اس کی وجہ سے لوگ اسے ناپسند کرنے لگے تھے۔ جب اسے اس بات کا پتہ چلا تو اپنی بیوی کے پاس آیا اور اس سے مطالبہ کیا کہ وہ اللہ کی قسم کھا کر بتائے کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے یا نفرت بیوی نے شروع میں قسم کھانے سے اعراض کیا' لیکن شوہر کے اصرار پر قسم کھائی اور بتایا کہ وہ اس سے نفرت کرتی ہے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیوی کی سرزنش کی اور کہا کہ تمہیں ایسے موقع پر جھوٹ بولنا چاہئے تھا۔ یہ سچ تمہارا گھر تباہ کر سکتا ہے۔

بے شبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ محض ایک خلیفہ ہی نہیں تھے بلکہ وہ مسلمانوں کے زبردست مربی، معلّم اور فقیہ بھی تھے۔

بیوہ عورت سے متعلق چند غلط رسمیں

سوال: بیوہ عورت کے سلسلے میں ہمارے یہاں عجیب وغریب قسم کے رسم ورواج ہیں۔ مثلاً یہ کہ ایام عدت میں وہ کسی مرد سے بات نہیں کر سکتی اور نہ کوئی اس سے بات کر سکتا ہے اور نہ اس کے پاس آ سکتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض محرم مرد بھی اس کے پاس نہیں آ سکتے۔ ایام عدت میں وہ کسی مرد کی طرف ایک نظر بھی نہیں دیکھ سکتی' اگر کسی پر نظر پڑ گئی تو اسے غسل کرنا پڑے گا۔ ایام عدت میں وہ چاند کو نہیں دیکھ سکتی اور نہ کھانا پکا سکتی ہے۔ جب اس کی عدّت کی مدّت ختم ہو جاتی ہے تو اسے سمندر کی طرف لے جایا جاتا ہے اس حالت میں کہ اس کی دونوں آنکھیں بند ہوتی ہیں۔ اسی طرح کے متعدّد رسم ورواج ہیں۔ ان کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب: زمانہ قدیم ہی سے مختلف مذاہب وملل نے بیوہ عورت کے ساتھ مختلف سلوک کیا ہے۔ ان میں بعض وہ ہیں جو بیوہ عورت کو اس کے شوہر کے ساتھ ہی زندہ جلا دیا کرتے تھے۔ بعض نے بیوہ عورت کے لئے دوسری شادی کو تاحیات حرام قرار دے دیا۔ خواہ بیوہ عورت جوان ہی کیوں نہ ہو۔ عربوں نے بھی زمانہ جاہلیت میں بیواؤں کے

ساتھ ظالمانہ سلوک روا رکھا تھا۔ چنانچہ ان کے نزدیک بیوہ عورت حقِ وراثت سے بالکل محروم ہوتی تھی۔ اس کی قسمت کا فیصلہ اُس کے اولیاء اپنی مرضی سے کیا کرتے تھے۔ ان کی مرضی ہوتی تو دوبارہ اس کی شادی ہو جاتی' ورنہ نہیں۔ بیوہ کی اپنی کوئی مرضی نہیں تھی۔ بیوہ خواہ کتنی ہی مالی مشکلات میں ہو اپنے شوہر کی جائیداد میں سے ایک پیسے کی بھی حق دار نہیں تھی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ بیوہ کو حکم دیا جاتا تھا کہ مکمل ایک سال تک وہ کوئی اچھا لباس زیب تن نہ کرے' بلکہ خراب سے خراب تر لباس استعمال کرے۔ مکمل ایک سال تک نہ خوش بو لگائے اور نہ کسی قسم کی سج دھج کرے اور سال مکمل ہونے کے بعد مختلف قسم کی بے معنیٰ اور الٹی سیدھی حرکتیں اس سے کروائی جاتی تھیں۔

اس سارے خرافات اور ظلم و ناانصافی سے ہٹ کر اسلام کا سلوک بیوہ عورتوں کے ساتھ مکمل انصاف اور حق پر مبنی ہے۔ اسلام نے بیوہ عورتوں پر صرف تین چیزیں واجب کی ہیں:

۱- عدّت: یعنی شوہر کی وفات سے لے کر چار مہینے دس دن تک وہ کسی اور سے شادی نہیں کر سکتی۔ اس مدّت کے گزر جانے کے بعد وہ آزاد ہے چاہے تو شادی کرے اور چاہے تو نہ کرے۔ بیوہ اگر حاملہ ہے تو اس کی عدت بچے کی پیدائش تک ہے۔

مطلّقہ عورت کے مقابلے میں بیوہ عورت کی عدت قدرے طویل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ طلاق کے مقابلے میں شوہر کی وفات زیادہ تکلیف دہ اور باعثِ حزن و غم ہے۔ اس کیفیت سے نکلنے کے لئے اور نارمل ہونے کے لئے قدرے طویل مدّت درکار ہوتی ہے۔

۲- زینت و زیبائش سے پرہیز: عدت کی مدّت تک بیوہ عورت ہر قسم کی سج دھج اور سامان زینت سے پرہیز کرے گی۔ یہ غم کے اظہار کا موقع ہے۔ غم کا اظہار اور سج دھج دو مختلف چیزیں ہیں۔ بیوہ عورت کا حق ہے کہ اپنے غم کے اظہار کے لئے عدت کی مدّت تک ہر قسم کی زیب و زینت کا استعمال ترک کر دے۔ بخاری اور مسلم شریف کی

حدیث ہے:

حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ ایک عورت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میری بیٹی کا شوہر انتقال کر گیا ہے۔ میری بیٹی کی آنکھ میں تکلیف ہے۔ کیا وہ سرمہ لگا سکتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں۔ اس نے دو تین دفعہ یہی سوال کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی جواب دیا۔ پھر فرمایا کہ صرف چار مہینے دس دن کی بات ہے' زمانہ جاہلیت میں تو عورتیں ایک سال تک ایسا کرتی تھیں۔

بخاری اور مسلم کی دوسری حدیث ہے:

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن عورت کے لئے جائز نہیں کہ کسی میّت کا سوگ تین دن سے زیادہ منائے۔ سوائے اپنے شوہر کے۔ اپنے شوہر کا سوگ وہ چار مہینے دس دن تک منائے گی۔

ابوداؤد اور نسائی کی حدیث ہے:

حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیوہ عورت نہ رنگین کپڑے پہنے، نہ زیور استعمال کرے، نہ خضاب لگائے اور نہ سرمہ لگائے۔

ابوداؤد کی دوسری حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیوہ عورت کو عطر اور مہندی لگانے سے منع فرمایا ہے۔

۳- تیسری چیز یہ ہے کہ شوہر کی وفات کے بعد سے عدت کی مدّت ختم ہونے تک بیوہ عورت اپنے شوہر کے گھر ہی میں رہے گی۔ روایت میں ہے:

حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ کی بہن فریعہ بنت مالک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور عرض کیا کہ ان کے شوہر کو قتل کر دیا گیا ہے۔ کیا وہ اپنے گھر والوں کے پاس لوٹ سکتی ہیں؟ کیوں کہ ان کے شوہر نے کوئی ایسا گھر نہیں چھوڑا ہے جو ان کی ملکیت میں ہو اور نہ

نان ونفقہ ہی چھوڑا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا عدت کی مدت ختم ہونے تک تم اپنے شوہر کے گھر ہی میں رہو۔ (ابوداؤد، ترمذی)

شوہر کے گھر پر رہنا اس کے لئے ضروری ہے' کیوں کہ اس طرح وہ ہر قسم کے شک وشبہ سے پاک رہے گی اور ذہنی طور پر بھی شوہر کے گھر میں وہ زیادہ سکون محسوس کرے گی۔ البتہ وہ ضرورت کی خاطر گھر سے نکل سکتی ہے۔ مثلاً علاج کی خاطر یا نوکری کی خاطر' اگر وہ نوکری کرتی ہے۔ لیکن وہ صرف دن میں نکل سکتی ہے۔ رات بہر حال اسے اپنے شوہر کے گھر ہی پر گزارنی ہوگی۔ روایت میں ہے کہ غزوۂ اُحد کے موقع پر شہید ہونے والوں کی بیوائیں حضور ﷺ کے پاس آئیں اور کہنے لگیں کہ رات کو ہمیں بڑی وحشت اور تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔ کیا ہم کسی دوسری عورت کے پاس جا کر سو جایا کریں؟ صبح پھر اپنے گھر لوٹ آئیں گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

"کسی عورت کے پاس جا کر جتنی مرضی ہو باتیں کرو اور اپنی تنہائی ختم کرو' لیکن رات کو سوتے وقت ہر عورت کو اپنے گھر واپس آجانا چاہئے۔"

یہ اس لئے کہ رات کو کہیں اور سونا اس کے لئے شک، تہمت اور بدنامی کا باعث بن سکتا ہے۔ اس مدت میں وہ نماز پڑھنے کے لئے مسجد بھی نہیں جا سکتی اور نہ کسی سفر پر نکل سکتی ہے' چاہے حج یا عمرہ ہی کا سفر کیوں نہ ہو۔

صرف یہی تین چیزیں ہیں، جو اسلام نے بیوہ عورتوں پر واجب کی ہیں۔ ان کے سلسلے میں دوسروں پر یہ واجب ہے کہ وہ عدت کی مدت تک انہیں شادی کا پیغام نہ دیں۔ البتہ اشارے کنایے میں رشتے کی بات کر سکتے ہیں جیسا کہ قرآن میں ہے:

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنتُمْ فِيٓ اَنفُسِكُمْ ۚ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَن تَقُولُوا قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۚ وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهُ ۚ (البقرۃ:۲۳۵)

زمانہ عدت میں خواہ تم ان بیوہ عورتوں کے ساتھ منگنی کا ارادہ اشارے کنایے میں ظاہر کر دو خواہ دل میں چھپائے رکھو دونوں صورتوں میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ ان کا خیال تمہارے دل میں آئے گا ہی۔ مگر دیکھو خفیہ عہد و پیمان نہ کرنا۔ اگر کوئی بات کرنی ہے تو معروف طریقے سے کرو۔ اور عقد نکاح باندھنے کا فیصلہ اس وقت تک نہ کرو جب تک کہ عدت پوری نہ ہو جائے۔

عدت کی مدت ختم ہونے کے بعد بیوہ عورت اپنے معاملے میں آزاد ہے، چاہے شادی کرے یا نہ کرے۔ اس پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ہونا چاہئے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ (البقرۃ:۲۳۴)

جو لوگ وفات پائیں ان کے پیچھے ان کی بیویاں اگر زندہ ہوں تو وہ اپنے آپ کو چار مہینے دس دن روکے رکھیں۔ پھر جب ان کی عدت پوری ہو جائے تو انہیں اختیار ہے اپنی ذات کے معاملے میں معروف طریقے سے جو چاہیں کریں۔ تم پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

اسی طرح شریعت نے بیوہ کو مکمل حقِ وراثت دیا ہے۔ چاہے اس کی اولاد ہو یا نہ ہو۔ کوئی شخص اس کا یہ حق سلب نہیں کرسکتا۔

رہا ان عادات و تقالید یا رسم و رواج کا مسئلہ جن کا آپ نے تذکرہ کیا ہے اور بعض معاشروں میں رائج ہیں تو ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لئے ان سب باتوں سے پرہیز ضروری ہے۔

یتیم بچوں کا اپنے دادا کی جائیداد میں حقِ وراثت

سوال: ہم تین بھائی ہیں۔ سب سے بڑے بھائی کی عمر صرف چودہ سال ہے۔

میرے والد کا میرے دادا کی حیات ہی میں انتقال ہوگیا۔ ان کی موت کے بعد ہمارے دادا نے ہماری کفالت کی۔ پھر ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ جب وراثت کی تقسیم کا وقت آیا تو ہمارے چچاؤں نے ہمارے دادا کی جائیداد میں سے بطورِ وراثت کچھ بھی ہمیں نہیں دیا۔ حالانکہ ہم یتیم بھی ہیں اور تنگ دست بھی۔ اور ہمارے چچا کافی مال دار ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلامی شریعت کی رُو سے ہمیں اپنے دادا کی جائیداد میں سے بطورِ وراثت کچھ بھی نہیں مل سکتا۔ کیا واقعی اسلامی شریعت کے لحاظ سے ہم اس وراثت سے محروم ہیں؟

جواب: اسلامی شریعت میں وراثت کا اصول اور قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ وراثت میں سب سے پہلا حق دار وہ ہے جو رشتہ میں میت کا سب سے زیادہ قریبی ہو۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ قریب کا رشتہ دار اپنے سے دور کے رشتے دار کو وراثت سے محروم کردیتا ہے۔ اس قاعدے کی رُو سے آپ کے چچا حضرات کی یہ بات صحیح ہے کہ آپ کے دادا کی وراثت میں آپ بچوں کا کوئی حق نہیں ہے۔ کیوں کہ آپ کے چچا کا آپ کے دادا سے رشتہ زیادہ قریبی ہے۔ وہ ان کے بیٹے ہیں اور آپ ان کے بیٹے کے بیٹے ہیں۔ اس لئے میّت سے رشتے میں زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے وراثت میں آپ کے چچا حضرات کا حق ہے۔ آپ لوگوں کا نہیں۔

لیکن بچوں کا مسئلہ برقرار رہتا ہے اور یہ ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ اسلام نے اس کا حل پیش نہ کیا ہو۔ اسلام نے مختلف طریقوں سے اس مسئلے کا حل پیش کیا ہے۔

۱- پہلا حل یہ ہے کہ دادا کو اپنے مرنے سے قبل اپنے پوتوں کے لئے وصیّت کرنی چاہیئے تھی۔ دادا کو علم تھا کہ ہمارے پوتے یتیم ہیں اور وراثت میں سے بھی انہیں کچھ ملنے والا نہیں ہے۔ ایسی صورتِ حال میں دادا کو چاہیئے تھا کہ اپنی جائیداد کا کچھ حصہ اپنے پوتوں کے نام کردیتے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا

الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرہ:۱۸۰)

تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آئے اور وہ اپنے پیچھے مال چھوڑ رہا ہو تو والدین اور رشتے داروں کے لئے معروف طریقہ سے وصیّت کرے۔

بعض فقہاء کے نزدیک وصیّت سنّت اور مستحب ہے اور بعض فقہاء کے نزدیک یہ وصیّت کرنا واجب ہے۔ کیونکہ لفظ ''کتب'' وجوب پر دلالت کرتا ہے نہ کہ استحباب پر۔ میرے نزدیک بھی یہ وصیّت واجب ہے' لیکن یہ وصیّت مال کے تہائی حصے سے زائد کی نہیں ہونی چاہئے۔

بعض مسلم ممالک میں ایک قانون موجود ہے جسے واجبی وصیّت کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یعنی دادا کے لئے واجب ہے کہ موت سے قبل وصیّت کر جائے۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکا تب بھی وصیّت نافذ العمل تصوّر کی جائے گی۔

۲- دوسرا حل یہ ہے کہ وراثت کی تقسیم کے وقت چچاؤں کو چاہئے کہ مالِ وراثت میں سے کچھ انہیں بھی دیں جو تنگ دست اور یتیم ہیں۔ اللہ کا ارشاد ہے۔

وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ○ (النساء:۸)

اور جب تقسیم کے موقع پر کنبے کے لوگ اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو اور ان کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرو۔

چچاؤں کو سوچنا چاہئے کہ ان کے بھتیجے ان کے قریبی رشتے دار بھی ہیں۔ یتیم بھی ہیں اور مسکین بھی ہیں۔ اگر انہیں خدا کے حکم کا پاس ہے اور ان یتیموں کا خیال ہے تو ان یتیموں کو اس مالِ وراثت میں سے کچھ عطا کرنا چاہئے۔ یہ ان کی مرضی اور سخاوت پر منحصر ہے کہ وہ کتنا عطا کرتے ہیں۔

۳- اس کا تیسرا حل یہ ہے کہ اسلامی شریعت نے واجبی نفقے کا تصوّر پیش کیا ہے۔

یعنی اگر کوئی شخص مالدار ہے اور اس کا قریبی رشتے دار نہایت غریب ہے تو اس مال دار پر واجب ہے کہ اس غریب رشتے دار کے نان نفقے کی ذمہ داری قبول کرے۔

اس واجبی نفقے کا قانون آپ کو دینِ اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب اور دین میں نہیں ملے گا۔ اس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام میں انسانی حقوق کی کس قدر اہمیت ہے۔

آپ لوگوں نے جو صورتِ حال پیش کی ہے کہ آپ کے چچا مال دار ہیں اور وراثت میں بھی ان ہی کا حق ہے اور آپ یتیم اور مسکین ہیں تو آپ کے چچاؤں کے لئے اسلامی نقطہ نظر سے جائز نہیں ہے کہ وہ آپ کو بغیر نان نفقے کے چھوڑ دیں۔ اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو آپ بے شبہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتے ہیں۔

کسی کمیونسٹ کا اپنے والدین کی وراثت میں حقدار ہونا

سوال: اولاد اللہ تعالیٰ کی نعمت ہوتی ہے۔ لیکن جب یہی اولاد سرکش، نافرمان اور بے دین ہو جائے تو والدین کے لئے عذاب بھی بن جاتی ہے۔ میں بھی ان بدنصیب والدین میں سے ہوں، میں نے اپنے بڑے لڑکے کو تعلیم کی خاطر ملک سے باہر بھیجا۔ اس نے وہاں جا کر تعلیم حاصل کی اور ساتھ ہی ساتھ اس نے وہاں کے مذہب یعنی کمیونزم کو اختیار کر لیا۔ اب وہ کسی مذہب کو نہیں مانتا۔ خدا کو نہیں مانتا۔ اسلام کی تعلیمات کا مذاق اڑاتا ہے۔ میں یا میرے دوسرے بچے جب اس سے بحث کرتے ہیں اور اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ دینِ اسلام کی شان میں گستاخیاں کرتا ہے۔ اس لئے اب ہم نے اس سے کچھ کہنا چھوڑ دیا ہے۔ میرے آبا و اجداد دین دار تھے اور میں خود بھی بحمد اللہ دین دار ہوں' لیکن میرا یہ بیٹا بددین ہو کر میرے لئے ناسور بن گیا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا وہ میری جائیداد میں وارث ہو گا۔ اس کی لامذہبیت اور سرکشی کے ہم والدین کس حد تک ذمہ دار ہیں؟ کیا اللہ کے حضور اس بارے میں ہم جواب دہ ہوں گے؟ اور ہمیں اس کی سزا ملے گی؟ مجھے تسلی بخش جواب مطلوب ہے۔

جواب: آپ کے سوال سے مشابہ ہی اس عورت کا سوال تھا جس نے کسی کمیونسٹ مرد سے شادی کے جواز کی بابت سوال کیا تھا۔ اسے میں نے یہ جواب دیا تھا کہ کسی مسلمان عورت کی شادی کسی کمیونسٹ مرد سے کسی حال میں جائز نہیں ہے۔ کیونکہ محض اسلامی نام رکھ لینے سے کوئی شخص مسلمان نہیں ہو جاتا۔ جب تک وہ دینِ اسلام پر یقین کامل نہ رکھتا ہو اسے مسلمانوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ کمیونزم وہ تصوّر ہے جو کسی مذہب کو نہیں مانتا۔ کسی خدا کو تسلیم نہیں کرتا اور مذہب کی باتوں کو خرافات تصوّر کرتا ہے۔ کمیونزم تو شرک سے بھی بدتر گناہ ہے۔ کیوں کہ مشرک شخص کم از کم خدا پر ایمان رکھتا ہے۔ بعض مشرکین آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں اور مذہب کی بہت ساری باتوں کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن کمیونزم نہ خدا کو تسلیم کرتا ہے اور نہ کسی مذہبی بات کو۔

ان اسباب کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو اولاد کمیونزم پر مُصر ہو اور اس سے توبہ کرنے پر آمادہ نہ ہو تو ایسی اولاد اپنے مسلم والدین کی جائیداد کی وارث نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ وراثت کی اوّلین شرط ہے وحدتِ دین۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ وَلَا الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ۔ (صحاح ستہ)

نہ مسلمان کسی کافر کا وارث ہو سکتا ہے اور نہ کوئی کافر کسی مسلمان کا وارث ہو سکتا ہے۔

بلکہ ایسی اولاد جو دینِ اسلام کو تسلیم نہیں کرتی ہے وہ مسلم گھرانے کا فرد شمار نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب نوح علیہ السلام نے اپنے کافر بیٹے کی خاطر دعا کرتے ہوئے کہا تھا:

رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ

خدایا! میرا بیٹا میرے اہل میں سے ہے۔

اس پر خدا نے ان کی سرزنش کی اور فرمایا:

يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (ہود:۴۶)

اے نوح! وہ تیرے گھرانے والوں میں سے نہیں ہے، وہ تو ایک بگڑا ہوا کام

ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ کفر کی وجہ سے باپ اور بیٹے کے درمیان رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح فقہاء کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ مرتد شخص بھی اپنے مسلم رشتہ داروں کی جائیداد کا وارث نہیں ہو سکتا۔

البتہ مسلم شخص اپنے کافر رشتہ داروں کا وارث ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض فقہاء کے نزدیک مسلم شخص کافر رشتہ داروں کا وارث ہو سکتا ہے' کیوں کہ حدیث ہے:

اَلْإِسْلَامَ يَعْلُوْ وَلَا يُعْلٰى. (ابوداؤد، حاکم)

اسلام غالب ہونے کے لئے ہے۔ مغلوب ہونے کے لئے نہیں۔

دلیل کے طور پر انہوں نے اس واقعے کو بھی نقل کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مسود العجلی کو جب اس کے مرتد ہونے پر قتل کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جائیداد اس کے مسلمان وارثوں میں تقسیم کی۔ بعض فقہاء کے نزدیک صرف مرتد شخص کا وارث ہوا جا سکتا ہے۔ انہوں نے بھی دلیل کے طور پر اس واقعے کو نقل کیا ہے۔

بہر حال اس بات پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ کافر اور مرتد شخص اپنے مسلمان رشتے داروں کا وارث نہیں ہو سکتا۔

رہی یہ بات کہ والدین اپنے بچے کی لادینیت کے کس حد تک ذمہ دار ہیں اور عنداللہ اس کے جواب دہ ہیں یا نہیں۔ اس کا جواب مختصراً حاضر ہے۔

والدین نے اگر اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کی طرف بچپن ہی سے کوئی دھیان نہ دیا ہو یا اس میں کوتاہی برتی ہو۔ انہیں اسلامی ماحول فراہم نہ کیا ہو۔ انہیں اچھی اچھی باتیں نہ سکھائی ہوں اور سختی کے وقت ان پر سختی نہ کی ہو تو بے شبہ ایسے والدین اولاد کے بگڑنے کے ذمے دار ہیں' اگر اولاد بگڑ جاتی ہے۔ والدین کی ذمہ داری محض کھانا کپڑا فراہم کرنا نہیں ہے۔ حدیث ہے:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ وَالرَّجُلُ فِيْ اَهْلِ بَيْتِهٖ رَاعٍ وَّهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ۔ (بخاری اور مسلم)

تم میں سے ہر شخص ذمے دار ہے اور اپنی رعیت کے سلسلہ میں جواب دہ ہے۔ مرد اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے اور وہ اپنے گھر والوں کے سلسلہ میں جواب دہ ہے۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم:۶)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے۔

اس کے برعکس اگر والدین نے اپنے بچے کی تعلیم وتربیت کی طرف پوری توجہ دی ہو اور اس کو مناسب اور اسلامی ماحول بھی فراہم کیا ہو اور اس کے باوجود بچہ بگڑ جائے تو والدین اس کے بگڑنے کے ذمے دار نہیں ہیں۔ وہ اللہ کے نزدیک اس بارے میں جواب دہ نہیں ہیں۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کی تربیت پر پوری توجہ صرف کی اور پھر بھی وہ کافر رہا۔ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو ہر ممکن طریقے سے اسلام کی طرف راغب کیا لیکن وہ کافر ہی مرا۔ لوط علیہ السلام نے اپنی بیوی کو لاکھ سمجھایا لیکن اس نے کفر کا راستہ ترک نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی شخص کو اس کی استطاعت سے زیادہ مکلّف نہیں کرتا۔ انسان کی ذمے داری راہِ صداقت کی طرف بلانا ہے، ہدایت دینا نہیں۔ ہدایت دینا تو صرف اللہ تعالیٰ کے بس میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (القصص:۵۶)

اے نبی! تم جسے چاہو ہدایت نہیں دے سکتے۔ مگر اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

جائز اور ناجائز طلاق

سوال: میں ایک شادی شدہ مرد ہوں۔ میری ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہے۔ بیوی کے ساتھ بعض اختلافات کی وجہ سے میں نے اسے طلاق دے دی۔ طلاق کے ایک ہفتہ کے بعد پتا چلا کہ میری بیوی حمل سے ہے۔ کیا یہ طلاق جائز اور صحیح ہے؟

جواب: اسلامی شریعت کی نظر میں طلاق ایک تکلیف دہ آپریشن کی مانند ہے۔ یہ تکلیف دہ آپریشن بہ ذاتِ خود کسی تکلیف اور بیماری کو دور کرنے کے لئے اس وقت کیا جاتا ہے جب آپریشن کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ ہو۔ اس کا استعمال صرف انتہائی مجبوری کے موقع پر کسی تکلیف دہ حالت کو دور کرنے کے لئے ہونا چاہئے۔ اس لئے حدیث ہے:

اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَی اللّٰهِ الطَّلَاقُ. (ابوداؤد)

اللہ کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ حلال شے طلاق ہے۔

اس لئے اسلامی شریعت نے طلاق کے لئے کچھ شرطیں رکھی ہیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ چھوٹے چھوٹے اسباب کی بنا پر ازدواجی زندگی تباہ ہونے لگے۔ ان شرطوں میں سے ایک شرط وقت کی شرط ہے۔ شوہر کو چاہئے کہ طلاق کے لئے کسی مناسب وقت کا انتخاب کرے۔ چنانچہ طلاق حیض کی حالت میں نہیں دینی چاہئے بلکہ پاکی کی حالت میں دینی چاہئے اور اس پاکی میں جس میں ابھی اس نے بیوی کے ساتھ مباشرت نہ کی ہو۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ اور ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ درج ذیل آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس سے مقصود ایسی پاکی ہے، جس میں مباشرت نہ ہوئی ہو۔ آیت ہے:

اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ (الطلاق:۱)

جب تم لوگ عورتوں کو طلاق دو تو انہیں ان کی عدت کے لئے طلاق دیا کرو۔

اس میں مصلحت یہ ہے کہ حیض کی حالت' نارمل حالت نہیں ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں شوہر کے لئے مناسب نہیں کہ بیوی کو خود سے جدا کرے اور ایسی پاکی کی حالت میں'

جس میں اس نے بیوی کے ساتھ مباشرت کی ہو اس میں بھی بیوی کو خود سے جدا کرنا مناسب نہیں ہے' کیوں کہ عین ممکن ہے کہ اس مباشرت کی وجہ سے بیوی حاملہ ہو جائے اور عین ممکن ہے کہ اس حمل کی وجہ سے شوہر طلاق کے ارادے کو تبدیل کر دے۔

لیکن بالفرض اگر کسی نے حیض کی حالت میں یا ایسی پاکی کی حالت میں جس میں اس نے بیوی کے ساتھ مباشرت کی ہو، طلاق دے دی، تو کیا طلاق واقع ہو گی؟ اس سلسلے میں علماء کا اختلاف ہے۔ جمہور فقہاء کے نزدیک یہ طلاق واقع ہو جائے گی۔ اگر چہ شوہر نے ایسے وقت میں طلاق دے کر ایک گناہ کیا۔ کیوں کہ ایسے وقت میں طلاق دینا جائز نہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ طلاق تو ہو جائے گی' لیکن عدت کے بعد دوبارہ اس بیوی کو اپنی زوجیت میں واپس لینا پڑے گا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دے دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ وہ اپنی بیوی کو دوبارہ اپنی زوجیت میں واپس لے لیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بیوی کو دوبارہ زوجیت میں واپس لینا واجب ہے۔ بعض فقہاء کہتے ہیں کہ چوں کہ حیض کی حالت میں طلاق دینا جائز نہیں' اس لئے اس حالت میں دی گئی طلاق سرے سے واقع ہی نہیں ہوتی۔

بیوی اگر حاملہ ہو اور طلاق دیتے وقت معلوم ہو کہ وہ حاملہ ہے تو ایسی حالت میں طلاق دینا جائز ہے اور ایسی طلاق واقع ہو جائے گی اس کی دلیل ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے:

فلیطلقها طاهرا او حاملا۔ (بخاری، مسلم)

اسے طلاق دے' پاکی کی حالت میں یا حمل کی حالت میں۔

شرابی کی طلاق

سوال: میرے والدِ محترم نے میری شادی ایک ایسے مال دار شخص سے کر دی جو شراب پینے کا عادی ہے۔ اب میرے اس سے بچے بھی ہیں۔ میں جب بھی اسے نصیحت

کرتی ہوں اور اسے دین کی طرف راغب کرنا چاہتی ہوں' وہ میرا مذاق اڑاتا ہے اور کبھی گالم گلوچ پر اتر آتا ہے۔ بعض اوقات اسی نشے کی حالت میں طلاق دے ڈالتا ہے' حالانکہ مجھے یقین ہے کہ طلاق دینا اس کا مقصد ہرگز نہیں ہوتا۔ بعض لوگ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ طلاق تو ہوگئی اگرچہ اس نے نشے کی حالت میں طلاق دی ہے اور طلاق دینا اس کا مقصد نہیں تھا۔ کیوں کہ نشے کا استعمال اس نے اپنی مرضی سے کیا اور اپنی مرضی سے ہوش حواس کھوئے' اس لئے اس کی سزا یہ ہے کہ طلاق واقع ہو جائے۔ لوگ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ مجھے اس سے علیحدگی اختیار کر لینی چاہئے' کیوں کہ میں مطلّقہ ہوں۔ علیحدگی اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ میرا سارا گھر اور میری ازدواجی زندگی تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گی۔ ایسی میں مجھے کیا کرنا چاہئے؟

جواب: طلاق کے سلسلے میں شروع سے ہی علماء کے دو گروہ پائے جاتے ہیں۔

۱- پہلا گروہ وہ ہے جن کا فتویٰ طلاق سے متعلق بڑا سخت ہے۔ اس میں وہ لوگ ہیں جن کے نزدیک پاگل کی دی ہوئی طلاق بھی واقع ہو جاتی ہے۔ زبردستی دی ہوئی طلاق بھی واقع ہو جاتی ہے۔ بھول چوک سے طلاق دینے سے بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ خواہ کتنے بھی غصے کی حالت میں طلاق دی گئی ہو' طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ طلاق کا لفظ استعمال نہ بھی کیا ہو اور کسی دوسرے لفظ کے ذریعہ سے طلاق دی ہو، جب بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ اس گروہ کے نزدیک نشے کی حالت میں دی ہوئی طلاق بھی واقع ہو جاتی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے۔ ان کی دلیل درج ذیل ہے۔

الف: نشے کی حالت میں بھی وہ شخص مکلّف ہے۔ کیوں کہ نشے کی حالت میں اگر وہ کسی گناہ یا جرم کا ارتکاب کرتا ہے، تو وہ گناہ گار اور مجرم کہلاتا ہے اور اس جرم کی اسے سزا ملتی ہے۔ نشے میں ہونا' اس کے لئے معافی کا سبب نہیں بن سکتا۔ اسی طرح نشے میں ہونا اس کے لئے عدم طلاق کا سبب بھی نہیں ہو سکتا۔

ب: اس نے اپنے ارادے اور اختیار سے نشے کا استعمال کیا ہے۔ اس لئے بطور سزا طلاق واقع ہوگئی۔

۲- دوسرا گروہ وہ ہے جس کے نزدیک طلاق اس وقت واقع ہوتی ہے، جب کامل ہوش وحواس کے ساتھ اور سوچ سمجھ کر طلاق دی گئی ہو۔ چنانچہ ان کے نزدیک نشے کی حالت میں دی گئی طلاق واقع نہیں ہوئی۔ یہ رائے جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مثلاً عثمان رضی اللہ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ اور تابعین کی ہے۔ امام بخاری کی بھی یہی رائے ہے۔ انہوں نے بخاری شریف میں اس سلسلے میں علیحدہ باب باندھا ہے اور احادیث سے ثابت کیا ہے کہ نشے کی حالت میں یا زبردستی دی گئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ ذیل میں چند دلیلیں پیش کرتا ہوں۔

الف: حدیث ہے:

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ.

یعنی عمل کا دارومدار نیّت پر ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ شرابی جب نشے کی حالت میں طلاق دیتا ہے تو طلاق دینا اس کی نیّت نہیں ہوتی ہے۔

ب: حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ سے جب زنا کا ارتکاب ہوا اور پھر اس کا اقرار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ ان کا منہ سونگھ کر پتا کریں کہ کہیں وہ نشے کی حالت میں تو اقرار نہیں کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نشے کی حالت میں کیا ہوا اقرار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک معتبر نہیں ہے۔

ج: اس بات پر تمام فقہا کا اتفاق ہے کہ نشے کی حالت میں نماز نہیں ہوتی کیوں کہ اس سلسلے میں اللہ کا صریح حکم موجود ہے۔ جس طرح مدہوشی کی وجہ سے یہ نماز نہیں ہوتی۔ اسی طرح وہ تصرفات بھی واقع نہیں ہوتے جن میں براہِ راست عقل کا استعمال ہو مثلاً نشے کی حالت میں کی گئی خرید وفروخت کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

د: ابنِ عباس رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ اور عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے مروی ہے کہ انہوں نے پاگل اور شرابی کی طلاق کو کالعدم قرار دیا۔

ان سب دلائل کی روشنی میں یہی بات صحیح تر معلوم ہوتی ہے کہ نشے کی حالت میں دی گئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ اس لئے میں اپنی دینی بہن سے کہنا چاہوں گا کہ وہ مطمئن رہیں۔ کیوں کہ ان کے شوہر کے منہ سے نکلا ہوا لفظ طلاق دراصل نشے کی حالت میں اور طلاق کے ارادے کے بغیر ہوتا ہے اس لئے یہ طلاق سرے سے واقع نہیں ہوتی ہے۔

غصہ کی حالت میں طلاق

سوال: میں فطری طور پر ایک نہایت غصہ ور شخص ہوں۔ جب مجھے غصہ آتا ہے تو اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا۔ اکثر اس غصہ کی وجہ سے بیوی سے میرا جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔ اور میں ایک سے زائد بار اسے شدید غصہ کی حالت میں طلاق دے چکا ہوں' حالانکہ طلاق دینا میرا مقصد نہیں تھا اور نہ میں نے اس بارے میں کبھی سوچا ہے۔ دو طلاق دینے کے بعد بعض اہلِ علم حضرات نے فتویٰ دیا کہ میں ان دو طلاقوں کے بعد بھی بیوی کی طرف رجوع کرسکتا ہوں۔ کچھ دنوں کے بعد پھر شدید جھگڑا ہوا اور میں نے پھر طلاق دے دی۔ اب اہلِ علم کہتے ہیں کہ حلالے کے بغیر میری بیوی میرے لئے جائز نہیں ہے۔ اب میں بڑی مشکل میں ہوں۔ میری ازدواجی زندگی تباہ ہوتی نظر آرہی ہے۔ اس تباہی سے نکلنے کی کیا کوئی صورت ہوسکتی ہے؟

جواب: سب سے پہلے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ حلالہ اگر قصداً صرف اس لئے کیا جائے کہ بیوی اپنے پہلے شوہر کی طرف لوٹ آئے تو یہ حرام ہے اور اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلالہ کرنے والے اور حلالہ کروانے والے پر لعنت بھیجی ہے۔ (۸) عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ اگر میرے پاس ان دونوں کو لایا جائے تو میں انہیں سنگسار کردوں۔

چنانچہ آپ اگر حلالے کا انتظام محض اس لئے کریں کہ آپ کی بیوی آپ کی طرف

لوٹ آئے تو یہ ایک حرام کام ہوگا۔

اب میں اصل سوال کا جواب دیتا ہوں۔

غصہ کی تین قسمیں ہیں۔

۱- ایک وہ غصہ ہوتا ہے جو ذرا ہلکا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں انسان کے ہوش وحواس اور عقل قابو میں رہتے ہیں۔ اس غصہ کی حالت میں وہ جو کچھ کہتا ہے یا کرتا ہے سوچ سمجھ کر کرتا ہے۔ اس قسم کے غصہ میں اگر کوئی شخص طلاق دیتا ہے تو تمام فقہاء کے نزدیک طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

۲- دوسرا غصہ وہ ہوتا ہے جو انتہائی شدید ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں انسان اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے اور عقل قابو میں نہیں رہتی۔ غصہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ ایسی حالت میں انسان بلاسوچے سمجھے کچھ بھی کرسکتا ہے۔ حالانکہ ایسا کرنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا ہے۔ اس قسم کے غصے میں تمام فقہاء کے نزدیک طلاق واقع نہیں ہوتی ہے۔

۳- تیسرا غصہ وہ ہوتا ہے جو ان دونوں حالتوں کے درمیان ہوتا ہے۔ نہ بہت دھیما اور ہلکا ہوتا ہے اور نہ اتنا شدید کہ غصے سے انسان پاگل ہو جائے۔ اس قسم کے غصہ میں طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ اس سلسلے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک واقع ہو جاتی ہے اور بعض کے نزدیک نہیں ہوتی۔

میری نظر میں راجح قول یہ ہے کہ ایسی حالت میں طلاق واقع نہیں ہوتی ہے۔ درج ذیل دلائل کی بناء پر:

الف: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا طَلَاقَ وَلَا عِتَاقَ فِیْ اِغْلَاقٍ۔ (مسند احمد، ابوداؤد، حاکم)

اغلاق کی حالت میں نہ طلاق ہوتی ہے اور نہ غلام کی آزادی۔

شارحین نے اغلاق کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے مراد ہے شدید غصہ یا زبردستی۔ یعنی اگر کسی نے غصہ کی حالت میں طلاق دی یا کسی کی زبردستی کی وجہ سے

طلاق دی تو طلاق واقع نہیں ہوتی۔

ب: اللہ کا فرمان ہے:

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ (البقرہ:۲۲۵)

یعنی اللہ تمہاری پکڑ' لغو یمین میں نہیں کرتا ہے۔

ج: حقیقت یہ ہے کہ غصہ کی حالت میں انسان صحیح فیصلہ کرنے سے عاجز ہوتا ہے۔ اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا:

لا یقضی القاضی وھو غضبان۔

یعنی قاضی غصہ کی حالت میں فیصلہ نہ دے۔

حقیقت یہ ہے کہ طلاق بھی ایک قسم کا فیصلہ ہوتا ہے۔ بیوی کے سلسلے میں اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ غصہ کی حالت میں طلاق دے۔ اگر دے دیتا ہے تو مناسب بات یہی ہوگی کہ اس طلاق کا اعتبار نہ ہو۔

د: نشے کی حالت میں طلاق نہ واقع ہونے کے سلسلے میں جو دلیلیں میں نے پچھلے فتوے میں پیش کی تھیں، وہ ساری دلیلیں یہاں بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ بلکہ غصے کی حالت تو نشے کی حالت سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ کیوں کہ شرابی کبھی اپنے آپ کو قتل نہیں کرتا اور نہ اپنے بچے کو بلندی سے نیچے پھینکتا ہے۔ لیکن غصے کی حالت میں انسان ایسا کر سکتا ہے۔

آخر میں' میں واضح کرتا چلوں کہ وہ کون سا غصہ ہے جس میں طلاق واقع نہیں ہوتی ہے۔

علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ الاسلام امام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کے مطابق یہ وہ غصہ ہے جس میں انسان اپنے ہوش حواس کھو بیٹھے اور وہ بغیر کسی ارادے کے کچھ بھی کر سکتا ہو۔ اس کی علامت یہ ہے کہ غصے کی حالت میں وہ کچھ ایسی حرکتیں کرتا ہے، جو نارمل حالت میں نہیں کر سکتا۔ اور اس کی علامت یہ بھی ہے کہ غصہ ختم ہو جانے کے بعد انسان کو

اپنی ان حرکتوں پر شرمندگی اور ندامت ہو جو اس نے غصے کی حالت میں کی ہوں۔ اگر غصہ ختم ہو جانے کے بعد طلاق کے فیصلے پر نادم ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہرگز طلاق دینے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

نکاحِ حلالہ

سوال: ایک خاتون جو چار بچوں کی ماں ہے اور اپنے شوہر سے محبت بھی کرتی ہے بعض شدید اختلافات کی بنا پر شوہر نے اسے تینوں طلاقیں دے ڈالیں۔ کچھ مدّت گزر جانے کے بعد ان دونوں نے از سر نو ازدواجی رشتے میں منسلک ہونے کا فیصلہ کیا لیکن حلالے کے بغیر ایسا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ خاتون نے کسی دوسرے مرد سے ایک ہفتہ کے لئے شادی کی اور اس سے طلاق لے کر دوبارہ اپنے سابق شوہر کی زوجیت میں چلی آئی۔ کیا شرعاً ایسا کرنا حلال ہے؟

جواب: دینِ اسلام نے ازدواجی زندگی کی تعمیر نہایت مضبوط بنیادوں پر کی ہے۔ اس لئے شادی شدہ زندگی میں داخلے کے لئے چند لازمی ارکان و شرائط ہیں اور اسی طرح اس سے نکلنے کے لئے بھی چند شرطیں ہیں جن کا پایا جانا ضروری ہے۔ اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا:

لَا تُطَلِّقُوا النِّسَآءَ اِلَّا مِنْ رِّيْبَةٍ۔

یعنی اپنی عورتوں کو صرف اس وقت طلاق دو، جب ان سے کوئی بہت بڑی بداخلاقی سرزد ہو۔

اور اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا:

اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى الطَّلَاقُ۔

اللہ کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ حلال شئے طلاق ہے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ناپسندیدگی کے باوجود اپنی بیویوں کو طلاق مت دو! کیوں کہ:

فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ○ (النساء:۱۹)

اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناپسند ہو مگر اللہ نے اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔

ابنِ عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

انما الطّلاق عن وطر۔

یعنی طلاق انتہائی ناگزیر حالت میں دی جا سکتی ہے۔

گزشتہ فتوے میں ذکر کر چکا ہوں کہ علماء مندرجہ ذیل حدیث کی بنا پر شدید غصے کی حالت میں دی گئی طلاق کو کالعدم قرار دیتے ہیں! حدیث ہے:

لَا طَلَاقَ وَلَا عِتَاقَ فِيْ اِغْلَاقٍ۔

اغلاق کی حالت میں نہ طلاق واقع ہوتی ہے اور نہ غلام کی آزادی۔

اب میں ان خاتون کو مخاطب کر کے سوال کرتا ہوں، جنہیں ان کے شوہر نے تین طلاقیں دی ہیں، کیا آپ کے شوہر نے انتہائی غصے کی حالت میں طلاق دی؟ اگر غصے کی حالت میں طلاق دی ہے تو یہ طلاق واقع نہیں ہوئی۔ یا کیا آپ کے شوہر نے اس وقت طلاق دی جب آپ حیض کی حالت میں تھیں یا ایسی پاکی میں طلاق دی جس میں آپ کے شوہر نے آپ سے مباشرت بھی کی ہے۔ تو ایسی طلاق طلاقِ بدعت کہلاتی ہے اور شریعت میں ایسی طلاق جائز نہیں ہے۔ اس لئے یہ طلاق بھی واقع نہیں ہوئی۔

اگر آپ کے شوہر نے آپ کو طلاق یوں دی ہے کہ اگر آپ نے فلاں کام کیا یا فلاں سے ملیں، یا فلاں کے گھر گئیں تو آپ کو طلاق ہو جائے گی اور پھر اس کے بعد آپ نے وہ کام کر لیا تو اس صورت میں بھی طلاق واقع نہیں ہوئی۔

طلاق واقع ہونے کے لئے ضروری ہے کہ طلاق سوچ سمجھ کر اور کامل ارادے سے دی گئی ہو اور شوہر غصے یا جنون یا نشے کی حالت میں نہ ہو۔

رہی حلالہ کی وہ شکل جو آپ نے لکھی ہے یا تو وہ یقیناً حرام ہے اور اللہ کے رسول ﷺ نے اس طرح حلالہ کرنے اور کروانے والے پر لعنت بھیجی ہے۔ حلالہ کی جائز صورت یہ ہے کہ تین دفعہ کی مطلقہ عورت نے کسی دوسرے مرد سے شادی اس غرض سے کی ہو کہ اب ہمیشہ اس کے پاس رہنا ہے۔ اس غرض سے نہ کی ہو کہ چند دنوں کے بعد طلاق لے کر پہلے شوہر کے پاس واپس جانا ہے۔ اب اگر اس شادی کے بعد کسی وجہ سے طلاق ہو جاتی ہے تو پھر وہ عورت پہلے شوہر کی زوجیت میں آسکتی ہے۔

بیوی کا اپنے شوہر کے مال میں جائز حق

سوال: میں ایک امیر شخص کی بیوی ہوں۔ میرے شوہر کا بینک بیلنس بھی کافی مضبوط ہے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ انتہائی بخیل ہے۔ میرے اوپر میرے بچوں کے نان نفقہ میں انتہائی بخل سے کام لیتا ہے۔ خرچ کے لئے بہت تھوڑی رقم دیتا ہے جو کہ ایک دولت مند شخص کی بیوی کے لئے ہرگز کافی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سے کم تر دولت والوں کی حالت بھی ہم سے بہت اچھی ہے۔ ایسی حالت میں کیا میرے لئے جائز ہوگا کہ میں اپنی ضرورتوں کے لئے اپنے شوہر کے پیسے بغیر انہیں بتائے لے لیا کروں اور اپنی ضرورتوں پر انہیں خرچ کروں؟

جواب: نہایت افسوس کی بات ہے کہ ہمارے معاشرے میں ایک طرف کچھ شوہر تو ایسے ہیں جو اپنی بیوی پر انتہائی فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہیں ان کی تمام جائز و ناجائز خواہشات پوری کرتے ہیں اور ان پر اپنا سب کچھ لٹا دیتے ہیں اور دوسری طرف کچھ ایسے شوہر بھی ہیں جو انتہائی بخیل ہیں اپنی بیوی اور بال بچوں کے نان نفقے میں حد درجہ کنجوسی سے کام لیتے ہیں۔

یہ دونوں صورتیں غلط ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہر بات میں میانہ روی اور اعتدال کا حکم دیا ہے۔ پیسہ خرچ کرنے کے معاملہ میں بھی اللہ نے اسی اعتدال کا حکم دیا ہے۔ وہ فرماتا ہے:

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ○ (بنی اسرائیل:۲۹)

نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھ اور نہ اسے بالکل ہی کھلا چھوڑ دے (یعنی نہ فضول خرچی کر اور نہ کنجوسی کر) کہ تو ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ۔

اور اپنے نیک بندوں کی تعریف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ○ (الفرقان:٦٧)

جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل، بلکہ ان کا خرچ دونوں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے۔

بیوی اور بال بچوں کے نان نفقے میں میانہ روی کی کیا صورت ہوگی، شریعت نے اس کی کوئی حد تو مقرر نہیں کی ہے' البتہ قرآن وحدیث کی رُو سے میانہ روی یہ ہے کہ ان کی ضرورتوں کو معروف طریقہ سے پورا کیا جائے۔ معروف طریقے سے ضرورتوں کو پورا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بیوی کی جائز ضروریات اور مناسب خواہشوں کو مدّ نظر رکھا جائے۔ بیوی نے جن حالات میں نشو ونما پائی ہے ان کا خیال کیا جائے۔ شوہر خود کس قدر صاحبِ حیثیت ہے اس کو نظر میں رکھا جائے۔ شوہر اگر مال دار ہے تو اسے اپنی اچھی پوزیشن کے مطابق اپنے اہلِ خانہ پر خرچ کرنا چاہئے اور اگر تنگ دست ہے تو اپنی بساط بھر اپنے گھر والوں پر خرچ کرے۔ قرآن نے اس طرف اشارہ کیا ہے:

لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ۭ (الطلاق:۷)

خوش حال آدمی اپنی خوش حالی کے مطابق نفقہ دے اور جس کو رزق کم دیا گیا ہو وہ اسی مال میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے۔

دوسری آیت ہے:

وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًاۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ (البقرۃ:۲۳۶)

اس صورت میں انہیں کچھ نہ کچھ دینا چاہئے خوش حال آدمی اپنی مقدرت کے مطابق اور غریب آدمی اپنی مقدرت کے مطابق معروف طریقہ سے دے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب 'الاحیاء' میں لکھا ہے کہ شوہر اپنی بیوی پر نہ کنجوسی کرے اور نہ فضول خرچی کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا.

یعنی کھاؤ پیو لیکن فضول خرچی نہ کرو۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ. (ترمذی)

یعنی تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لئے بہتر ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک پیسہ وہ ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ کیا جاتا ہے اور ایک وہ ہے جو غلام آزاد کرنے کے لئے خرچ کیا جاتا ہے۔ ایک وہ ہے جو غریبوں پر خرچ کیا جاتا ہے اور ایک وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے نان نفقے پر خرچ کیا جاتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ باعثِ اجر وثواب وہ پیسہ ہے جو اپنے گھر والوں کے نان نفقے پر خرچ کیا جاتا ہے۔ (۹)

ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیوی ہند کو بھی یہ شکایت تھی کہ ان کے شوہر ان کے نان نفقے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ ہند نے اپنا معاملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خُذِىْ مَا يَكْفِيْكِ وَوَلَدَكِ بِالْمَعْرُوْفِ. (بخاری اور مسلم)

تم اتنا لے لیا کرو جو تمہارے اور تمہارے بچوں کے لئے معروف طریقے سے

کافی ہو۔

اس حدیث کی رُو سے آپ بھی اپنے شوہر کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر اتنا کچھ لے سکتی ہیں جو معروف طریقے سے آپ کی اور آپ کے بال بچوں کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کافی ہو اور کافی سے زیادہ لینا کسی طرح درست نہیں ہے۔

حضور ﷺ کی چار سے زائد شادیوں کا مسئلہ

سوال: نبی ﷺ نے نو شادیاں کیں جب کہ دوسرے تمام مسلمانوں کے لئے چار سے زائد شادیاں ناجائز ہیں۔ اس میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟ اکثر اعتراض کرنے والے اس قسم کا سوال کر کے ذہنوں میں شک وشبہ پیدا کرتے ہیں اور اسے مذاق کا موضوع بناتے ہیں۔ آپ سے تسلی بخش جواب مطلوب ہے۔

جواب: زمانۂ جاہلیت میں ایک سے زائد شادیوں پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ زمانہ قدیم میں تقریباً ہر جگہ یہی حال تھا۔ ایک شخص جتنی چاہے شادیاں کر سکتا تھا۔

اسلام نے اس روایت کو ختم کیا اور بہ یک وقت چار سے زائد شادیوں پر پابندی لگا دی۔ جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس چار سے زائد بیویاں تھیں آپ ﷺ نے ان سے فرمایا:

اِخْتَرْ مِنْهُنَّ اَرْبَعًا وَطَلِّقْ سَائِرَهُنَّ

ان میں سے چار کا انتخاب کر لو اور باقی کو طلاق دے دو۔

اور اسلام نے ایک سے زائد شادی کی بھی اجازت اس شرط پر دی ہے کہ تمام بیویوں کے درمیان ایک جیسا اور انصاف پر مبنی سلوک کیا جائے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (النساء:۳)

لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو۔

پھر بھی اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو تمام لوگوں کے مقابلے میں ایک خاص مقام

عطا کیا اور انہیں اس حکم سے مستثنیٰ رکھا کہ اپنی تمام بیویوں میں سے صرف چار کو رکھیں اور باقی کو طلاق دے دیں۔ البتہ یہ حکم ضرور دیا کہ اب مزید کوئی شادی نہیں کر سکتے خواہ کوئی عورت کتنی ہی پسند کیوں نہ آ جائے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم قرآن کی اس آیت میں موجود ہے:

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ (الاحزاب:۵۲)

اس کے بعد تمہارے لئے دوسری عورتیں حلال نہیں ہیں اور نہ اس کی اجازت ہے کہ ان کی جگہ دوسری بیویاں لے آؤ، خواہ ان کا حسن تمہیں کتنا ہی پسند ہو۔

اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو اس حکم سے مستثنیٰ رکھا کہ اپنی تمام بیویوں میں سے چار کو رکھیں اور باقی کو طلاق دے دیں۔ اس میں یہ حکمت پوشیدہ تھی کہ رسول اللہ کی زوجیت میں آ کر ان بیویوں کو معاشرہ میں ایک خاص مقام حاصل ہو گیا۔ حضور ﷺ کی بیوی ہونے کے باعث انہیں تمام مسلمانوں کی ماں بن جانے کا شرف حاصل ہوا۔ اللہ فرماتا ہے:

وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ (الاحزاب:۶)

اور نبی ﷺ کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔

مسلمانوں کی ماں بن جانے کے بعد اس رشتہ کے حوالے سے تمام مسلمانوں کے لئے یہ حرام قرار پایا کہ وہ ان سے شادیاں کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ؕ (الاحزاب:۵۳)

تمہارے لئے یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کو تکلیف دو اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے بعد ان کی بیویوں سے نکاح کرو۔

ذرا غور کریں اگر نبی ﷺ نے اپنی بیویوں میں سے چار کو چھوڑ کر بقیہ کو طلاق دے

دی ہوتی تو ان مطلقہ بیویوں کے لئے تمام عمر کسی اور سے شادی کرنا حرام ہوتا۔ اور مجبوراً انہیں بغیر کسی شوہر کے عمر بھر طلاق شدہ زندگی گزارنی پڑتی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ شادی کی وجہ سے حضور ﷺ کے گھر سے جو انہیں انتساب حاصل ہوا تھا۔ طلاق کے بعد یہ انتساب ختم ہو جاتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بغیر کسی جرم کے انہیں اتنی بڑی سزا اور محرومی کا شکار ہونا پڑتا۔

پھر ذرا یہ غور کریں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو اس بات کا حکم دیا ہوتا کہ اپنی تمام بیویوں میں سے چار کو رکھو اور باقی کو طلاق دو تو حضور ﷺ کے لئے یہ فیصلہ کرنا کس قدر دشوار ہوتا کہ نو بیویوں میں سے کن چار کو رکھیں اور کن پانچ کو طلاق دے دیں۔ تمام بیویاں آپ ﷺ کی نظر میں برابر تھیں مسئلہ صرف طلاق دینے کا نہیں تھا بلکہ اس طلاق کی وجہ سے باقی پانچ بیویاں اس عظیم شرف سے محروم ہو جاتیں کہ وہ مسلمانوں کی مائیں کہلائیں اور یہ کہ انہیں حضور ﷺ کے اہلِ خانہ کی طرف انتساب کا شرف حاصل ہو۔

اس لئے حکمت اور مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ آپ ﷺ کی ساری بیویاں آپ ﷺ کی زوجیت میں باقی رہیں۔ البتہ اس کے بعد مزید کسی اور شادی سے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو منع کر دیا جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔

ایک بات اور واضح کرتا چلوں کہ حضور ﷺ نے جو نو شادیاں کیں، ان میں سے ایک شادی بھی ایسی نہ تھی کہ حضور ﷺ نے کسی کی خوبصورتی پر فدا ہو کر یا کسی جنسی جذبہ کے تحت شادی کی ہو۔ جیسا کہ مستشرقین حضرات حضور ﷺ کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ذرا سوچیے تو کہ آپ ﷺ نے اپنی پہلی شادی ۲۵ سال کی عمر میں کی جب آپ ﷺ بالکل نوجوان تھے اور شادی ایک ایسی خاتون، یعنی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے کی جو آپ ﷺ سے ۱۵ سال عمر میں بڑی تھیں۔ صرف بڑی ہی نہیں تھیں بلکہ بیوہ بھی تھیں۔ وہ دو دفع شادی کر چکی تھیں اور ان شوہروں سے بچے بھی تھے۔ اس کے باوجود

آپ ﷺ نے ان سے شادی کی اور ان کے ساتھ نہایت شاندار زندگی گزاری۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد آپ ﷺ ہمیشہ ان کا تذکرۂ خیر کرتے اور اپنی محبت کا اظہار کرتے۔

خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد آپ ﷺ نے بقیہ تمام بیویوں سے شادی کی۔ ۵۳ سال کی عمر میں سودۃ بنتِ زمعہ رضی اللہ عنہا سے شادی کی تاکہ وہ آپ ﷺ کی بچیوں کی دیکھ بھال کرسکیں اور امورِ خانہ داری سنبھال سکیں۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اپنے تعلّق کو مزید مستحکم کرنے کے لئے ان سے رشتہ داری قائم کی اور حضرت عائشہ بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا سے شادی کی۔ اس تعلّق کی مضبوطی کی خاطر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اپنی بیٹیوں کی شادی کی۔ ذرا سوچئے تو کہ کیا یہ محض اتفاق تھا کہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے یہ چاروں اشخاص خلافت کے منصب پر فائز ہوئے۔

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی بیوہ تھیں اور اتنی بھی خوبصورت نہ تھیں کہ انہیں قبول صورت کہا جائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب آپ ﷺ نے شادی کی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر اتنی کم تھی کہ ان کے ساتھ کسی جنسی تعلّق کی استواری کے بارے میں مشکل ہی سے سوچا جاسکتا تھا۔

اس طرح حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کی شادی جن حالات میں ہوئی وہ سب کو معلوم ہے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا جب بیوہ ہوگئیں اور نہایت خوش اسلوبی سے اپنی بیوگی پر صبر کیا تب اللہ تعالیٰ نے انہیں اس صبر کا بہترین انعام اس صورت میں عطا کیا کہ حضور ﷺ کی ان سے شادی کرا دی۔ اسی طرح آپ ﷺ نے جویریہ بنت الحارث رضی اللہ عنہا سے اس لئے شادی کی' کہ رشتہ قائم ہونے کے بعد ان کی قوم اسلام قبول کر لے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے ابوسفیان کی بیٹی اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا سے شادی کی کیوں کہ حبشہ کی طرف ہجرت کے بعد ان کے شوہر مرتد ہو گئے تھے۔ آپ ﷺ نے اس تکلیف دہ

صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے ان سے شادی کر لی۔ اس شادی کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ابوسفیان کی اسلام دشمنی کچھ کم ہو۔

اس تفصیل کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ آپ ﷺ نے جس عورت سے بھی شادی کی اس شادی کے پیچھے ایک عظیم مقصد تھا۔ یہ شادی کسی کی خوبصورتی، مال ودولت یا جنسی جذبہ کے تحت نہیں تھی۔ اور یہ ساری شادیاں آپ ﷺ نے اس قانون کے آنے سے قبل کیں کہ بیک وقت چار سے زائد شادیاں جائز نہیں ہیں۔ اس قانون کے آنے کے بعد آپ ﷺ نے ایک شادی بھی نہیں کی۔ البتہ جو عورتیں آپ ﷺ کی زوجیت میں تھیں وہ سب کی سب اس زوجیت پر برقرار رہیں اور اس کی حکمت میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں۔

حضور ﷺ نے جو متعدّد شادیاں کیں تو اس کا ایک مقصد یہ تھا' جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ ان شادیوں سے اسلام کی نشر واشاعت میں مدد لی جا سکے۔ اس کا ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ آپ ﷺ کی بیویاں آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو بتائیں۔ بے شبہ حضور ﷺ کی زندگی تمام مسلمانوں کے لئے مشعلِ راہ ہے اور زیادہ سے زیادہ قابلِ تقلید ہے۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ بیویاں اپنے شوہر کے جس قدر قریب ہوتی ہیں کوئی اور نہیں ہوتا۔ حضور ﷺ نے زیادہ سے زیادہ عورتوں سے شادی کر کے ان کے سامنے اپنی عملی زندگی کے نمونے پیش کیے تا کہ وہ لوگوں کو بتائیں۔ حضور ﷺ فرماتے تھے:

حَدِّثُوا عَنِّي۔

میرے بارے میں لوگوں کو بتاؤ

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوری شرح کے ساتھ آپ ﷺ کی زندگی کے بارے میں لوگوں کو بتایا۔ حتیٰ کہ ان پہلوؤں کو بھی راز میں نہیں رکھا جن کا تعلق شوہر بیوی کے خصوصی معاملات سے ہوتا ہے۔

طلاق سے متعلق چند اہم مسائل

سوال: کسی دن میں نے اپنی بیوی سے ناراضی کی وجہ سے طلاق کی قسم کھاتے ہوئے کہا کہ ''اگر تم فلاں دن تک گھر سے باہر نکلیں تو تمہیں طلاق کی قسم ہے'' میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ میں واقعی اسے طلاق دوں۔ میں تو محض تنبیہ کی غرض سے یہ بات کہہ گیا۔ اب اگر وہ گھر سے باہر قدم نکالتی ہے تو کیا اسے طلاق ہو جائے گی؟ کچھ ایسی شدید ضرورتیں ہیں کہ جن کی وجہ سے اس کا گھر سے باہر جانا نہایت ضروری ہے۔

جواب: آپ نے طلاق کی قسم دے کر نہایت سنگین غلطی کی ہے۔ اللہ نے طلاق کو اس لئے نہیں مباح کیا کہ اس کی قسم کھائی جائے۔ قسم تو صرف اللہ رب العزت کی کھانی چاہئے۔ اللہ کے علاوہ کسی اور کی قسم کھانا اسلامی شریعت کی رُو سے جائز نہیں ہے۔ طلاق کو اللہ نے قسم کھانے کی غرض سے نہیں مباح کیا بلکہ یہ ایک قسم کا علاج ہے۔ جب شوہر اور بیوی کے درمیان نباہ کی کوئی صورت نہ ہو اور ان کا الگ الگ ہو جانا ہی بہتر ہو ایسے موقع کے لئے اللہ تعالیٰ نے طلاق کو بطورِ علاج مباح کیا ہے۔

تاہم اگر کسی نے طلاق کی قسم کھائی اور اپنی بیوی سے کہا کہ تمہیں طلاق کی قسم اگر تم نے فلاں کام کیا یا فلاں سے ملاقات کی یا فلاں جگہ گئیں وغیرہ تو ایسی صورت میں طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ اس سلسلہ میں علماء کا اختلاف ہے۔ ائمۂ اربعہ اور جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ ایسی صورت میں طلاق واقع ہو جائے گی۔ بعض دوسرے فقہاء مثلاً ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ ایسی صورت میں طلاق واقع نہیں ہوگی۔ کیوں کہ شریعت کی نظر میں طلاق دینے کا یہ طریقہ صحیح نہیں ہے اور اس لئے بھی کہ شوہر کا مقصد طلاق دینا نہیں ہوتا ہے' بلکہ اس کام سے منع کرنا ہوتا ہے جس کا تذکرہ وہ اپنی قسم میں کرتا ہے۔ مثلاً اگر وہ یہ کہتا کہ تمہیں طلاق کی قسم اگر تم نے فلاں شخص سے ملاقات کی تو ایسی صورت میں شوہر کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کی بیوی فلاں شخص سے نہ ملے۔ اس کا مقصد طلاق دینا نہیں ہوتا ہے۔ امام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اگر اس کی بیوی نے یہ کام کر لیا جس سے

اس کے شوہر نے منع کیا تھا۔ مثلاً اس نے فلاں شخص سے ملاقات کرلی تو ایسی صورت میں طلاق واقع نہیں ہوگی البتہ قسم کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ یعنی دس مسکینوں کو کھانا کھلائے یا تین دن روزے رکھے۔ میرے نزدیک بھی یہی رائے قابلِ ترجیح ہے۔

سوال: مطلقہ عورت کے لئے کیا جائز ہے کہ اپنے طلاق دینے والے شوہر سے کسی ضرورت کے تحت ملاقات کرے؟

جواب: جس کسی عورت کو طلاق ہو جاتی ہے اور اس کی عدت کی مدّت بھی ختم ہو جاتی ہے تو اس کے بعد اس کا شوہر اس کے لئے اجنبی (نامحرم) ہو جاتا ہے۔ جس طرح وہ دوسرے نامحرموں سے تنہائی میں نہیں مل سکتی۔ اسی طرح اپنے سابقہ شوہر سے بھی تنہائی میں نہیں مل سکتی۔ کیوں کہ حدیث میں ہے ''جب مرد عورت تنہائی میں ملتے ہیں تو شیطان ان کا تیسرا ہوتا ہے''۔

اگر ضرورت کی بنا پر اپنے سابق شوہر سے ملنا ضروری ہے تو شرعی حدود میں رہتے ہوئے اس سے مل سکتی ہے، بہ شرطے کہ تنہائی میں نہ ملے۔

اگر عدت کی مدّت ختم نہ ہوئی ہو اور پہلی طلاق ہو یا دوسری طلاق ہو تو مطلقہ عورت اپنے شوہر سے تنہائی میں مل سکتی ہے، بلکہ بیوی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے شوہر ہی کے گھر میں عدت کی مدّت گزارے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ رَبَّكُمْ ۖ لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ ۚ (الطلاق:۱)

اے نبی! جب تم لوگ عورتوں کو طلاق دو تو انہیں ان کی عدت کے لئے طلاق دیا کرو اور عدت کے زمانے کا ٹھیک ٹھیک شمار کیا کرو اور اللہ سے ڈرو جو تمہارا رب ہے۔ زمانۂ عدت میں نہ تم انہیں اپنے گھر سے نکالو اور نہ وہ خود نکلیں اِلّا یہ کہ وہ کسی صریح برائی کی مرتکب ہوں۔

اللہ کا حکم ہے کہ مطلّقہ بیوی عدت کے ایاّم میں اپنے شوہر ہی کے گھر پر رہے۔ گھر سے باہر دوسری جگہ نہ رہے۔ شاید کہ اس عدت میں اللہ تعالیٰ دونوں کے دل ایک دوسرے کے لئے صاف کر دے اور ان کے درمیان محبت کی فضا قائم ہو جائے اور شوہر اپنی بیوی کو واپس اپنی زوجیت میں لے لے۔ یہ اللہ کا حکم ہے' لیکن اس حکم کے برعکس اس دور میں اکثر مطلّقہ عورتیں نہ خود اپنے شوہر کے گھر میں رہنا چاہتی ہیں اور نہ شوہر ہی اس بات کے لئے تیار ہوتا ہے۔ یہ بات خلافِ شریعت ہے۔

چند اہم سوالات

سوال: اس صدی میں سائنسی ترقیوں نے سینکڑوں ایسے محیر العقول کارنامے انجام دیئے ہیں جن پر انسانیت بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ طب کے میدان میں بھی سائنس نے کچھ ایسے امکانات پیدا کر دیئے ہیں جن کے بارے میں آج سے قبل سوچنا بھی ممکن نہ تھا۔ تاہم ان میں سے کچھ ایسے امکانات ہیں جن پر عمل درآمد کرنا بحیثیتِ مسلمان ہمارے لئے شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ یہ جان لینا بہت ضروری ہے۔ ذیل میں' میں مثال کے طور پر تین ایجادات کی طرف آپ کا ذہن مبذول کرانا چاہتا ہوں اور ان کے بارے میں شریعت کا حکم جاننا چاہتا ہوں۔

۱- سائنس کی رُو سے بچے کی پیدائش میں تین چیزیں اہم رول ادا کرتی ہیں۔ مرد کی منی، عورت کی منی اور رحمِ مادر، مرد اور عورت کی منی ایک ساتھ مل کر رحمِ مادر میں پہنچتی ہے اور وہاں جا کر بچے کی پیدائش کا عمل شروع ہوتا ہے۔ کچھ ایسے مرد ہیں جو اپنی منی رحمِ مادر میں پہنچانے سے قاصر ہیں۔ ٹیسٹ ٹیوب کے ذریعے ان کی منی رحمِ مادر میں پہنچا کر بچے کی پیدائش کا تجربہ کامیاب ہو چکا ہے۔ تاہم وہ عورت جس کے پیٹ میں رحم سرے سے موجود ہی نہ ہو، اس کے ہاں بچے کی پیدائش کس طرح ہو؟ اس کا حل سائنس نے یہ نکالا کہ شوہر اور بیوی کی منی کو لے کر کسی دوسری عورت کے رحم میں ڈال دیا جاتا ہے جہاں بچے کی پیدائش کا عمل پروان چڑھتا ہے۔ یہ دوسری عورت جب نو مہینے کے تکالیف دہ دور

سے گزر کر بچے کو جنم دیتی ہے تو یہ بچہ اس کا نہیں کہلاتا' بلکہ ان شوہر اور بیوی کا کہلاتا ہے جن کی منی سے یہ بچہ پیدا ہوا۔ کیا شریعت کی رُو سے اس طریقے سے بچے کی پیدائش جائز ہے؟

۲- مرد کی منی دو قسم کے جراثیم پر مشتمل ہوتی ہے۔ سائنس کی اصطلاح میں پہلی قسم کو X سے تعبیر کیا جاتا ہے اور دوسری قسم کو Y سے، اور یہ دونوں قسم کے جراثیم بیک وقت وافر مقدار میں مرد کی منی میں موجود ہوتے ہیں۔ جب کہ عورت کی منی صرف X قسم کے جراثیم پر مشتمل ہوتی ہے۔ مباشرت کے وقت اگر مرد کی منی کے X جراثیم Y پر غالب ہو کر عورت کی منی سے مل جاتے ہیں تو نتیجہ X+X ہوتا ہے اور لڑکے کی پیدائش ہوتی ہے۔

اس نظریے کی بنیاد پر طبّی ماہرین اس بات کا تجربہ کرنے میں مصروف ہیں کہ کس طرح سائنسی عمل کے تحت اپنی پسند کے جراثیم کو غالب کیا جائے' تاکہ نتیجہ اپنی پسند کے مطابق لڑکے یا لڑکی کی صورت میں برآمد ہو۔ جانوروں میں اس قسم کا تجربہ کامیاب ہو چکا ہے۔ انسانوں پر یہ تجربہ ابھی باقی ہے۔ کیا شریعت کی رُو سے لڑکی یا لڑکے کا یوں انتخاب کرنا جائز ہوگا؟

۳- قدیم زمانے سے انسان نے اپنے دماغ اور اعصاب کو پرسکون رکھنے کے لئے متعدّد طریقے اپنائے ہیں۔ انہیں وسائل میں ان مہلک اشیاء کا شمار بھی کیا جا سکتا ہے، جنہیں ہم شراب، افیون، چرس اور ہیروئن کے نام سے جانتے ہیں۔

سائنسی تجربات کے ذریعے یہ انکشاف ہوا ہے کہ انسان میں غصہ، غم، تشنج اختلاج' بہت زیادہ حساس ہونا یا کسی قسم کے احساس سے عاری ہونا' یہ ساری کیفیات دراصل دورانِ خون میں بعض کیمیائی اجزا میں تبدیلیوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ان تجربات کی روشنی میں ایسے انجکشن ایجاد ہوئے، جو کیمیائی تبدیلیوں کو اپنی مرضی کے مطابق رکھتے ہیں اور ان سے ان مریضوں کا علاج ہوتا ہے، جو اعصابی طور پر یا دماغی طور پر صحت مند نہیں

ہیں۔

ان کامیابیوں کی بنیاد پر مستقبل میں ایسے انجکشن کی ایجاد کی پیشین گوئی کی جاتی ہے جس کا تجربہ مریض پر نہیں' بلکہ صحت مند انسان پر ہوگا۔ اس تجربہ کا مقصد یہ ہوگا کہ کس طرح ایک صحت مند انسان اپنی مرضی کے مطابق اعصابی یا دماغی کیفیت اپنے اوپر طاری کرلے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس انجکشن کے ذریعہ سے ہم کسی انسان کو مستقل طور پر غصہ ور بنا سکتے ہیں یا بالکل ٹھنڈے مزاج کا۔ کسی کو بہت زیادہ حساس بنا سکتے ہیں اور کسی کو بالکل بے حس اور بے شرم، گویا ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق اپنے مزاج کو ڈھال سکتا ہے۔ کیا شریعت کی رُو سے اس قسم کا عمل جائز ہے۔

جواب: بے شبہ یہ مسائل غایت درجہ اہمیت کے حامل ہیں اور ضروری ہے کہ ان مسائل میں شریعت کے احکام کو واضح کیا جائے۔ ان مسائل کی اہمیت یوں بھی بڑھ جاتی ہے کہ ان پر تجربات جاری ہیں اور توقع ہے کہ مستقبل قریب میں ان تجربات میں کامیابی حاصل ہو جائے اور جو چیزیں آج محض نظریہ کی حیثیت رکھتی ہیں کل ایک حقیقت بن جائیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ علماء وفقہاء ان مسائل میں شریعت کا حکم واضح کریں۔ اگرچہ سلفِ صالحین کا طریقۂ کار یہ ہوتا تھا کہ وہ ان سوالوں کا جواب نہیں دیتے تھے جو ہنوز نظریہ کے مرحلہ میں ہوں' یہاں تک کہ حقیقت کا روپ اختیار کرلیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان لوگوں کے سوال کو سخت ناپسند کرتے تھے جو اس قسم کا سوال کرتے تھے کہ "بالفرض اگر ایسا ہو جائے تو اس کا کیا حکم ہوگا؟" اور کہتے تھے کہ کسی چیز کے بارے میں اس وقت تک سوال نہ کرو جب تک وہ چیز واقع نہ ہو جائے۔

آپ نے جو مسائل پیش کئے ہیں وہ بھی ہنوز نظریہ اور تجربہ کے مرحلہ میں ہیں لیکن غالب گمان ہے کہ مستقبل قریب میں یہ چیزیں حقیقت بننے والی ہیں۔ اس لئے ان سوالوں کا جواب دے رہا ہوں۔

۱- بڑے غور وفکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس طریقہ سے بچے کی

پیدائش دینی نقطہ نظر سے جائز نہیں ہو سکتی اور اسلامی شریعت اس قسم کے عمل کو خوش آمدید نہیں کہہ سکتی۔ کیوں کہ اس عمل سے جو نتائج مرتّب ہوں گے وہ اسلام کے لئے نا قابلِ قبول ہیں۔

ان میں سب سے بھیانک نتیجہ یہ ہے کہ اس طرح بچے کی پیدائش کے عمل میں ماں کے عظیم مرتبہ اور اعلیٰ مقام کی زبردست پامالی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دینِ اسلام ہو یا دوسرے مذاہب ومکاتبِ فکر ان سب کے نزدیک ماں کی حیثیت ومنزلت نہایت اعلیٰ وارفع ہے اور دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہے۔ کبھی غور کیا کہ ماں کو یہ حیثیت کیوں حاصل ہے؟ ماں وہ ہوتی ہے جس کی کوکھ میں مادہ منویہ کی نشو ونما کا عمل شروع ہوتا ہے۔ نو مہینہ تک مسلسل وہ اس مادہ کو اپنے خون سے سینچتی رہتی ہے۔ اپنی غذا اسے کھلاتی رہتی ہے۔ نو مہینے پر محیط یہ طویل مدّت کتنی مصیبتوں اور آزمائشوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کا بخوبی اندازہ ایک ماں کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔ مگر ایک ماں ہی ہے جو ان تکلیفوں کو جھیل کر ہر ممکن طریقہ سے اپنی کوکھ میں اس مادہ کی حفاظت کرتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ مادہ ایک انسانی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے بعد اس سے زیادہ کٹھن مرحلہ آتا ہے جب بچے کی پیدائش ہوتی ہے۔ بچے کی پیدائش کے وقت جو شدید تکلیف ہوتی ہے اس کا صحیح اندازہ کیا کوئی کرسکتا ہے؟ یہ مصیبتیں اور پریشانیاں یہیں نہیں ختم ہو جاتیں۔ بلکہ بچے کی پیدائش کے بعد تکلیفوں کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اسے دودھ پلانے کا، اسے پالنے کا اور اپنا سارا سکھ دکھ چین قربان کر کے اس کی تربیت کرنے کا۔ اور یہ ماں ہوتی ہے جو اولاد کی محبت میں سب کچھ ہنسی خوشی جھیل جاتی ہے۔ اتنی آزمائشوں اور امتحانوں کے بعد اسے ماں کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ وہ ماں جس کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کے قدموں تلے جنت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنی عبادت کے بعد فوراً ماں باپ کی فرمانبرداری کا حکم دیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے تین بار زور دے کر ماں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید فرمائی ہے۔

آپ ماں کی اس تصویر کو سامنے رکھئے اور یہ بتائیے کہ کیا وہ عورت ماں کہلانے کے لائق ہے جو اپنا مادہ منویہ دوسری عورت کی کوکھ میں رکھ کر مطمئن ہو جاتی ہے؟ اس کی کوکھ میں نہ بچے کی نشو ونما ہوتی ہے اور نہ وہ حمل اور پیدائش کی ہی طویل اور صبر آزما تکلیفوں سے گزرتی ہے۔ کیا صرف اپنے مادہ منویہ کے بل بوتے پر وہ ماں کے عظیم مرتبہ کی مستحق ہوسکتی ہے؟

خود ''والدہ'' کا لفظ جو کہ عربی زبان کا لفظ ہے' اس طرف اشارہ کر رہا ہے کہ حقیقتاً ماں وہ ہوتی ہے جو بچے کو جنم دیتی ہے۔ اس لئے قرآن کا ارشاد ہے:

مَا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ؕ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ ؕ (المجادلہ:۲)

ان کی بیویاں ان کی مائیں نہیں ہیں، ان کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے ان کو جنا ہے۔

قرآن نے خود واضح کر دیا کہ ماں وہی ہے، جو بچے کو جنم دیتی ہے۔ محض اپنا مادہ منویہ کسی دوسری عورت کی کوکھ میں رکھ دینے سے عورت ماں نہیں بن سکتی۔ وہ عورت ماں کے عظیم مرتبے کی حقدار کیسے ہوسکتی ہے جو نہ حمل کی تکلیف سہتی ہے اور نہ جننے کے مراحل سے گزرتی ہے۔

میں اس موقع پر یہ سوال کرنا چاہوں گا کہ اس بات کی کوشش کیوں کی جاتی ہے کہ ایک عورت کا مادہ منویہ دوسری عورت کی کوکھ میں رکھ کر بچے کی پیدائش کے عمل کو کامیاب بنایا جائے۔ سائنس دانوں کا جواب یہی ہوگا کہ اس طریقہ سے وہ عورت، جو کوکھ سے محروم ہے، اولاد کی نعمت حاصل کرسکتی ہے اور اس طرح اس کی محرومی کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ ان کے اس جواب پر میں کہوں گا کہ اسلامی شریعت کے دو اصول ہیں۔ پہلا یہ کہ نقص دور کرنے کی کوشش صرف مقدور بھر ہونی چاہئے اور دوسرا یہ کہ ایک شخص کا نقصان دور کرنے کے لئے کسی دوسرے شخص کو نقصان نہیں پہنچانا چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ نقصان دور کرنے کی کوشش صرف مقدور بھر ہونی چاہئے۔

سائنس کتنی بھی ترقی کر جائے انسان کی ساری پریشانیوں کا حل پیش نہیں کرسکتا۔ آخر اس عورت کی پریشانی کا کیا حل ہوسکتا ہے جس کے پاس سرے سے مادہ منویہ ہی نہ ہو۔ دوسری بات یہ کہ آپ اس پریشانی کا جو حل پیش کر رہے ہیں اس سے کسی دوسرے کو پریشانی لاحق ہو رہی ہے یعنی خواہ مخواہ وہ عورت مسائل میں گرفتار ہو رہی ہے جو اپنی کوکھ میں اس مادہ منویہ کو رکھ کر بچے کو جنم دے گی۔ کسی پریشانی کا حل ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ کسی دوسرے کو اس سے پریشانی ہو۔

آخر میں، میں یہ کہنا چاہوں گا کہ آپ نے اس مسئلے کا جو حل پیش کیا ہے کوئی ضروری نہیں کہ یہی سب سے بہتر حل ہو۔ اس کا ایک بہترین حل یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوکھ سے محروم عورت کے پیٹ میں کوکھ بنانے کی کوشش کی جائے اور میں بتاؤں کہ اس سمت میں بھی تجربات شروع ہو چکے ہیں۔

آپ نے جو حل پیش کیا ہے اس سے مختلف فتنوں کا دروازہ کھل سکتا ہے۔ اگر یہ چیز جائز ہوگئی تو صرف کوکھ سے محروم عورت ہی نہیں، بلکہ وہ عورتیں جو مال دار ہیں فیشن پرست ہیں اور بچے کو جن کر اپنے جسم کو متاثر کرنا نہیں چاہتیں، کرایہ پر ایسی عورتوں کی خدمت حاصل کرلیں گی جو اِن کے مادہ منویہ کو اپنی کوکھ میں رکھ کر ان کے بچے کو جنم دیں۔ اور اگر ایسا ہو گیا تو ایک عورت سال میں صرف ایک دو نہیں سو دو سو بچوں کو بھی پیدا کرواسکتی ہے اور جتنے بچوں کی چاہے ماں بن سکتی ہے۔ آپ کے خیال میں کیا یہ صورتِ حال معاشرے کے لئے قابلِ قبول ہوگی؟

۲- بچے کی پیدائش سے قبل لڑکے یا لڑکی کا انتخاب کرنا اسلامی شریعت کے قطعاً منافی ہے۔ اس کے دو اسباب ہیں:

۱- رحمِ مادر میں نشو و نما پانے والے جنین اور اس کے مستقبل کا علم ان پانچ علموں میں سے ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے خاص کر رکھا ہے۔ درج ذیل آیت میں ان پانچ چیزوں کا تذکرہ ہے:

إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ○ (لقمان:۳۴)

اس گھڑی کا علم اللہ ہی کے پاس ہے۔ وہی بارش برساتا ہے۔ وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹوں میں کیا پرورش پا رہا ہے، کوئی متنفس نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائی کرنے والا ہے اور نہ کسی شخص کو یہ خبر ہے کہ کس سرزمین میں اس کو موت آنی ہے۔

جب جنین کا علم اللہ کے ساتھ خاص ہے تو کوئی فردِ بشر اس بات کا دعویٰ کیسے کرسکتا ہے کہ اسے اس جنین کے جنس (SEX) کا علم ہے۔ اور وہ اس میں اپنی مرضی کے مطابق دخل اندازی کرسکتا ہے؟

۲- دوسری وجہ یہ ہے کہ ایسا کرنا سراسر اللہ کی مشیت میں دخل اندازی ہے۔ اللہ اپنی مرضی کے مطابق اور کسی عظیم مصلحت و حکمت کی بنا پر متعین مقدار میں لڑکے اور متعین مقدار میں لڑکیاں پیدا کرتا ہے۔ مرد و عورت کی تعداد میں توازن اللہ کی حکمت اور علم کے مطابق ہے۔ اس معاملے میں ہم بندوں کی مداخلت مختلف فتنوں کا دروازہ کھول سکتی ہے۔ ذرا غور کریں کہ اگر اس بات کی اجازت دے دی جائے تو ہر دور میں لڑکوں کی پیدائش کی زیادہ خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر کوئی یہی چاہے گا کہ اس کے یہاں لڑکی کے بجائے لڑکے کی ولادت ہو۔ چنانچہ چند دہائی گزرنے کے بعد نتیجہ یہ ہوگا کہ روئے زمین پر نوے فیصد مرد ہوں گے اور دس فیصد عورتیں۔ ایک کم عقل شخص بھی اس امر کی تباہیوں کو محسوس کرسکتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لِّلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۚ يَهَبُ لِمَن يَشَاءُ إِنَاثًا وَيَهَبُ لِمَن يَشَاءُ الذُّكُورَ ○

اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے، وہ جو چاہتا ہے تخلیق

کرتا ہے۔ جسے چاہتا ہے لڑکی دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے لڑکا عطا کرتا ہے۔

دوسری آیت ہے:

وَ رَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَ يَخْتَارُ ؕ (القصص:۶۸)

اور تیرا رب جو چاہتا ہے تخلیق کرتا ہے اور اس تخلیق میں اختیار کرتا ہے (کہ کیا چیز اسے تخلیق کرنی ہے)

درحقیقت جنین کے SEX کے انتخاب کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے اور شریعت کی رُو سے اللہ کے حق میں بندے کا تصرّف کرنا کسی طور جائز نہیں ہے۔

البتہ انتہائی مجبوری کی صورت میں اس چیز کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔لیکن بہتر یہی ہوگا کہ اس معاملے کو اللہ ہی پر چھوڑ دیا جائے کہ اللہ کی مرضی ہی میں ہماری مصلحت پوشیدہ ہے۔

۳- رہی بات انجکشن کے ذریعے انسان کے مزاج، دماغ اور اعصاب کو اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کرنے کی تو بلاشبہ یہ بات اسلامی شریعت کے منافی ہے۔کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے اسے تمام راستے دکھائے ہیں اور اب انسان کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرتا ہے۔انسان کے اختیار کو اور اس کی آزادی کو دواؤں اور انجکشن کے ذریعے سلب کر لینا اللہ کی مرضی اور اس کی تخلیق کے بالکل خلاف ہے۔شراب یا نشہ آور چیزوں کا استعمال اسی لئے حرام ہے کہ یہ چیزیں انسانی دماغ کی آزادی اور اختیار کو سلب کر کے اسے معطل کر دیتی ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان نشہ آور چیزوں کے زیر اثر انسان اپنی مرضی کے بغیر ایسے کام کر ڈالتا ہے جو اسے نہیں کرنا چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی تخلیق اس بنیاد پر کی ہے کہ انہیں آزادی اور اختیار عطا ہو۔اللہ کی اس تخلیق میں بندوں کی دخل اندازی اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی کی کوشش، اللہ کو سخت ناپسند ہے۔اللہ فرماتا ہے:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ

(الروم:۳۰)

یہ اللہ کی فطرت ہے جس پر لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔

اس لئے اللہ کے رسول ﷺ نے ان مردوں پر لعنت فرمائی ہے جو اپنی خِلقت کو تبدیل کر کے عورت بننے کی کوشش کرتے ہیں' یا وہ عورتیں جو مرد بننے کی کوشش کرتی ہیں۔ اسی طرح نبی ﷺ نے ہر اُس شخص پر لعنت فرمائی ہے جو جسمانی طور پر اللہ تعالیٰ کی خِلقت میں کسی قسم کی تبدیلی کر بیٹھتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی ایسے ہی انجکشن کے ذریعے اگر کسی شخص کے مزاج میں تبدیلی پیدا کر دی جائے اور اس کے دماغ کو کسی خاص نہج پر موڑ دیا جائے تو کیا وہ شخص اپنے اعمال کا جواب دہ ہوگا یا نہیں؟

بے شبہ وہ شخص اپنے تمام اعمال کا جواب دہ ہوگا' جب تک اس کے ہوش و حواس کام کر رہے ہوں اور وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ البتہ اگر یہ صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے تو پھر وہ اپنے اعمال کا جواب دہ نہیں ہے اِلّا یہ کہ اس نے اپنی یہ صلاحیت خود اپنی مرضی سے کھوئی ہو۔

میری سمجھ سے اس قسم کے انجکشن خواہ کتنے ہی مؤثر ہوں' لیکن ان کی تاثیر موروثی مزاج و عادات سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ کوئی شخص اپنے باپ دادا سے مزاج میں سختی اور تیزی پاتا ہے اور کوئی انتہائی نرم مزاج پاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ چوں کہ اس نے یہ مزاج موروثی طور پر حاصل کیا ہے اس لئے وہ اپنے اعمال کا جواب دہ نہیں ہے۔

حواشی وحوالہ جات

(۱) مسلم کی روایت ہے۔

(۲) طبرانی کی روایت ہے۔

(۳) مغربی تہذیب کے غلبہ اور آج کے فتنہ کے دور میں عام حالات میں چہرے کا پردہ بھی ضروری ہے۔ (ناشر)

(۴) مسلم کی روایت ہے۔

(۵) شریعت الاسلام۔ یوسف القرضاوی۔ ص ۳۹

(۶) احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۰

(۷) پچھلی حدیث کا ایک جز ہے۔ حدیث اگرچہ ضعیف ہے تاہم ایک اہم بات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

(۸) ترمذی کی روایت ہے۔ اور صحیح حدیث ہے۔

(۹) مسلم شریف کی روایت ہے۔

☆☆☆☆☆

گیارہواں باب

اجتماعی معاملات

مزدوروں کی مزدوری کے تعین میں حکومت کی مداخلت

سوال: کیا کسی اسلامی حکومت کے لئے یہ بات جائز ہے کہ مزدور اور اس کے مالک کے معاملات میں مداخلت کرتے ہوئے مزدور کی تنخواہ، الاؤنس، چھٹی، ڈیوٹی کے اوقات یا اس جیسے دوسرے معاملات خود حکومت طے کرے۔ کیوں کہ اس دور میں مزدوروں کے ساتھ عام طور پر بڑی بے انصافی ہوتی ہے اور اکثر ان کو ان کے جائز حقوق نہیں مل پاتے ہیں۔

جواب: میں سب سے پہلے ایک اہم شرعی نکتے کی طرف قارئین کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی حکومت کا کام محض داخلی امن کو قائم رکھنا، بیرونی خطرات سے ملک کو محفوظ رکھنا اور اقتصادی پالیسیاں طے کرنا ہے۔ حکومت کی یہ ذمے داری نہیں ہے کہ وہ مزدور اور اس کے مالک کے معاملات میں دخل دے۔ یہ ایک غلط فکر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے فرائض اور اس کی ذمہ داریاں ان سب سے کہیں وسیع تر ہیں۔ اسلامی حکومت کے فرائض میں ہر وہ پالیسی یا اقدام شامل ہے جس کے ذریعے عدل وانصاف قائم ہو، ظلم کی بیخ کنی ہو، لوگوں کو نقصان سے بچایا جائے اور لوگوں کے آپسی تنازعات کو طے کیا جائے' تاکہ ایک صالح معاشرہ وجود میں آسکے۔ چنانچہ حکومت کی ذمہ داریوں میں یہ بھی شامل ہے کہ مزدور اور اس کے مالک کے باہمی معاملات کی نگہداشت کرے اور اگر مزدور کی حق تلفی ہو رہی ہو تو اس کا حق دلوانے کے

لئے کوئی ٹھوس قدم اٹھائے۔ میں اپنی بات کے لئے مندرجہ ذیل دلیلیں پیش کرتا ہوں:

۱- حدیث شریف ہے:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ. فَالْإِمَامُ رَاعٍ وَّهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ.

تم میں سے ہر شخص ذمے دار ہے۔ اور تم میں سے ہر ایک شخص اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے۔ چنانچہ امامِ وقت بھی ذمہ دار ہے اور اپنی رعیت کے معاملہ میں جوابدہ ہے۔

اس حدیث میں امامِ وقت یا بالفاظ دیگر حکمرانِ وقت کی ذمے داریوں کو خاص اور محدود نہیں، بلکہ عام اور لامحدود بتایا گیا ہے۔ چنانچہ حکمرانِ وقت اپنی رعایا کی تمام باتوں کا ذمے دار ہے۔ اس حدیث میں یہ نہیں ہے کہ حکمرانِ وقت صرف فلاں اور فلاں باتوں کا جواب دہ ہے، بلکہ وہ اپنی رعایا کے تمام معاملات کا ذمہ دار ہے اور جواب دہ ہے۔ اسی لئے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ اگر میرے دادا دریائے فرات کے اس پار بھی قتل کر دیئے جائیں، تو قیامت کے دن اللہ کے سامنے میں اپنے آپ کو اس بارے میں جواب دہ تصور کروں گا۔

۲- لوگوں کی زندگی میں عدل وانصاف قائم کرنا، اسلام کے عظیم ترین مقاصد میں سے ایک ہے۔ اس عدل وانصاف کی خاطر رسولوں کی بعثت ہوئی ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ (الحدید: ۲۵)

ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔

دوسری آیت ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا وَ اِذَا حَكَمْتُمْ

بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ (النساء:۵۸)

اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔

ان دونوں آیات سے واضح ہے کہ رسولوں کی بعثت کا مقصد عدل وانصاف قائم کرنا ہے اور اللہ نے حکم دیا ہے کہ لوگوں کے درمیان ایسا فیصلہ کیا جائے جو انصاف پر مبنی ہو اور جس کی امانت ہو یا حق ہو وہ اسے لوٹا دیا جائے۔ یہ اللہ کا حکم ہے۔ اگر مزدوروں کے حقوق محفوظ نہیں ہیں اور ان کی حق تلفی ہو رہی ہے تو یہ عدل وانصاف کے خلاف ہے اور اللہ کے حکم کی نافرمانی ہے۔ اس لئے حکمرانِ وقت کا فرض ہے کہ اللہ کے حکم پر عمل کرتے ہوئے مزدوروں اور ان کے مالکوں کے درمیان عدل وانصاف قائم کرے۔

۳۔ اسلامی شریعت کا قاعدہ ہے کہ نقصان ہونے سے قبل نقصان کو روکنے کے لئے احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں اور اگر نقصان واقع ہو جاتا ہے تو اسے دور کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔ اسی لئے حدیث شریف میں ہے:

لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ۔

نہ نقصان اٹھاؤ اور نہ کسی کو نقصان پہنچاؤ

اس حدیث کی بنیاد پر اسلامی شریعت کے متعدّد احکام وقوانین کی عمارت قائم ہے۔ چنانچہ اسلامی حکومت کے قوانین میں ایسا قانون ضرور ہونا چاہئے جس کے ذریعے سے رعایا کو پہنچنے والے نقصان کو روکا جا سکے یا نقصان کی تلافی کی جا سکے۔

مذکورہ بالا اصول کی بنیاد پر فقہاء کرام نے چند فروعی قوانین وضع کئے ہیں مثلاً یہ کہ نقصان کی ہر حال میں تلافی کی جائے۔ ایک نقصان کی تلافی دوسرے نقصان سے نہیں ہو سکتی۔ عام لوگوں کے نقصان کو دفع کرنے کے لئے کسی خاص شخص کے نقصان کو برداشت کرنا چاہئے۔ بڑے نقصان کو دفع کرنے کے لئے چھوٹے نقصان کو برداشت کیا جا سکتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

۴- اسلامی شریعت کی رُو سے اسلامی حکومت کا دائرہ اختیار بہت وسیع ہے۔ اسلامی حکومت ہر وہ اقدام کر سکتی ہے اور ہر وہ پالیسی وضع کر سکتی ہے جو معاشرہ کے مفاد میں ہو، جس سے عدل وانصاف قائم ہو اور معاشرہ میں ظلم وفساد کی بیخ کنی ہو۔ شرط یہ ہے کہ کوئی بھی پالیسی قرآن وسنّت کے خلاف نہ ہو۔

اس وسیع دائرہ کار اور دائرہ اختیار میں یہ بھی شامل ہے کہ اسلامی حکومت بازار میں اشیاء کی قیمتوں پر کنٹرول کرے۔ مکانوں اور دکانوں کے کرایہ پر کنٹرول کرے اور مختلف خدمتوں کے لئے مزدوری یا اجرت کی تعیین کرے۔ مصالحِ عامہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے قیمتوں، کرایوں اور اجرتوں کے تعیّن کے لئے اسلامی حکومت کوئی قانون بھی بنا سکتی ہے۔

غرض یہ کہ اسلام دنیا کا پہلا مذہب ہے جس نے معاشرہ میں مکمل عدل وانصاف کے قیام کے لئے اور ظلم وفساد کی روک تھام کے لئے واضح ترین اور مکمل ترین پالیسیاں پیش کیں۔ مثال کے طور پر ایک حدیث پیش کروں گا:

اَعْطُوا الْاَجِيْرَ اَجْرَهٗ قَبْلَ اَنْ يَّجُفَّ عِرْقُهٗ. (ابنِ ماجہ اور ترمذی)

مزدور کو اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے قبل ادا کر دو۔

ایک دوسری حدیث بخاری شریف میں موجود ہے' ان تین لوگوں کے سلسلے میں جن سے اللہ قیامت کے دن جھگڑا کرے گا۔ ان میں سے ایک:

وَرَجُلٌ اِسْتَاْجَرَ اَجِيْرًا فَاسْتَوْفٰى مِنْهُ وَلَمْ يُعْطِهٖ اَجْرَهٗ.

وہ شخص (ہے) جس نے کسی مزدور کی خدمت حاصل کی اور اس سے پورا کام لیا' لیکن اسے مزدوری نہیں دی۔

یہاں ایک اہم بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ اسلامی حکومت چاہے مزدوروں کے حقوق دلانے کے لئے کوئی قانون وضع کرے یا بازار کی قیمتوں کو کنٹرول کرنے کے لئے کوئی پالیسی بنائے یا مصالحِ عامہ کی خاطر کوئی اقدام کرے۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ

اس قانون پر تو عمل کرتے ہیں جو ان کی مرضی اور پسند کے مطابق ہو۔ لیکن اگر کوئی قانون ان کی مرضی، پسند یا مفاد کے خلاف ہوا تو لوگ اس پر عمل نہیں کرتے اور عمل نہ کرنے کے سو بہانے نکال لیتے ہیں۔ حالانکہ حضور ﷺ کا واضح فرمان ہے:

اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ حَقٌّ عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ فِيْمَا اَحَبَّ وَكَرِهَ مَا لَمْ يُؤْمَرْ بِمَعْصِيَةٍ۔ (بخاری ومسلم)

ذمے داروں کی بات سننا اور اطاعت کرنا ہر مسلمان شخص پر واجب ہے۔ اپنی پسند اور ناپسند سب میں بہ شرطے کہ اسے گناہ کا حکم نہ دیا جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی شریعت اس بات کو پسند کرتی ہے کہ حکومت مزدوروں کی مزدوری کے تعیّن کے سلسلے میں مداخلت کرے۔ اگر اس کی ضرورت ہو اور مصالحِ عامہ کا تقاضا ہو اور اس غرض کے لئے ان ماہرین سے مدد لی جاسکتی ہے، جو عدل پر مبنی قوانین وضع کرسکتے ہوں۔ ان قوانین کا اطلاق صرف مزدوری اور اجرت پر نہیں ہوگا بلکہ ڈیوٹی کے اوقات، سالانہ اور ہفتہ واری چھٹی اور ان جیسے دوسرے معاملات پر بھی ہوگا۔

تجارت، اسلام کی نظر میں

سوال: کیا یہ صحیح ہے کہ دینِ اسلام تجارت کو ناپسند کرتا ہے؟ کیا کوئی ایسی حدیثِ نبوی ﷺ ہے کہ تاجر حضرات قیامت کے دن فاجر و فاسق کی صورت میں اٹھائے جائیں گے؟ کیا یہ حدیث ان تاجروں پر بھی منطبق ہوتی ہے جو حلال چیزوں کی تجارت کرتے ہیں اور حلال رزق کماتے ہیں؟

جواب: دینِ اسلام تجارت کو ناپسند نہیں کرتا، کیوں کہ تجارت حلال رزق کمانے کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے۔ جس کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تعریفی انداز میں کیا ہے اور اسے فضلِ الٰہی سے تعبیر کیا ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ

(الجمعۃ: ۱۰)

پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔
(یعنی رزق تلاش کرو)

اور اللہ کا ارشاد ہے:

لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ ط (البقرۃ:۱۹۸)
اور اگر حج کے ساتھ تم اپنے رب کا فضل بھی تلاش کرو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے تجارت کے ذریعے سے رزق حاصل کرنے کو فضل اللہ سے موسوم کیا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ایک اچھی خاصی تعداد ان لوگوں کی تھی جو تجارت پیشہ تھے۔ مثلاً حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جب مدینہ ہجرت کر کے آئے تو کچھ بھی ان کے پاس نہیں تھا۔ پھر انہوں نے تجارت شروع کی اور جلد ہی بڑے مالدار ہو گئے اور سبھی جانتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ان دس خوش نصیبوں میں ہیں جنہیں دنیا ہی میں جنت کی بشارت دے دی گئی تھی۔ اگر تجارت مکروہ چیز ہوتی تو انہیں ہرگز یہ مقام حاصل نہ ہوتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ میدانِ جہاد کے علاوہ اگر کوئی دوسری جگہ مجھے مرنے کے لئے سب سے زیادہ محبوب ہے تو وہ بازار ہے' جہاں میں اپنے گھر والوں کے لئے کچھ خرید وفروخت کرتا رہوں۔ ان دلائل کی روشنی میں معلوم ہوا کہ تجارت اسلام کی نظر میں ناپسندیدہ نہیں' بلکہ پسندیدہ ہے۔

البتہ ضرورت ہے کہ تجارت شریعت کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق ہو۔ ورنہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تجارت میں غلط صحیح کی تمیز نہیں کی جاتی اور تاجر اللہ کی نظر میں گنہگار ہو جاتا ہے۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

اِنَّ التُّجَّارَ یُبْعَثُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ فُجَّارًا اِلَّا مَنِ اتَّقَی اللّٰهَ وَبَرَّ

وَصَدَقَ۔ (ترمذی)

بے شبہ تاجر حضرات قیامت کے دن فاجروں کی صورت میں اٹھائے جائیں گے سوائے ان کے جنہوں نے اللہ کا ڈر رکھا' نیکی کی اور سچ بات کہی۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جہنم کی آگ سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ تاجر تجارتی معاملات میں نیکی اور سچائی سے کام لے اور غلط کام پر خدا سے ڈرے۔ اسی لئے دوسری حدیث ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ تین لوگوں کی طرف اللہ قیامت کے دن نہیں دیکھے گا۔ ان میں سے ایک وہ ہے:

اَلْمُنْفِقُ سَلْعَتَهٗ بِالْحَلْفِ الْكَاذِبِ۔ (مسلم اور اصحاب السنن)

جھوٹی قسم کے ذریعے سے مالِ تجارت کو بڑھا چڑھا کر بتانے والا۔

ایک حدیث میں حضور ﷺ نے تاجروں کے بارے میں فرمایا:

اِنَّهُمْ يُحَدِّثُوْنَ فَيَكْذِبُوْنَ وَيَحْلِفُوْنَ فَيَأْثَمُوْنَ۔ (مسند احمد اور حاکم)

وہ کچھ بتاتے ہیں تو جھوٹ بولتے ہیں اور قسم کھاتے ہیں تو گناہ کرتے ہیں۔

ایسے ہی تاجر حضرات ہیں جن کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن فاجروں کی طرح اٹھائے جائیں گے۔ وہ تجارت' جسے اللہ تعالیٰ نے فضلِ الٰہی سے تعبیر کیا ہے اس میں مندرجہ ذیل شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے:

۱۔ سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ حلال اور مباح چیزوں کی تجارت کی جائے۔ اسلام کی نظر میں جو چیزیں حرام ہیں ان کی تجارت نہ کی جائے مثلاً شراب، خنزیر کا گوشت وغیرہ۔ حدیث میں ہے کہ اگر کسی نے انگور کو روکے رکھا تاکہ کسی یہودی یا عیسائی کو شراب بنانے کی غرض سے فروخت کرے تو اس نے جان بوجھ کر جہنم کی آگ خریدی۔ (۱)

۲۔ دوسری شرط یہ ہے کہ تجارت میں دھوکہ نہ دے مثلاً یہ کہ خراب مال کو اچھا مال بتا

کر فروخت کر دیا۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے:

مَنْ غَشَّ فَلَیْسَ مِنَّا۔ (مسلم)

جس نے دھوکہ دیا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

۳- تیسری شرط یہ ہے کہ زیادہ منافع کی غرض سے ذخیرہ اندوزی نہ کرے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے:

لَا یَحْتَکِرُ اِلَّا خَاطِئٌ۔ (مسلم، ابوداؤد)

ذخیرہ اندوزی وہ کرتا ہے جو گناہ گار ہوتا ہے۔

۴- چوتھی شرط یہ ہے کہ مال فروخت کرتے وقت سچی جھوٹی قسمیں نہ کھائے۔

۵- پانچویں شرط یہ ہے کہ سامان بہت مہنگا نہ بیچے۔ مثلاً یہ کہ حکومت نے قیمت متعین کر دی ہو اور تاجر زیادہ نفع کی لالچ میں اس قیمت سے زیادہ قیمت میں سامان فروخت کرے۔ حدیث ہے:

مَنْ دَخَلَ فِیْ شَیْءٍ مِّنْ اِسْعَارِ الْمُسْلِمِیْنَ لِیُغْلِیَهٗ عَلَیْهِمْ کَانَ حَقًّا عَلَی اللّٰهِ اَنْ یُّقْعِدَهٗ بِعِظَمٍ مِّنَ النَّارِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ۔

(مسند احمد، طبرانی، حاکم)

جس نے قیمتوں میں کسی قسم کی دخل اندازی کی تاکہ مسلمانوں پر اسے مہنگا کردے تو اللہ پر واجب ہے کہ اسے قیامت کے دن آگ پر بٹھائے۔

۶- چھٹی شرط یہ ہے کہ اپنے مال کی زکوٰۃ نکالے۔

۷- ساتویں شرط یہ ہے کہ تجارت تاجر کو دینی فرائض مثلاً نماز، روزہ، حج یا صلہ رحمی وغیرہ سے غافل نہ کردے۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ تاجر حضرات اپنی تجارت میں اس قدر محو رہتے ہیں کہ دین و دنیا سے غافل ہو کر بس جوڑ گھٹاؤ میں مصروف رہتے ہیں۔ نہ نماز کا ہوش ہوتا ہے نہ انہیں اہلِ خانہ کی فکر ہوتی ہے اور نہ رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کا کوئی خیال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کی تعریف کرتے ہوئے فرماتا ہے:

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ (النور:۳۷)

ان میں ایسے لوگ صبح وشام اس کی تسبیح کرتے ہیں جنہیں تجارت اور خرید وفروخت اللہ کی یاد سے اور نماز کی ادائیگی اور ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کردیتی۔

یہ ہیں وہ شرطیں جن کا ہر مسلمان تاجر کو پاس ولحاظ کرنا چاہئے۔ کیوں کہ اگر اس نے ان شرائط کے مطابق تجارت کی تو اس کے لئے ایک خوش خبری ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے:

اَلتَّاجِرُ الصُّدُوْقُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ. (ترمذی)

ایماندار اور سچا تاجر قیامت کے دن انبیاء، نیکوکاروں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔

بینک کا سود حلال ہے یا حرام

سوال: میں نوکری کرتا ہوں اور میری تنخواہ بھی معقول ہے۔ اس تنخواہ کا ایک حصہ میں ہر مہینے بینک میں جمع کرادیتا ہوں اور اس پر سود (Interest) لیتا ہوں۔ کیا اس کا لینا میرے لئے جائز ہے؟ مرحوم شیخ شلتوت نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ میں نے متعدد علماء سے اس بارے میں سوال کیا۔ بعض نے اسے جائز قرار دیا اور بعض نے حرام۔ واضح رہے کہ میں بینک میں اکٹھے کئے ہوئے روپیوں کی زکوٰۃ بھی نکالتا ہوں۔ اگر اس سود کا لینا جائز نہیں ہے تو پھر میں ان پیسوں کا کیا کروں؟

جواب: بینک میں جمع کئے ہوئے پیسے پر سود لینا حرام ہے' کیوں کہ یہ سود ہے جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔ سود کی تعریف یہ ہے کہ اصل مال پر جو زائد رقم بغیر محنت یا تجارت کے لی جائے وہ سود ہے۔ اسی لئے اللہ کا فرمان ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ

كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ج وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ج (البقرة:۲۷۸،۲۷۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر واقعی تم ایمان لائے ہو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ اب بھی توبہ کرلو اور سود چھوڑ دو تو اپنا اصل سرمایہ لینے کے تم حقدار ہو۔

اس آیت کے مطابق سود سے توبہ کرنے کا مطلب ہے کہ انسان اپنا اصل مال لے لے اور اس سے جو زائد رقم ہے، اسے چھوڑ دے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل مال سے جو زائد رقم ہے وہی سود ہے۔

جہاں تک میں جانتا ہوں شیخ شلتوت نے بینک کے سود کو صرف مجبوری کی حالت میں جائز قرار دیا ہے۔ عام حالات میں بینک کا سود اِن کے یہاں بھی جائز نہیں ہے۔

دینِ اسلام اس بات کو جائز نہیں تصور کرتا کہ انسان اپنا مال کسی جگہ جمع کرے اور بغیر کسی محنت یا تجارت کے اس پر ایک متعین فائدہ لیتا رہے۔ اگر وہ واقعی بینک میں اپنا مال بحیثیت شریک یا ساجھے دار کے جمع کر رہا ہے تو اسے نفع ونقصان دونوں میں شریک ہونا چاہئے۔ اور نفع کو متعین کرنے کے بجائے اتنا ہی نفع لے جتنا نفع بینک نے کمایا ہے۔ چاہے یہ نفع تھوڑا ہو یا زیادہ۔ لیکن عملاً ہوتا یہ ہے کہ بینک میں پیسہ جمع کرنے والا صرف نفع میں شریک ہوتا ہے نقصان میں نہیں۔ اور نفع کی بھی مقدار متعین ہوتی ہے۔ چنانچہ نفع کی ایک قلیل مقدار اس کے حصے میں آتی ہے حالانکہ بینک کا منافع بسا اوقات ۸۰ یا ۹۰ فیصد سے بھی زائد ہوتا ہے، لیکن بینک میں پیسے رکھنے والے صرف ۵ یا ۶ فیصد نفع لیتے ہیں۔

رہا سوال کہ اس حرام Interest کا کیا کیا جائے؟

بعض علماء کہتے ہیں کہ چونکہ یہ حرام ہے اس لئے اس کا لینا جائز نہیں ہے اور اگر لے لیا تو اس کا صدقہ کرنا صحیح نہیں ہے' اس لئے اسے سمندر میں پھینک دینا چاہئے' لیکن میری رائے میں سمندر میں پھینکنا صحیح نہیں ہے' کیوں کہ اس طرح مال کا ضیاع ہے جس سے اللہ نے منع کیا ہے۔

بہترین شکل یہ ہوگی کہ اسے غریبوں اور مسکینوں پر تقسیم کردے یا کسی رفاہی کام میں خرچ کردے یا کسی ایسے کام میں خرچ کردے جس میں اسلام اور اُمت مسلمہ کا فائدہ ہو۔

یہ بات کافی نہیں ہے کہ آپ اس کی زکوٰۃ ادا کردیں۔ کیوں کہ زکوٰۃ ادا کردینے سے حرام مال حلال نہیں ہو جاتا۔ صحیح یہ ہے کہ اس حرام مال کو استعمال نہ کیا جائے۔ Interest کی رقم کو بینک میں چھوڑ دینا بھی صحیح نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ رقم بینک میں چھوڑ کر آپ اس بینک کے ہاتھ مضبوط کریں گے جو سودی کاروبار کر رہا ہے۔

بعض لوگ یہ اعتراض کرسکتے ہیں کہ ہمارے جمع کئے ہوئے پیسے سے بینک تجارت کرتا ہے اور نفع کماتا ہے تو ہمیں بھی اس نفع میں سے کچھ ملنا چاہئے۔

میں کہتا ہوں کہ آپ اس نفع میں بہ خوشی شریک ہو سکتے ہیں بہ شرطے کہ پیسہ جمع کرتے وقت آپ بینک والوں کو یہ بتادیں کہ آپ بینک کی تجارت میں ساجھے دار کی حیثیت سے پیسہ جمع کر رہے ہیں اور یہ کہ آپ نفع و نقصان دونوں میں برابر کے شریک رہیں گے۔ اگر بینک آپ کی اس شرط پر راضی ہو جائے تو بے شبہ آپ اس نفع میں شریک ہو سکتے ہیں۔ لیکن عملاً یہ ہوتا ہے کہ لوگ بینک کے نفع میں تو شریک ہونا چاہتے ہیں۔ تاہم بینک کا خسارہ ہو جائے یا بینک دیوالیہ ہو جائے تو لوگ اس نقصان میں شریک نہیں ہوتے اور اپنا مال مع سود کے واپس لینے کی جدوجہد میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

بینک کی نوکری

سوال: میں نے کامرس میں گریجویشن کی ڈگری لی ہے۔ اس ڈگری کی بنیاد پر میں

نوکری تلاش کرتا رہا۔ کافی تلاش کے بعد مجھے ایک بینک میں نوکری ملی۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ بینک میں سودی کاروبار ہوتا ہے' لیکن میں اس نوکری کو قبول کرنے پر مجبور ہوں۔ کیوں کہ یہی میری روزی روٹی کا ذریعہ ہے۔ کیا میں یہ نوکری چھوڑ دوں یا یہ نوکری میرے لئے جائز ہے؟

جواب: بے شبہ اسلام کا معاشی نظام سودی کاروبار کی مکمل نفی کرتا ہے۔ اسلام کی نظر میں سود کا شمار گناہِ کبیرہ میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سودی کاروبار کرنے والوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَذَرُوا۟ مَا بَقِىَ مِنَ ٱلرِّبَوٰٓا۟ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ○ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا۟ فَأْذَنُوا۟ بِحَرْبٍ مِّنَ ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ (البقرہ: ۲۷۸، ۲۷۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو۔ اگر واقعی تم ایمان لائے ہو۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔

اللہ کے رسول کا فرمان ہے:

إِذَا ظَهَرَ الزِّنَا وَالرِّبَا فِيْ قَرْيَةٍ فَقَدْ أَحَلُّوْا بِأَنْفُسِهِمْ عَذَابَ اللّٰهِ. (حاکم)

جب کسی بستی میں زنا اور سود عام ہو جائے تو وہ لوگ اپنے اوپر اللہ کے عذاب کو حلال کر لیتے ہیں۔

دینِ اسلام کا قانون یہ ہے کہ گناہوں اور برائیوں کو بزورِ قوت روکا جائے۔ اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو کم از کم یہ ضروری ہے کہ ان گناہوں سے دور رہا جائے اور ان میں کسی قسم کی شرکت نہ ہو۔ اسی لئے اسلام نے ہر اُس فعل کو حرام قرار دیا ہے جو معصیت

میں مددگار ثابت ہو۔ اسلام کی نظر میں گناہ کرنے والا اور گناہ میں مددگار بننے والا دونوں برابر کے مجرم ہیں۔ اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا کہ شراب پینے والا، پلانے والا، بنانے والا، فراہم کرنے والا سب ہی اللہ کی نظر میں ملعون ہیں۔ اسی طرح سود کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا:

لَعَنَ اٰكِلَ الرِّبَا وَمُوْكِلَهٗ وَشَاهِدَيْهِ۔ (مسلم)

حضور ﷺ نے سود کھانے والے، کھلانے والے اور اس معاملے میں دونوں گواہوں پر لعنت فرمائی ہے۔

اسی مفہوم کی متعدّد احادیث حدیث کی کتابوں میں وارد ہیں اور ساری حدیثیں صحیح ہیں۔ ان ہی احادیث کی بنا پر دیندار حضرات کا ضمیر بینک میں کام کرنے پر مطمئن نہیں ہوتا۔ بینک میں کام کرنے کی وجہ سے ان کا ضمیر ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہتا ہے۔

تاہم میری رائے میں بینک میں جو سودی نظام رائج ہے اس کا تعلّق بینک کے اسٹاف سے نہیں ہوتا ہے۔ یہ سودی نظام تو بینک کے کاروبار کا ایک اٹوٹ حصہ ہے۔ یہ سودی نظام ہمارے پورے معاشی ڈھانچے کا ایسا جزولاینفک بن چکا ہے کہ اس سے فرار ممکن نہیں۔ اسی کی طرف یہ حدیث اشارہ کرتی ہے:

لَيَاْتِيَنَّ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَّا يَبْقٰى مِنْهُمْ اَحَدٌ اِلَّا اٰكِلَ الرِّبَا فَمَنْ لَّمْ يَاْكُلْهُ اَصَابَهٗ مَنْ غُبَارِهٖ۔ (ابوداؤد اور ابن ماجہ)

لوگوں پر ایک ایسا وقت آئے گا جب کہ کوئی ایسا نہیں بچے گا جو سود نہ کھاتا ہو۔ اگر وہ سود نہیں کھاتا تو اس کی دھول سے نہیں بچ سکتا (یعنی کچھ نہ کچھ سود وہ ضرور کھائے گا)

یہ ایسی صورتِ حال ہے کہ بینک کے کسی اسٹاف کے نوکری چھوڑ دینے سے اس سودی نظام پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اس پر اثر اس وقت پڑ سکتا ہے جب پورا معاشرہ مل کر اس کے خلاف کچھ کرے۔ یکبارگی تو اس نظام کو بدلنا ممکن نہیں۔ البتہ دھیرے

دھیرے اس نظام کو بدلنے کی پوری کوشش ہونی چاہئے۔ اسلام کا قانون بھی یہی کہتا ہے کہ معاشرے میں کسی برائی کی اصلاح دھیرے دھیرے اور بہ تدریج ہو۔ چنانچہ اللہ نے جب شراب حرام کی تو اسے یکایک حرام قرار نہیں دیا بلکہ بہ تدریج اس کی حرمت کا اعلان کیا۔

بہر حال مسلم معاشرے کے ہوش مند افراد کا فرض ہے کہ سودی نظام کو اسلامی اقتصادی نظام میں بدلنے کی ہر ممکن کوشش کریں اور یہ کام کوئی ناممکن بھی نہیں ہے۔ (۲)

اگر ہم مسلمانوں کو بینک کی نوکری سے منع کر دیں گے تو صورتِ حال یہ ہوگی کہ بینک میں یہودی، عیسائی اور دوسرے غیر مسلموں کا غلبہ ہو جائے گا۔ خصوصاً کسی مسلم ملک کے بینکوں پر غیر مسلموں کا قبضہ ہو جائے تو جو خطرناک نتائج ہوں گے ان کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ بینک میں سارا کا سارا سودی کاروبار ہوتا ہو۔ بینک میں حلال طریقہ سے تجارت بھی ہوتی ہے۔ اب تو صورتِ حال یہ ہے کہ سودی کاروبار کم ہی ہوتا ہے اور بینک کے زیادہ تر کاروبار حلال تجارت پر مشتمل ہوتے ہیں۔

اس لئے میری رائے میں بینک کی نوکری کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، خواہ اس کا ضمیر اس پر مطمئن نہ ہو۔ البتہ اس بات کا لحاظ رہے کہ بینک میں اپنے فرائض وہ بخوبی انجام دے' ایسا نہ کرے کہ ضمیر کی بے اطمینانی کی وجہ سے اپنی ذمہ داریوں میں کوتاہی کرے۔

آخر میں' میں کہنا چاہوں گا کہ انسان کی زندگی میں ایسے حالات بھی آتے ہیں کہ انسان بہت کچھ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اسلام نے انسانی مجبوری کی مکمل رعایت کی ہے۔ اسی مجبوری کے تحت بسا اوقات انسان بینک کی نوکری اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں ہم اسے ایسا کرنے سے منع نہیں کر سکتے۔ اللہ کا فرمان ہے:

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

رَّحِيمٌ ○ (البقرة:۱۷۳)

پس جو شخص مجبور ہو اس کیلئے، لیکن نہ اس کی خواہش رکھتا ہو اور نہ دوبارہ ایسا کرنا چاہتا ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ بے شک اللہ غفور و رحیم ہے۔

کسی غیر اسلامی ملک میں متعدد ٹیکس کی وجہ سے مسلمانوں کی پریشانی

سوال: میں ایک غیر اسلامی ملک میں رہتا ہوں۔ اس ملک میں مسلمان بھی بستے ہیں۔ ایک تاجر پیشہ شخص ہوں۔ غیر مسلم ملک میں ایک مسلمان تاجر کو بعض اوقات ایسے مسائل درپیش ہوتے ہیں جن کا حل اس کی سمجھ سے باہر ہوتا ہے۔ چونکہ فقہی امور میں آپ کی نظر کافی گہری ہے اس لئے میں آپ کے سامنے بعض مسائل پیش کرتا ہوں اور ان کا حل معلوم کرنا چاہتا ہوں:

۱- کیا سامانِ تجارت کا انشورنس جائز ہے؟ واضح رہے کہ حکومت کی طرف سے ان کا انشورنس کرانا لازمی ہوتا ہے اور ہمارے لئے حکومت کے اس قانون پر عمل کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔

۲- کیا تجارت کو فروغ دینے کے لئے بینک سے قرض لیا جاسکتا ہے؟

۳- ہم جس ملک میں رہتے ہیں یہاں کی حکومت ہم سے اس قدر ٹیکس لیتی ہے کہ اس کا ادا کرنا ہمارے لئے وبالِ جان ہے۔ مثلاً اگر ہماری سالانہ آمدنی چالیس ہزار ڈالر ہے تو حکومت ٹیکس کے نام پر بارہ ہزار ڈالر لے لیتی ہے۔ اسی طرح اگر ہماری سالانہ آمدنی ایک لاکھ ڈالر ہے تو حکومت پچھتر ہزار ڈالر ٹیکس لے لیتی ہے۔ واضح رہے کہ ان ٹیکسوں کے علاوہ ہمیں زکوٰۃ بھی ادا کرنی ہوتی ہے۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ جو کچھ ہم ٹیکس کی صورت میں ادا کرتے ہیں اسے زکوٰۃ سمجھ کر ادا کریں، تاکہ الگ سے زکوٰۃ نکالنے کی ضرورت نہ رہے۔ اگر یہ صورت جائز ہو جائے تو ہماری پریشانیوں میں کمی ہو سکتی ہے۔

جواب: سب سے پہلے تو میں یہ کہنا چاہوں گا کہ آپ نے جن مسائل اور پریشانیوں کا تذکرہ کیا ہے وہ پیدا ہی نہ ہوں اگر معاشرے میں اسلامی قوانین اور اسلامی

نظامِ حیات رائج ہو۔ لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے مغربی تہذیب اور مغربی قوانین کو اپنا رکھا ہے خاص کر معاشی معاملات میں جن کی بنیاد اسلامی بنیادوں سے بالکل مختلف ہے۔ چنانچہ مغربی نظامِ معیشت کا سارا دارومدار سود پر ہوتا ہے جب کہ اسلامی نقطہ نظر سے سود اللہ اور اس کے رسول کے خلاف اعلانِ جنگ کے مترادف ہے۔

مغربی قوانین کو اپنانے کی وجہ سے بعض ایسی پریشانیاں اور مسائل جنم لیتے ہیں جن کی وجہ سے فردِ مسلم حیران و پریشان ہو جاتا ہے اور دینِ اسلام سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ان مسائل کا حل پیش کرے۔ ہماری غلطی یہ ہے کہ ہم دینِ اسلام سے ان مسائل کا حل مانگتے ہیں جنہیں اسلام نے نہیں، بلکہ مغربی تہذیب نے جنم دیا ہے۔ پہلے ہم مکمل مغربی نظامِ معیشت اور سودی بینک کے سسٹم کو اپنا لیتے ہیں اور اس کے بعد دینِ اسلام سے امید کرتے ہیں کہ اس سسٹم کی وجہ سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں اسلام ان کا حل پیش کرے۔

اگر آپ واقعی اسلام سے ان کا حل مانگتے ہیں تو اسلام کا دوٹوک جواب یہ ہے کہ آپ ان مغربی قوانین کے بجائے اسلامی قوانین کی طرف پیش قدمی کریں۔ مغربی طرز کے بینکوں کو الوداع کہیں اور ان کی جگہ اسلامی قوانین کی بنیاد پر اسلامی بینک کی داغ بیل ڈالیں۔ اگر یقین محکم اور مضبوط ارادہ ہو تو یہ کوئی مشکل اور ناممکن کام نہیں ہے۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایک فرد کی کیا غلطی ہے اگر پورا معاشرہ اور پورا حکومتی ڈھانچہ اسلام سے منحرف ہو۔ اکیلا شخص کیا کر سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ افراد ہی سے معاشرے کی تشکیل ہوتی ہے۔ اگر فردِ واحد ان مغربی قوانین پر خاموش تماشائی بنا بیٹھا ہے اور انہیں قوانین کے مطابق زندگی گزارتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان قوانین پر راضی ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر وہ ان قوانین کو زندہ رکھنے میں شریکِ کار ہے۔ ایک مسلمان کو چاہئے کہ وہ ان مغربی قوانین پر کبھی مطمئن ہو کر نہ بیٹھ رہے۔ ضروری ہے کہ اس کا شعور بیدار رہے کہ یہ سارے قوانین باطل

اور غیر اسلامی ہیں اور انہیں تبدیل ہونا چاہیے۔ اور جب بھی اسے موقع میسّر ہو انہیں تبدیل کرنے کی پوری کوشش کرے۔ اگر کوئی مسلمان ان مغربی قوانین کے تحت محکوم ہو کر زندگی گزار رہا ہے تو ضروری ہے کہ اسے گھٹن اور گناہ کا شدید احساس ہو۔ اگر اس کے پاس یہ احساس بھی نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا ایمان مردہ ہو چکا ہے۔

اس موقع پر میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ ان جیسے مسائل کے حل کے لئے ایسا فتویٰ دینا، جس میں مغربی قوانین اور مغربی تہذیب سے مصالحت اور Compromise کی بو آتی ہو' ایک زبردست غلطی ہے۔ یہ اس بات کا اشارہ ہو گا کہ ہم نے ان مغربی قوانین کے مقابلے میں فکری اور روحانی شکست تسلیم کر لی ہے۔ ایسی زندگی سے کیا حاصل، جس میں ہماری اپنی عقل اور مرضی کا عمل دخل نہ ہو۔ بلکہ وہ اسلام کے دشمنوں کی مرضی کے مطابق تشکیل پائی ہوئی زندگی ہو؟ جس میں ہمارے قوانین رائج نہ ہوں' بلکہ زندگی گزارنے کے لئے ہم اپنے دشمنوں سے قوانین ادھار لیں۔ آزادی اور بالادستی کا تقاضا ہے کہ ہم ان ادھار کے قوانین سے نجات حاصل کریں اور مصمم ارادے کے ساتھ تہیّہ کریں کہ ان غیر اسلامی قوانین کو کسی قیمت پر بھی اختیار نہیں کرنا ہے۔

اس تمہید کے بعد میں آپ کے سوالوں کی طرف آتا ہوں:

جہاں تک سامانِ تجارت کے انشورنس کا تعلّق ہے تو یہ چیز جائز ہو سکتی ہے اگر اس میں سود کی ملاوٹ نہ ہو' لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ موجودہ قوانین کے تحت سود سے پاک انشورنس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے میری رائے میں سامانِ تجارت کا انشورنس صرف مجبوری اور اضطراری حالت ہی میں جائز ہو سکتا ہے۔ البتہ لائف انشورنس تو کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔

تجارت میں توسیع کی خاطر بینک سے قرض لینا قطعاً حرام ہے۔ کیوں کہ ایسی صورت میں انسان سود دینے کا مرتکب ہو گا اور سود لینا یا دینا دونوں ہی حرام ہیں۔ بینک سے قرض لینا انتہائی مجبوری کی حالت میں جائز ہو سکتا ہے۔ مثلاً بال بچوں کے پیٹ

بھرنے کا مسئلہ ہو یا کسی مریض کی جان پر بنی ہو اور اس کے علاج کا مسئلہ ہو اور مالی مشکلات درپیش ہوں۔ ان صورتوں میں بہ قدرِ ضرورت بینک سے قرض لیا جا سکتا ہے۔ تجارت کو فروغ دینا ایسی ضرورت نہیں ہے کہ اس کے لئے حرام چیز جائز قرار دی جائے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ تھوڑا ہی کھائیں لیکن حلال کھائیں۔ تھوڑے سے حلال پر قناعت کرنا اس بات سے لاکھ درجہ بہتر ہے کہ آپ زیادہ کھائیں اور حرام کھائیں۔

آپ نے سوال کیا ہے کہ آپ حکومت کو کافی مقدار میں ٹیکس ادا کرتے ہیں تو کیا اس ٹیکس کو زکوٰۃ سمجھ کر ادا کیا جا سکتا ہے؟ میرا جواب نفی میں ہوگا۔ کیوں کہ زکوٰۃ ایک عبادت ہے اور تمام عبادتوں کی طرح اس عبادت کی بھی چند شرائط ہیں:

۱- پہلی شرط یہ ہے کہ زکوٰۃ کی رقم زکوٰۃ کے نام پر نکالی جائے اور اس مقدار میں نکالی جائے جو مقدار شریعت نے مقرر کردی ہے۔

۲- دوسری شرط یہ ہے کہ زکوٰۃ کی رقم ان مصارف میں خرچ کی جائے جن کی طرف اللہ تعالیٰ نے سورۂ توبہ میں اشارہ کیا ہے۔

۳- تیسری شرط یہ ہے کہ زکوٰۃ کی رقم زکوٰۃ کی نیّت سے ادا کی جائے۔ کیوں کہ زکوٰۃ ایک عبادت ہے اور عبادتوں میں نیّت شرط ہے۔

آپ جو حکومت کو ٹیکس ادا کرتے ہیں اسے آپ زکوٰۃ کی نیّت کر کے تو ادا کر سکتے ہیں لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ حکومت اس رقم کو ان مصارف میں خرچ کرے گی جن کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ اس بات کی ضمانت اسلامی حکومت سے نہیں لی جا سکتی چہ جائے کہ حکومت کافروں کے ہاتھ میں ہو۔

اس لئے آپ کو چاہئے کہ آپ اپنے ایمان کو مضبوط تر کریں۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ ٹیکس کے علاوہ زکوٰۃ کی رقم بھی نکالی جائے۔ خواہ تنگ دستی اور مالی پریشانی کا ڈر کیوں نہ ہو۔ آپ اس دنیا میں تھوڑا نقصان برداشت کرلیں یہ بہتر ہے اس بات سے کہ آخرت میں آپ کو عذاب برداشت کرنا پڑے۔ بے شبہ غیر مسلموں کے

مقابلے میں آپ پر اس ٹیکس اور زکوٰۃ کی وجہ سے مالی بوجھ زیادہ ہوگا لیکن آپ کے لئے باعثِ سکون یہ بات ہونی چاہئے کہ مسلمان ہونے کی وجہ سے آپ پر مالی بوجھ زیادہ ہے۔ اسی وجہ سے حدیث میں ہے کہ فتنوں اور مصیبتوں کا ایک ایسا دور آئے گا جب مسلمان ہونا اتنا ہی تکلیف دہ ہوگا جیسا کہ ہاتھوں میں انگارا لینا۔ حدیث ہے:

اِنَّ الْقَابِضَ عَلٰی دِیْنِہٖ فِیْ ھٰذَا الزَّمَانِ کَا الْقَابِضِ عَلَی الْجَمْرِ.

اس دور میں اپنے دین کو مضبوطی سے پکڑنے والا ایسا ہوگا جیسا انگارے کو پکڑنے والا۔

اسی لئے علماء کہتے ہیں کہ اس دور میں مضبوطی کے ساتھ دین پر قائم رہنے والا بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے مقابلے میں پچاس گنا زیادہ اجر وثواب کا مستحق ہے۔

مجرم کو جیل سے رہا کرانے کے لئے رشوت دینا

سوال: ایک شخص ہیروئن سمگلنگ کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ اسے پندرہ سال قید کی سزا ہوئی۔ اس کا چچا لوگوں سے مالی مدد طلب کرتا پھر رہا ہے' تاکہ رشوت دے کر اپنے بھتیجے کو جیل سے رہا کرا سکے۔ چچا اپنے بھتیجے کی مجرمانہ حرکت کی حمایت نہیں کرتا تاہم وہ اسے جیل سے اس لئے رہا کرانا چاہتا ہے کہ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور سزا کی مدّت بہت زیادہ ہے۔ کیا ایسی صورت میں رشوت دینا جائز ہوگا؟

جواب: ہیروئن جیسی چیزوں کی سمگلنگ کرنا ایسا بھیانک جرم ہے کہ ایسے مجرم کو اس کے کئے کی سزا ملنی چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ منشیات سے بڑھ کر معاشرے کو تباہ وبرباد کرنے والی کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ یہ شراب کی طرح ہے' بلکہ شراب سے بھی بڑھ کر ہے' کیوں کہ ان منشیات کا استعمال کرنے والا ہمیشہ تصوّرات کی دنیا میں مگن رہتا ہے اور منشیات نہ ملنے کی صورت میں پاگل ہو جاتا ہے۔ ایسے افراد سے ہرگز وہ معاشرہ تشکیل نہیں پا سکتا جو کسی کام کے لائق ہو۔ ایسا معاشرہ ناکارہ اور نااہل افراد پر مشتمل ہوگا۔ چنانچہ جو لوگ ان منشیات کی سمگلنگ کرکے معاشرے کو تباہ وبرباد کرتے ہیں' وہ سخت سے

سخت سزا کے مستحق ہیں۔ اگر حکومت نے اسے پندرہ سال قید کی سزا دی ہے تو اب اسے یہ سزا بھگتنی چاہئے۔

ایسے شخص کو سزا سے بچانا بہ ذاتِ خود ایک جرم ہے۔ کیوں کہ اس طرح مجرم کے ہاتھ مضبوط ہوں گے اور اسے سزا سے بچانے کے لئے رشوت دینا دوہرا جرم ہوا۔ کیوں کہ یہ حدیثِ نبوی ﷺ ہے:

لعن الرسول الراشي والمرتشي والرائش۔ (ترمذی، حاکم، ابن حبان، احمد)

نبی ﷺ نے رشوت دینے والے، لینے والے اور اس کام میں دلال بننے والے، سب پر لعنت فرمائی ہے۔

چچا کو چاہئے کہ لوگوں سے جو مالی مساعدہ ملتا ہے اسے بھتیجے کے بال بچوں کی کفالت پر خرچ کرے، نہ کہ رشوت دے کر ایک مجرم کو سزا سے بچانے کے لئے یہ رقم خرچ کرے۔ یہ بچے بچارے اپنے باپ کے جرم میں شریک نہیں ہیں۔ یہ لوگوں کی مدد کے محتاج ہیں۔ ان کی ہر ممکن مدد کرنی چاہئے۔

ویسے یہ حکومت کی ذمے داری ہے کہ جن افراد کو وہ قید کرتی ہے ان کے اہل وعیال کی کفالت وہ خود کرے۔ کیوں کہ بال بچوں کو بے سہارا چھوڑ دینا ان کو تباہ و برباد کرنے کے لئے کافی ہے اور کیا پتا کہ بے سہارا ہونے کی وجہ سے یہ بچے بڑے ہو کر خود مجرم بن جائیں۔

جھوٹ بولنا ایمان کے منافی ہے

سوال: ایسا دین دار شخص جو تمام فرائض وواجبات ادا کرتا ہے، لیکن جھوٹ بولنے سے پرہیز نہیں کرتا، کیا اس کا شمار صالحین میں ہوگا؟

جواب: جھوٹ بولنا انتہائی بُری خصلت ہے۔ یہ مؤمنین وصالحین کے اوصاف میں سے نہیں ہے، بلکہ یہ تو منافقین کے اوصاف میں سے ہے۔ حدیثِ نبوی ﷺ ہے:

اٰيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ۔ (بخاری، مسلم)

منافق کی تین علامتیں ہیں۔ جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے اور جب وعدہ کرتا ہے تو وعدہ خلافی کرتا ہے اور جب اسے امین بنایا جائے تو اس میں خیانت کرتا ہے۔

اسی مفہوم میں دوسری احادیث بھی ہیں۔ ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جھوٹ بولنا' صالحین کی نہیں' بلکہ منافقین کی عادت ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

إِنَّمَا يَفْتَرِى الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝ (النحل:۱۰۵)

جھوٹ وہ لوگ گھڑتے ہیں جو اللہ کی آیات کو نہیں مانتے۔ وہی حقیقت میں جھوٹے ہیں۔

حدیثِ نبوی ﷺ ہے:

قَدْ سُئِلَ النَّبِيُّ ﷺ اَيَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ جَبَانًا ؟ قَالَ نَعَمْ قِيْلَ اَيَكُوْنُ بَخِيْلًا قَالَ نَعَمْ قِيْلَ اَيَكُوْنُ كَذَّابًا قَالَ لَا۔ (موطا امام مالک)

نبی ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا مومن بزدل ہو سکتا ہے۔ آپ ﷺ نے جواب دیا ہاں۔ پوچھا گیا کہ کیا مومن کنجوس ہو سکتا ہے۔ آپ ﷺ نے جواب دیا ہاں۔ پوچھا گیا کیا مومن جھوٹا ہو سکتا ہے آپ ﷺ نے جواب دیا کہ نہیں۔

ایسا اس لئے ہے کہ بزدلی اور کنجوسی ایک فطری عادت بھی ہو سکتی ہے' لیکن جھوٹ بولنا فطری عادت نہیں' بلکہ انسان ارادی طور پر جھوٹ بولتا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل حدیث میں ہے:

اِيَّاكُمْ وَالْكِذْبَ فَاِنَّ الْكِذْبَ يَهْدِىْ اِلَى الْفُجُوْرِ وَاِنَّ الْفُجُوْرَ يَهْدِىْ اِلَى النَّارِ وَلَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَكْذِبُ وَيَتَحَرّٰى يَكْذِبُ حَتّٰى يُكْتَبُ عِنْدَ اللّٰهِ كَذَّابًا۔ (بخاری، مسلم)

جھوٹ سے بچو' کیوں کہ جھوٹ فسق و فجور کی راہ دکھاتا ہے اور فسق و فجور جہنم تک لے جاتا ہے اور انسان جھوٹ بولتا رہتا ہے اور جھوٹ کی تلاش میں رہتا ہے حتیٰ کہ اللہ کے یہاں جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔

معلوم ہوا کہ جھوٹ بولنا ایک ایسی عادت ہے جو انسان خود اپنی کوشش سے اختیار کرتا ہے۔ نبی ﷺ نے تاکید کی ہے کہ بچوں کو شروع ہی سے سچ بولنے کا عادی بنایا جائے اور جھوٹ بولنے سے روکا جائے۔ حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے کسی صحابی رضی اللہ عنہ کو اپنے بچے سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں تمھیں فلاں فلاں چیز دوں گا (وہ اپنے بچے کو بہلانا چاہتے تھے) آپ ﷺ نے ان سے سوال کیا کہ واقعی تم اپنے بچے کو یہ چیزیں دو گے؟ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ یا تو تم اسے یہ چیزیں دو یا پھر سچ بولو۔ کیوں کہ اللہ نے جھوٹ بولنے سے منع فرمایا ہے۔ صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ کیا یہ بھی کوئی جھوٹ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بلاشبہ یہ جھوٹ ہے۔ بڑا جھوٹ' بڑا جھوٹ لکھا جائے گا اور چھوٹا جھوٹ' چھوٹا جھوٹ لکھا جائے گا۔ (مُسند احمد)

جھوٹ کے مختلف درجات ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یا نقصان جتنا بڑا ہوگا اس کا گناہ بھی اسی قدر بڑا ہوگا۔ اس لئے بعض جھوٹ کا شمار گناہِ صغیرہ میں ہوتا ہے اور بعض کا شمار گناہِ کبیرہ میں۔ اسی لئے حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس بادشاہ کی طرف نظر بھی نہیں کرے گا جو جھوٹا تھا۔ اس لئے کہ بادشاہ بننے کے بعد اسے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے باوجود اس نے بولا یہ جانتے ہوئے کہ بادشاہ کے جھوٹ کا اثر عام لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے ایسے بادشاہ کا قیامت کے دن یہ انجام ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھے گا نہیں اور اس کے لئے عذابِ الیم ہوگا۔ (مسلم)

سفید جھوٹ

سوال: میں نے اپنی سہیلی سے وعدہ کیا کہ میں اس کے پاس فلاں دن آؤں گی' لیکن گھر کی بعض مصروفیات کی وجہ سے میں اس کے پاس اس دن نہ جا سکی۔ جب بعد

میں اس سے ملاقات ہوئی تو مجھے شرمندگی ہوئی کہ میں اپنا وعدہ پورا نہ کرسکی۔ چنانچہ میں نے بہانہ بنادیا کہ گھر میں عین وقت پر کچھ مہمان آگئے تھے' اس لئے میں نہ آسکی۔ کیا اس طرح کی بہانہ بازی جھوٹ کہلائے گی؟ حالانکہ میں نے یہ بہانہ محض اس لئے کیا کہ میری سہیلی مجھ سے ناراض نہ ہو اور ہمارے تعلّقات متاثر نہ ہوں۔ یہ ایسا جھوٹ ہرگز نہیں جیسا کہ لوگ خرید وفروخت میں دھوکہ دینے کے لئے یا کسی کا حق مارنے کے لئے بولتے ہیں۔ میرا جھوٹ بولنا تو محض اس لئے تھا کہ میں آسانی سے اپنی سہیلی کو منا سکوں۔ کیا ایسا جھوٹ بولنا شریعت کی نظر میں جائز ہے؟

جواب: کسی جیّد اور معتبر عالم سے اس مقصد کے لئے سوال کرنا کہ کہیں سے کوئی رخصت کا پہلو نکل آئے شرعاً جائز ہے۔ اسی لئے سفیان الثوری نے فرمایا ہے کہ:

انما العلم الرخصة من ثقة ' اما التشديد فيحسنه كل احد

علم یہ ہے کہ کسی معتبر عالم سے رخصت اور چھوٹ کا پہلو نکل آئے رہی سختی اور تشدد تو یہ کام تو ہر کوئی بخوبی کرسکتا ہے۔

لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر معاملہ میں رخصت کا پہلو نکالا جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ جھوٹ بولنے کی رخصت نہیں دی جاسکتی اِلّا یہ کہ انتہائی ناگزیر حالت ہو۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ جھوٹ بولنا اسلامی شریعت کی نگاہ میں گناہ کبیرہ ہے۔ متعدّد قرآنی آیات اور صحیح احادیث (پہلے سوال میں ان کا تذکرہ ہو چکا ہے) ہیں جن میں جھوٹ بولنے کی صریح ممانعت ہے۔ ذیل میں مزید دو حدیثیں پیش کر رہا ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

يَطْبَعُ الْمُؤْمِنُ عَلٰى كُلِّ خَلَّةٍ غَيْرَ الْخِيَانَةِ وَالْكِذْبِ۔ (بزار اور ابویعلیٰ)

مومن ہر بات کا عادی ہوسکتا ہے سوائے خیانت اور جھوٹ کے۔

دوسری حدیث ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

مَا كَانَ مِنْ خُلُقٍ اَبْغَضَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ مِنَ الْكِذْبِ۔

(مسند احمد، بزاز اور حاکم)

رسول اللہ ﷺ کے نزدیک جھوٹ سے بڑھ کر کوئی ناپسندیدہ عادت نہیں تھی۔

یہ تمام قرآنی آیات اور صحیح احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ دینِ اسلام کس شدت کے ساتھ جھوٹ کو ناپسند کرتا ہے۔ تاہم اسلام جہاں اعلیٰ قدروں اور بہترین اخلاق کی تعلیم دیتا ہے وہیں ایک عملی اور Practical مذہب ہے۔ عملی زندگی میں بعض ایسے ناگزیر حالات پیش آ جاتے ہیں جہاں جھوٹ کا سہارا لینا ضروری ہو جاتا ہے اور اسلام نے اس کی رعایت بھی ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''احیاء علوم الدّین'' میں بڑی تفصیل کے ساتھ ان ناگزیر حالات کی نشاندہی کی ہے جہاں جھوٹ بولا جا سکتا ہے۔ میں اختصار کے ساتھ ان کے کلام کا مفہوم پیش کر رہا ہوں۔

''میں جانتا ہوں کہ جھوٹ بولنا فی نفسہٖ حرام نہیں ہے' بلکہ اس کی حرمت اس عظیم نقصان اور دھوکہ کی وجہ سے ہے جو جھوٹ میں پوشیدہ ہے۔ جھوٹ یا تو کسی کو نقصان پہنچانے کے لئے بولا جاتا ہے یا دھوکہ دینے کے لئے لہٰذا اس کے نتائج اچھے نہیں ہوتے یا کم از کم اس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کو اصل حقیقت سے غافل رکھا جائے۔

انسان کا ہر کلام کسی مقصد کے تحت ہوتا ہے۔ اس مقصد تک جھوٹ یا سچ دونوں میں سے کسی ذریعے سے پہنچا جا سکتا ہے۔ اگر انسان کا مقصد جائز ہے اور جھوٹ کے علاوہ کسی اور طریقے سے اس کا حصول ممکن نہیں تو ایسی صورت میں جھوٹ بولنا جائز ہوگا۔ اور اگر انسان کا مقصد نیک ہے اور اس کا حصول ضروری ہے اور جھوٹ کے علاوہ کسی اور طریقے سے اس کا حصول ممکن نہیں تو ایسی صورت میں جھوٹ بولنا واجب ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی کی جان لینا چاہتا ہو اور جان کے ڈر سے وہ شخص آپ کے گھر میں روپوش ہو جائے' تھوڑی دیر میں جان لینے والا شخص آپ کے گھر آ کر اس شخص کا پتہ پوچھے تو آپ کیا جواب دیں گے؟ کیا یہ کہیں گے کہ ہاں وہ شخص میرے گھر میں روپوش ہے' آؤ اور اسے مار ڈالو۔ اس کی جان بچانے کے لئے آپ جھوٹ بولیں گے۔ یقیناً

ایسی صورت میں جھوٹ بولنا واجب ہے۔

میری ان باتوں کی بنیاد وہ حدیث ہے جو بعض حالات میں جھوٹ بولنے کی اجازت دیتی ہے۔ حدیث ہے:

مَا سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يُرَخِّصُ فِيْ شَيْءٍ مِّنَ الْكِذْبِ اِلَّا فِيْ ثَلَاثٍ. اَلرَّجُلُ يَقُوْلُ الْقَوْلَ يُرِيْدُ بِهِ الْاِصْلَاحَ وَالرَّجُلَ يَقُوْلُ الْقَوْلَ فِي الْحَرْبِ، وَالرَّجُلُ يُحَدِّثُ اِمْرَأَتَهُ وَالْمَرْأَةُ تُحَدِّثُ زَوْجَهَا. (مسلم)

میں نے رسول اللہ ﷺ کو کسی جھوٹ کی رخصت دیتے نہیں سنا مگر تین موقعوں پر۔ کوئی شخص صلح صفائی کی خاطر جھوٹ بولے یا جنگ کے موقع پر جھوٹ بولے یا شوہر اپنی بیوی سے اور بیوی اپنے شوہر سے جھوٹ بولے (جھگڑا ختم کرنے کے لئے)

دوسری حدیث ہے:

وَلَيْسَ بِكَذَّابٍ مَنْ اَصْلَحَ بَيْنَ اِثْنَيْنِ فَقَالَ خَيْرًا اَوْنَمٰى خَيْرًا.

(بخاری، مسلم)

وہ شخص جھوٹا نہیں ہے جو دو بندوں کے درمیان صلح صفائی کرانا چاہتا ہو' چنانچہ وہ بھلی بات کہتا ہے یا بھلی بات کی چغلی کرتا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ آگے لکھتے ہیں کہ ان احادیث میں ان تین حالات کا ذکر ہے جہاں جھوٹ بولا جا سکتا ہے جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہے۔ ان ہی کے زمرہ میں ہر وہ حالت ہوگی جب جھوٹ بولنے سے کسی انجامِ نیک کی امید ہو اور سچ بولنے سے کسی مصیبت میں پڑنے کا امکان ہو۔ بہ شرطے کہ یہ نیک انجام شریعت کی نظر میں نیک ہو۔ چنانچہ مال و دولت کی حفاظت اور عزت و آبرو کی حفاظت کی غرض سے بھی جھوٹ کا سہارا لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اگر آپ کے پاس مال ہے اور کوئی شخص زبردستی اسے چھیننا چاہتا ہے'

تو آپ اس کی حفاظت کے لئے جھوٹ بول سکتے ہیں کہ آپ کے پاس مال نہیں ہے۔ اسی طرح اگر آپ سے کسی فحش کام کا ارتکاب ہوگیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے پوشیدہ رکھا' تو آپ پر بھی یہ لازم ہے کہ آپ اسے پوشیدہ رکھیں اور کسی کو اس کے بارے میں نہ بتائیں۔ اگر آپ سے کوئی اس کے بارے میں دریافت کرے تو آپ جھوٹ بول کر اس کا انکار بھی کر سکتے ہیں۔ (۳)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے اس بیان کے بعد میں آپ کے سوال کی طرف آتا ہوں۔ آپ نے اپنی سہیلی کے سامنے شرمندگی سے بچنے اور اس کی ناراضی ختم کرنے کے لئے جھوٹ کا سہارا لیا۔ دراصل آپ نے دو غلطیاں کیں۔ پہلی غلطی تو یہ تھی کہ آپ نے وعدہ خلافی کی۔ دوسری غلطی یہ تھی کہ آپ نے اپنی پہلی غلطی کا اثر کم کرنے کے لئے جھوٹ کا سہارا لیا۔ حالانکہ اگر آپ نے اپنی سہیلی کو حقیقت سے آگاہ کر دیا ہوتا کہ فلاں مجبوری کی وجہ سے آپ اس کے پاس نہ جا سکیں تو یہ زیادہ بہتر ہوتا۔ اس میں بہانہ بازی کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ واضح کرنے کے لئے آپ نرم سے نرم لہجہ اختیار کر سکتی تھیں تاکہ آپ کی سہیلی کی ناراضی دور ہو جائے۔ اس کے باوجود اگر آپ کو یقین ہو کہ بہانہ بازی نہ کرنے کی صورت میں آپ دونوں کے تعلقات ختم ہو سکتے ہیں تو ایسی صورت میں آپ بہ قدرِ ضرورت جھوٹ بول سکتی ہیں بہ شرطے کہ آپ اسے عادت نہ بنالیں۔

میں آپ کی اس بات سے متفق ہوں کہ آپ کا جھوٹ بولنا اس قدر بھیانک نہیں ہے جیسا کہ لوگ خرید و فروخت کے وقت جھوٹ بولتے ہیں اور دھوکہ دیتے ہیں یا کسی کا حق مارتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جھوٹ کے بھی کئی مراتب ہوتے ہیں۔ جھوٹ کا انجام جس قدر نقصان دہ اور ضرر رساں ہوگا' جھوٹ کا گناہ بھی اسی قدر زیادہ ہوگا۔ واللہ اعلم۔

اپریل فول

سوال: فون کی گھنٹی بجی۔ میرے دوست نے فون پر ایک نہایت افسوسناک خبر سنائی، میں اور میرے گھر والے یہ خبر سن کر کافی غمزدہ ہو گئے۔ چند منٹ کے بعد اسی

دوست کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ وہ تو اپریل فول منا رہا تھا اور یہ کہ وہ خبر جھوٹی ہے۔ کیا اس طرح اپریل فول منانا، جھوٹی خبریں دینا اور مذاق میں لوگوں کو تنگ کرنا شرعاً جائز ہے؟ جب کہ اس کا مقصد محض تھوڑی دیر کی تفریح ہو؟

جواب: جھوٹ بولنا ایک نہایت عظیم گناہ ہے۔ بلکہ اسلام کی نظر میں جھوٹ بولنا منافقت کی علامت ہے۔ اسلامی شریعت نے مجبوری کی بنا پر جن حالات میں جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے، مذاق اور تفریح کی خاطر جھوٹ بولنا ان میں شامل نہیں ہے۔ جیسا کہ میں سابقہ فتویٰ میں بتا چکا ہوں۔

اس کے برعکس نبی ﷺ نے متعدد احادیث میں مذاق، تفریح اور ہنسنے ہنسانے کی خاطر جھوٹ بولنے پر سخت سرزنش کی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

وَيْلٌ لِّلَّذِيْ يُحَدِّثُ بِالْحَدِيْثِ لِيُضْحِكَ بِهِ الْقَوْمَ فَيَكْذِبُ وَيْلٌ لَّهٗ وَيْلٌ لَّهٗ۔ (ابوداؤد، ترمذی، نسائی)

بربادی ہے اس کے لئے جو لوگوں سے بات کرتا ہے اور انہیں ہنسانے کے لئے جھوٹ بولتا ہے۔ بربادی ہے اس کے لئے۔ بربادی ہے اس کے لئے۔

دوسری حدیث ہے:

لَا يُؤْمِنُ الْعَبْدُ الْاِيْمَانَ كُلَّهٗ حَتّٰى يَتْرُكَ الْكِذْبَ فِي الْمَزَاحَةِ۔

(مسند احمد، طبرانی)

بندہ اس وقت تک مکمل مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ مذاق میں بھی جھوٹ بولنا نہ چھوڑ دے۔

حتیٰ کہ آپ ﷺ نے مذاق میں ڈرانے سے بھی منع فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ يُّرَوِّعَ مُسْلِمًا۔ (ابوداؤد)

کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ کسی مسلمان کو ڈرائے۔

بلکہ نبی ﷺ نے اس بات کو عظیم خیانت سے تعبیر کیا ہے کہ آپ کسی شخص سے جھوٹ بولیں اور وہ آپ کو سچ سمجھ رہا ہو۔ حدیث ہے:

كَبُرَتْ خِيَانَةً اَنْ تُحَدِّثَ اَخَاكَ حَدِيْثًا هُوَ بِهٖ مُصَدِّقٌ وَاَنْتَ لَهٗ بِهٖ كَاذِبٌ۔ (مسند احمد، طبرانی، ابوداؤد)

بڑی خیانت کی بات ہے کہ تم اپنے بھائی سے کوئی بات کہو۔ وہ تمہیں سچا سمجھ رہا ہو اور تم اس سے جھوٹ بول رہے ہو۔

ان سب احادیث سے واضح ہوا کہ اپریل فول کے موقع پر اس طرح مذاقاً جھوٹ بولنا حرام ہے' کیوں کہ:

۱- اپریل فول میں جھوٹ کا سہارا لیا جاتا ہے اور جھوٹ بولنا حرام ہے۔

۲- اپریل فول کے ذریعے سے خواہ مخواہ کسی کو ڈرایا جاتا ہے، دھوکہ میں ڈالا جاتا ہے اور اسے پریشان کیا جاتا ہے۔

۳- یہ بہت بڑی خیانت کی بات ہے کہ آپ کسی سے جھوٹ بولیں اور وہ آپ کو سچا سمجھ رہا ہو۔

۴- اس میں ایک ایسی روایت کی تقلید اور اتباع ہے جس کا تعلق نہ اسلام سے ہے اور نہ اسلامی سرزمین سے۔ یہ تو کفار و مشرکین کا اتباع ہے اور وہ بھی ایسی چیز میں جو اخلاقاً نہایت گری ہوئی چیز ہے۔

درآمد کی ہوئی مرغیوں اور گوشت کا حکم

سوال: ان ذبح کی ہوئی مرغیوں اور جانوروں کا کیا حکم ہے جنہیں غیر مسلم ممالک سے درآمد کیا جاتا ہے؟ کیا ان کا گوشت حلال ہے؟

جواب: وہ گوشت جو غیر مسلم ممالک سے درآمد کیا جاتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں:

۱- ایک وہ گوشت جو اہلِ کتاب کے یہاں سے آتا ہے۔

۲- دوسرا وہ گوشت جو کمیونسٹ اور ملحد ممالک سے آتا ہے۔

اہلِ کتاب کا ذبیحہ اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۠ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۡ

(المائدہ:۵)

اہلِ کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لئے۔

اس آیت سے واضح ہے کہ اہلِ کتاب کا ذبیحہ ہم مسلمانوں کے لئے قطعاً حلال ہے۔ بعض فقہاء نے اس کی حلت کے لئے یہ شرط عائد کر دی ہے کہ انہوں نے بسم اللہ پڑھ کر ذبح کیا ہو اور ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ انہوں نے کس طرح ذبح کیا ہے۔ دوسرے فقہاء یہ شرط عائد نہیں کرتے۔ ان کی دلیل یہ حدیث ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ کچھ لوگ ہمارے پاس گوشت لے کر آتے ہیں۔ ہمیں نہیں پتا کہ وہ بسم اللہ پڑھتے ہیں یا نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

''سَمُّوا اللّٰهَ عَلَيْهِ وَكُلُوْا (۴)''

یعنی تم بسم اللہ پڑھ لیا کرو اور کھا لیا کرو۔

اس حدیث کی بنیاد پر فقہاء کہتے ہیں کہ ہمیں یہ جاننے کی ضرورت نہیں ہے کہ انہوں نے بسم اللہ پڑھی ہے یا نہیں۔ اتنا جان لینا کافی ہے کہ یہ اہلِ کتاب کا ذبیحہ ہے۔ شرط یہ ہے کہ اسے کھاتے وقت ہم بسم اللہ پڑھ لیں۔

رہا وہ گوشت جو کمیونسٹ یا ملحد ممالک سے آتا ہے تو اس کے حرام ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذبیحہ حلال ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ذبح کرنے والا اللہ کی ذات پر یقین رکھتا ہو۔ وہ لوگ جو اللہ کی ذات پر یقین نہیں رکھتے مثلاً کمیونسٹ یا ملحد وغیرہ، انہیں اس بات کا حق حاصل ہی نہیں ہے کہ وہ کسی جانور کے گلے پر چھری چلائیں۔ کیوں کہ جان اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی ہے اور اللہ کی مرضی ہی سے جانور کی جان لی جا سکتی ہے۔ جو شخص اللہ کو مانتا ہی نہیں اس کے لئے اللہ کی مرضی کوئی معنی نہیں

رکھتی۔ اس لئے اسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی جاندار کے گلے پر چھری چلائے۔ اگر وہ چلاتا ہے تو شریعت کی رُو سے اس کا ذبیحہ حلال نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب کوئی مسلمان ذبح کرتا ہے تو ''بسم اللہ واللہ اکبر'' کہتا ہے یعنی وہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اس جانور کی جان وہ اللہ کی مرضی اور اجازت سے لے رہا ہے اور چونکہ وہ اللہ کی ذات پر یقین رکھتا ہے اس لئے اسے یہ اجازت حاصل ہے کہ وہ اس کی جان لے۔ یہی حال اہلِ کتاب کا ہے' کیوں کہ وہ بھی اللہ کی ذات پر یقین رکھتے ہیں۔ رہے کمیونسٹ یا ملحد لوگ تو یہ اللہ کی ذات پر یقین نہیں رکھتے اور اسی لئے ان کا ذبیحہ اللہ کی مرضی کے بغیر ہوتا ہے اور ہمارے لئے حلال نہیں ہے کہ ہم اسے کھائیں۔

اس لئے تاجروں کو چاہئے کہ وہ کمیونسٹ یا ملحد ممالک سے گوشت درآمد نہ کریں۔ یہ صحیح ہے کہ ان ممالک میں بعض مسلمان بھی ہوتے ہیں اور اہلِ کتاب بھی' لیکن چونکہ پوری حکومت اور پورے معاشرے کا ڈھانچہ اللہ کی ذات اور اس کے دین کے انکار پر قائم ہوتا ہے' اس لئے اس بات کا خیال کرتے ہوئے ان ممالک کے ذبیحے کو حلال قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہی میرا فتویٰ ہے اور اس پر میرا دل مطمئن ہے۔

سگریٹ نوشی حرام ہے

سوال: سگریٹ نوشی کا کیا حکم ہے؟ یہ حلال ہے یا حرام؟ آپ نے اپنی کتاب ''الحلال والحرام فی الاسلام'' میں اسے حرام قرار دیا ہے۔ جب کہ بعض علماء اسے جائز اور بعض اسے مکروہ قرار دیتے ہیں۔ عملاً ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سارے دیندار حضرات اور علماءِ کرام سگریٹ کا استعمال کرتے ہیں۔ مغربی ممالک میں تحقیق سے پتا چلا ہے کہ ہر سال لاکھوں افراد محض سگریٹ نوشی کی وجہ سے موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں' اور یہ کہ سگریٹ نوشی سے کینسر کا قوی امکان ہوتا ہے۔ ان سب باتوں کی روشنی میں سگریٹ نوشی کا قطعی حکم بتائیں۔

جواب: سگریٹ یا تمباکو دسویں صدی ہجری کے آخر میں دریافت ہوا۔ اس کے

بعد سے یہ مسلسل عام اور مقبول ہوتا چلا گیا۔ چونکہ حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں اس کا وجود نہیں تھا اس لئے علماءِ کرام اس کے حکم کے سلسلہ میں مختلف رائے رکھتے ہیں۔ بعض اسے حرام قرار دیتے ہیں، بعض کے نزدیک یہ مکروہ ہے اور بعض کے نزدیک مباح، اور بعض علماء اس سلسلہ میں خاموش ہیں اور کوئی رائے نہیں رکھتے (۵) ذیل میں ہم اختصار کے ساتھ تمام فریقوں کے دلائل پیش کرتے ہیں:

حرمت کے دلائل:

۱۔ اس میں نشہ کا پایا جانا۔ اگر چہ یہ نشہ بہت قلیل مقدار میں ہوتا ہے اور اس کا احساس اس شخص کو کم از کم ضرور ہوتا ہے جس نے ابھی سگریٹ پینے کی ابتدا کی ہو۔ اور یہ ایک شرعی قاعدہ ہے کہ جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ پیدا کرے اس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے۔ اس قاعدہ کی بنیاد پر سگریٹ بھی حرام ہے، کیوں کہ اس میں قلیل مقدار میں نشہ موجود ہوتا ہے۔ یا کم از کم اس میں ذہن کو مدہوش کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

۲۔ اس میں مالی اور جسمانی دونوں قسم کے نقصان کا پایا جانا۔ اس بات سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ سگریٹ انسانی صحت کے لئے کس قدر مہلک ہے۔ اس کے نقصان کا اندازہ ان رپورٹوں سے لگایا جاسکتا ہے جو وقتاً فوقتاً مغربی ممالک کے محققین نشر کرتے ہیں کہ سگریٹ نوشی کی وجہ سے کتنے لوگ کینسر کے مرض میں مبتلا ہوئے اور کتنے لوگ موت کے منہ میں چلے گئے۔ اسلامی شریعت کا یہ اصول ہے کہ ہر وہ چیز جس میں انسانی جسم و جان کے لئے نقصان کا عنصر نمایاں ہو وہ چیز حرام ہوتی ہے۔ شراب کو جب اللہ نے حرام کیا تو اس کی حرمت کی وجہ یہی بتائی کہ اس میں نقصان کا عنصر اس کے فائدے کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ اسی طرح اس میں مالی نقصان بھی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سگریٹ نوشی سراسر فضول خرچی ہے۔ سگریٹ پینے والا ہر دن نہ جانے کتنے روپے کے سگریٹ پھونک ڈالتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فضول خرچی سے منع فرمایا ہے۔ فضول خرچ کو شیطان کا بھائی قرار دیا ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ۝ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ ط

(بنی اسرائیل: ۲۷)

فضول خرچی نہ کرو۔ فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں۔

کراہت کے دلائل:

۱- سگریٹ نوشی جسم انسانی کے لئے مضر بھی ہے اور مہلک بھی۔

۲- اگر یہ فضول خرچی نہیں ہے تو کم از کم مال کی بربادی ضرور ہے۔ اس مال کو کسی اچھے کام میں خرچ کیا جاسکتا ہے۔

۳- اس کی بدبوان لوگوں کے لئے تکلیف دہ ہوتی ہے جو سگریٹ نہیں پیتے۔

۴- سگریٹ نوشی بہر حال شرافت اور اخلاق حمیدہ کے خلاف ہے۔

۵- سگریٹ نوشی عبادات کی بہتر ادائیگی میں مانع ہے۔

۶- سگریٹ کے عادی کو کچھ دنوں کے لئے سگریٹ نہ ملے تو وہ ہذیانی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

ایک حنفی عالمِ دین الشیخ ابو سہل محمد بن الواعظ فرماتے ہیں کہ ان سب دلیلوں کی بنیاد پر سگریٹ نوشی کو حرام قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر یہ حرام نہ بھی ہو تو اس کے مکروہ ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

جواز کے دلائل:

جن لوگوں نے اُسے جائز قرار دیا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ اسلامی شریعت کی رُو سے دنیا کی ہر شے کی اصل یہ ہے کہ وہ حلال ہے، سوائے ان چیزوں کے جن کی حرمت یا کراہت کی دلیل قرآن وسنّت میں موجود ہو۔ اس قاعدے کی رُو سے سگریٹ نوشی بھی جائز ہے، کیوں کہ اس کی حرمت کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور جہاں تک نشے کا سوال ہے تو یہ کہنا سراسر غلط ہوگا کہ سگریٹ میں نشہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ نشہ ایک ایسی کیفیت کا نام ہے

جس میں عقل کام کرنا چھوڑ دے۔ ظاہر ہے کہ سگریٹ نوشی سے ایسی کیفیت نہیں پیدا ہوتی۔ اسی طرح فضول خرچی کا دعویٰ کرنا بھی غلط ہے' کیوں کہ اس طرح مال خرچ کرنا صرف سگریٹ کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ انسان اپنی روزمرّہ کی زندگی میں بہت ساری ضرورتوں پر اسی طرح مال خرچ کرتا ہے۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ اگر سگریٹ نوشی کی وجہ سے کسی کو نقصان ہو رہا ہو تو اس کے لئے سگریٹ حرام ہے۔ لیکن اگر کسی کو اس سے نقصان نہیں ہوتا تو اس کے لئے جائز ہے۔ اگر اس سے کسی بیماری کا علاج مقصود ہو تو اس کا استعمال واجب ہے۔

علمائے کرام کی مختلف رایوں اور ان کی دلیلوں کو سننے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تمام علمائے کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہر وہ چیز جس میں جسمانی یا مالی نقصانات ہوں' وہ شرعاً ناجائز ہے۔ البتہ ان علماء کے درمیان اختلاف اس بات پر ہے کہ سگریٹ کے اندر جسمانی اور مالی نقصانات ہیں یا نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تحقیق وجستجو کے بعد اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ سگریٹ کے اندر جسمانی اور مالی نقصانات موجود ہیں تو تمام علماء اس پر متفق ہو جائیں گے کہ سگریٹ شرعاً جائز نہیں ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سگریٹ کے نقصانات کو ثابت کرنے کا مجاز کون ہے؟
اس میں کوئی شک نہیں کہ فقہاء اور علماء دین اس بات کے مجاز نہیں ہیں کہ وہ سگریٹ کے نقصانات کو ثابت کریں۔ یہ ان کا میدان نہیں ہے۔ ان نقصانات کو ثابت کرنا ڈاکٹروں اور سائنس دانوں کا کام ہے۔ اور یہ بات سبھی کو معلوم ہے کہ مختلف طبّی تحقیق کے نتیجہ میں تمام علماء طب اس بات پر متفق ہیں کہ سگریٹ نوشی صحت کے لئے تباہ کن ہے۔ خاص طور پر پھیپھڑوں کے لئے یہ انتہائی خطرناک ہے۔ سگریٹ نوشی کی وجہ سے پھیپھڑوں کا کینسر اس قدر عام ہو گیا ہے کہ ساری دنیا اس پر پابندی لگانے کے لئے آواز بلند کر رہی ہے۔
ان نقصانات کے علاوہ کچھ ایسے نقصانات ہیں جن کا اندازہ ہر خاص و عام لگا سکتا ہے۔ مثلاً منہ میں بدبو کا پیدا ہونا۔ اس کے دھوئیں سے آس پاس کے لوگوں کو تکلیف، کھانسی

کے مرض میں مبتلا ہونا وغیرہ وغیرہ۔ یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ وہ زہر جو فوری اثر کر جائے اور انسان کی جان لے لے اور وہ زہر جو رفتہ رفتہ اور بتدریج انسان کی جان لے، جسے ہم Slow Poision بھی کہتے ہیں، دونوں کا ایک ہی حکم ہے۔ دونوں شریعت کی نظر میں حرام ہیں۔ بے شبہ سگریٹ کا شمار اس زُمرے میں کیا جا سکتا ہے جو بتدریج انسان کی جان لیتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ سگریٹ کی ہلاکت خیزی سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ کوئی شخص جان بوجھ کر خود کو ہلاک کرے۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ○ (النساء:۲۹)

اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔ یقین کرو کہ اللہ تمہارے اوپر مہربان ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب 'الروضۃ' میں فرماتے ہیں کہ "ہر وہ چیز جس کا کھانا ضرر رساں ہو اس کا کھانا حرام ہے اور ہر وہ پاک چیز جس میں ضرر نہیں ہے اس کا کھانا جائز ہے۔"

سگریٹ میں اس جسمانی نقصان کے علاوہ مالی نقصان بھی ہے۔ ایک ایسی چیز میں مال خرچ کرنا جس میں نہ دین کا فائدہ ہے اور نہ دنیا کا اور جو جسم کے لئے مضر ہے۔ اسراف نہیں تو اور کیا ہے؟ اللہ فرماتا ہے:

وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ○ (الاعراف:۳۱)

اور فضول خرچی نہ کرو، بے شک اللہ فضول خرچوں کو پسند نہیں کرتا۔

سگریٹ میں جسمانی اور مالی نقصان کے علاوہ ایک اور نقصان بھی ہے اور وہ ہے نفسیاتی نقصان۔ یعنی سگریٹ پینے والا رفتہ رفتہ اس قدر سگریٹ کا عادی ہو جاتا ہے کہ وہ اس کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ اب وہ چھوڑنا بھی چاہے تو چھوڑ نہیں سکتا۔ اگر سگریٹ نہ ملے تو اس کی عقل کام کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ وہ پاگلوں کی سی حرکتیں کرتا ہے اور انتہائی نقاہت اور پژمردگی کا شکار ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ سگریٹ کو پانے

کے لئے ایک عادی شخص اپنی بیوی اور بال بچوں پر مال خرچ کرنے کے بجائے سگریٹ خرید کر پھونک دیتا ہے اور اس کے بچے بھوکے رہ جاتے ہیں یا ان کی لازمی ضروریات پوری نہیں ہو پاتی ہیں۔

ان سب نقصانات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے سگریٹ نوشی کو جائز قرار دینا کسی طور پر درست معلوم نہیں ہوتا۔ ان نقصانات کی بنا پر اسے حرام نہیں تو کم از کم مکروہ ضرور قرار دینا چاہئے۔ تاہم مذکورہ دلائل کی روشنی میں میری رائے یہ ہے کہ سگریٹ نوشی حرام ہے۔ کیوں کہ اس میں ایک دو نہیں، بلکہ تین تین نقصانات ہیں یعنی جسمانی، مالی اور نفسیاتی اور ان کے مقابلہ میں فائدہ کچھ بھی نہیں ہے۔

اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ اس میں یہ فائدہ ہے کہ اس کے پینے سے راحت ملتی ہے، ذہنی سکون ملتا ہے تو میں کہوں گا کہ یہ راحت اسے ملتی ہے جو اس کا عادی ہو گیا ہو۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص منشیات کا عادی ہو گیا ہو۔ منشیات کے استعمال سے اسے راحت نصیب ہو گی اور نہ ملنے کی صورت میں بے حد تکلیف ہو گی۔

سگریٹ نوشی پر اس فتویٰ کے ساتھ ساتھ میں چند مزید باتوں کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

۱۔ بعض حضرات سگریٹ کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ سگریٹ ترک کرنا ان کے بس سے باہر ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کو بشرطِ کوشش معذور سمجھا جائے گا۔ یہ اس کی نیّت پر منحصر ہے کہ وہ سگریٹ چھوڑنے کے لئے واقعی کس قدر کوشش کر رہا ہے اور سگریٹ چھوڑنے کے معاملہ میں کس قدر مخلص ہے۔

۲۔ سگریٹ کے حرام ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ شراب اور زنا جیسی حرام چیزوں کے برابر حرام ہے۔ اسلامی شریعت میں حرام چیزوں کے بھی کئی درجے ہیں۔

۳۔ وہ حرام چیز جس کی حرمت میں اختلاف ہو، اس حرام چیز کے برابر نہیں ہو سکتی جس کی حرمت پر اتفاق ہو۔ اس لئے سگریٹ پینے والے کو فاسق کہنا، اس کی گواہی کو

کالعدم قرار دینا یا اسے امامت کے حق سے محروم کرنا صحیح نہیں ہے۔

سائل کو اس بات پر حیرت ہے کہ بعض علمائے کرام بھی سگریٹ نوشی کے مرض میں مبتلا ہیں۔ میں ان سے کہوں گا کہ علمائے کرام گناہوں سے پاک مخلوق نہیں ہیں۔ غلطیاں ان سے بھی ہو سکتی ہیں۔ آپ نہیں دیکھتے کہ ڈاکٹر حضرات سگریٹ کے خلاف طبّی تقریریں کرتے ہیں اور پھر خود بھی سگریٹ پیتے ہیں۔ ایسا اس لئے ہے کہ وہ اس کے عادی ہو چکے ہیں اور اب وہ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔

سگریٹ پینا اگر مردوں کے حق میں ایک قابلِ مذمت فعل ہے تو عورتوں کے لئے کہیں زیادہ قابلِ مذمت ہے' کیوں کہ یہ نسوانی حسن اور وقار کے خلاف ہے۔

ہر سگریٹ پینے والے کو میری یہ نصیحت ہے کہ مضبوط ارادہ کے ساتھ یکبارگی سگریٹ پینا بند کر دیں۔ رفتہ رفتہ ترک کرنے کی کوشش اکثر بار آور ثابت نہیں ہوتی۔ جس کے پاس ارادہ کی مضبوطی نہ ہو اسے چاہئے کہ بہت قلیل مقدار میں سگریٹ نوشی کرے۔ دوسروں کے سامنے اس کی برائی بیان کرے۔ دوسروں کو اس کی ترغیب نہ دے۔ کسی کو سگریٹ پیش نہ کرے اور اللہ سے دعا کرتا رہے کہ وہ اسے اس آفت سے نجات دے دے۔

نوجوان نسل سے میری اپیل ہے کہ وہ اس آفت کی طرف رُخ بھی نہ کریں۔ اکثر بچے محض یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اب وہ بڑے ہو گئے ہیں' سگریٹ پینا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ زبردست غلطی ہے۔ نوجوانوں کا سگریٹ چھوڑنا قدرے آسان ہے' کیوں کہ ابھی وہ اس کے عادی نہیں ہوئے ہیں۔

حکومت سے میری اپیل ہے کہ وہ تمام وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے معاشرے کو اس مصیبت سے پاک کرنے کی کوشش کرے' چاہے اس کی راہ میں کتنی ہی دولت کیوں نہ خرچ کرنی پڑے۔ انسانی صحت بہر حال دولت سے زیادہ قیمتی شے ہے۔

چھینک کے آداب اور حکمت

سوال: مجھے اس بات پر یقینِ کامل ہے کہ اسلامی شریعت میں ہر قانون کسی حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ کبھی یہ حکمت بعض لوگوں پر واضح ہو جاتی ہے، جب کہ بعض دوسرے اس حکمت سے بے خبر ہوتے ہیں اور کبھی یہ حکمت سبھوں پر پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس کی پوشیدگی میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ اس کے باوجود میں اس بات میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ اگر کوئی حکمت ہم سے پوشیدہ ہے تو ہم اہلِ علم کی طرف رجوع کریں۔ اسی لئے آپ کی طرف رجوع کر رہا ہوں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ چھینکنے کے بعد الحمد لِلّٰہ کہنے میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟ سننے والا یرحمك اللّٰہ کیوں کہتا ہے؟ حالانکہ چھینک تو ایک ایسی فطری چیز ہے جو صحت مند اور بیمار ہر شخص کو آتی ہے۔ کیا الحمد لِلّٰہ اور یرحمك اللّٰہ کہنا ضروری اور فرض ہے؟ یا ان کا تعلق اجتماعی آداب سے ہے کہ انہیں ترک بھی کیا جا سکتا ہے؟

جواب: آپ کا یہ یقین لائقِ ستائش ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر قانون کسی نہ کسی حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ اسی لئے اللہ کے متعدد ناموں میں سے ایک نام حکیم ہے، یعنی حکمت والا۔ یہ نام قرآن مجید میں بے شمار جگہوں میں مذکور ہے۔ اللہ تعالیٰ حکیم ہے اس لئے اس نے اس کائنات میں جو چیز بھی بنائی ہے وہ حکمت سے خالی نہیں بنائی۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ اہلِ عقل جب کائنات پر نظر ڈالتے ہیں تو پکار اٹھتے ہیں کہ:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ (آل عمران:۱۹۱)

اے ہمارے رب! تو نے یہ سب کچھ یونہی بے کار نہیں پیدا کیا ہے۔

علامہ ابنِ قیم لکھتے ہیں کہ قرآن اور حدیث متعدد احکام و قوانین کی علت و حکمت کے ذکر سے بھرے پڑے ہیں۔ اگر سو دو سو جگہوں پر ان حکمتوں کا تذکرہ ہوتا تو ہم بیان کر دیتے۔ ان کا تذکرہ تو ہزار سے زائد جگہوں پر ہے۔ (۶)

آپ کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ بعض حکمتیں بعض لوگوں پر ظاہر ہو جاتی ہیں اور

بعض لوگوں پر پوشیدہ رہتی ہیں اور بعض حکمتیں تمام لوگوں پر پوشیدہ رہتی ہیں۔ اس پوشیدگی میں یہ مصلحت ہے کہ یہ خدا کی طرف سے آزمائش ہوتی ہے کہ کون حکمت جانے بغیر اللہ کے احکام پر عمل پیرا ہوتا ہے اور کون روگردانی کرتا ہے۔ اس پوشیدگی کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ بندے خود عقل سے کام لیں اور حکمت جاننے کی کوشش کریں۔

آپ کا یہ فعل بھی قابلِ تحسین ہے کہ اسلامی قوانین کی حکمت جاننے کے لئے آپ نے اہلِ علم کی طرف رجوع کیا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ کے اندر علم حاصل کرنے کی لگن ہے۔ اب میں آپ کے سوال کی طرف آتا ہوں۔

چھینک میں الحمد لِلّٰہ کہنے اور سننے والے کو یرحمك اللّٰہ کہنے کی حکمت بتانے سے پہلے میں چاہوں گا کہ چھینک کے اسلامی آداب بیان کردوں۔

۱- چھینکنے والے کو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ یا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہنا چاہئے جیسا کہ متعدّد احادیث میں آیا ہے۔

۲- چھینکتے وقت حتیٰ الامکان آواز پست کرنی چاہئے تاکہ آس پاس کے لوگوں کو تکلیف نہ ہو۔ البتہ الحمد لِلّٰہ قدرے زور سے کہنا چاہئے تاکہ سبھی سن سکیں اور جواب دیں۔

۳- چھینکتے وقت چہرے پر ہاتھ رکھ لینا چاہئے تاکہ آس پاس کے لوگوں کو تکلیف نہ ہو۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

كَانَ النَّبِيُّ ﷺ اِذَا عَطَسَ وَضَعَ يَدَهٗ عَلٰى فِيْهِ وَخَفِضَ صَوْتَهٗ.

(ابوداؤد، ترمذی)

نبی ﷺ جب چھینکتے تو اپنا ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیتے تھے اور اپنی آواز پست رکھتے تھے۔

۴- الحمد لِلّٰہ سننے والوں کو جواب میں یرحمك اللّٰہ کہنا چاہئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

اِذَا عَطَسَ اَحَدُكُمْ فَلْيَقُلْ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلْيَقُلْ مَنْ عِنْدَهٗ يَرْحَمُكَ اللّٰهُ وَهٰذَا مِنْ حَقِّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ۔ (مسند احمد)

جب تم میں سے کوئی چھینکے تو الحمد لِلّٰہ کہے‘ اس کے پاس جو شخص ہو‘ اسے یرحمك اللّٰہ کہنا چاہئے اور یہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے۔

الحمد لِلّٰہ کہنا اور اس کے جواب میں یرحمك اللّٰہ کہنا واجب ہے یا نہیں، اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ احناف اور حنابلہ کی رائے ہے کہ یہ فرضِ کفایہ ہے۔ مالکیہ اسے مستحب قرار دیتے ہیں۔ میری نظر میں راجح قول یہ ہے کہ یہ فرض عین ہے۔ جیسا کہ احادیث کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں۔ احادیث کے الفاظ کچھ اس طرح ہیں: ’’خَمْسٌ تَجِبُ لِلْمُسْلِمِ ‘‘یعنی پانچ چیزیں مسلمان کے لئے واجب ہیں۔ ان پانچ چیزوں میں ایک چیز چھینک پر الحمد لِلّٰہ کہنا اور جواب میں یرحمك اللّٰہ کہنا ہے۔ دوسری حدیث ہے ’’حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ سِتٌّ‘‘ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر چھ حق ہیں‘ ان میں سے ایک حق یہ ہے کہ الحمد لِلّٰہ کے جواب میں یرحمك اللّٰہ کہنا چاہئے۔ بعض احادیث میں واضح طور پر یہ ہے کہ ’’اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ‘‘ یعنی حضور ﷺ نے ہمیں اس بات کا حکم دیا ہے۔ احادیث کے یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ فرضِ عین ہے۔ البتہ مندرجہ ذیل حالتوں میں یہ فرضیت ختم ہو جاتی ہے:

الف۔ جو شخص الحمد لِلّٰہ نہ کہے، اسے جواب میں یرحمك اللّٰہ نہیں کہنا چاہئے‘ کیوں کہ حضور ﷺ نے ایسا ہی کیا ہے۔

ب۔ زکام زدہ شخص اگر مسلسل چھینکے تو اسے یرحمك اللّٰہ کہنے کے بجائے شفا کی دعا دینی چاہئے۔

ج۔ غیر مسلم اشخاص کی چھینک کے جواب میں یرحمك اللّٰہ نہیں کہنا چاہئے۔

د۔ جمعہ کے خطبے کے دوران الحمد لِلّٰہ اور جواب میں یرحمك اللّٰہ کہنا

درست نہیں، کیوں کہ خطبہ کے دوران کچھ بولنے سے منع کیا گیا ہے۔

یرحمك اللہ سننے کے بعد چھینکنے والے کو چاہئے کہ وہ بھی جواب میں ''یَھْدِیْکُمُ اللّٰہُ وَیُصْلِحُ بَالَکُمْ'' کہے۔ بخاری شریف کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے ایسا ہی کہنے کی ہدایت کی ہے۔

الحمد لِلہ و یرحمك اللہ کہنے کی حکمت

احکام بتانے کے بعد ان احکام کی حکمت و مصلحت بھی بتاتا چلوں:

۱- دینِ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے مختلف بہانوں سے بندے کے خدا سے تعلّق کو مستحکم اور مضبوط تر بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس تعلّق کے استحکام کے لئے جہاں اس نے نماز، روزہ اور دوسری عبادات کو فرض کیا ہے وہیں، اس نے روزمرّہ زندگی کی مختلف عادتوں اور ضرورتوں کو خدا کی یاد دلانے اور خدا سے تعلّق کو مستحکم کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ چنانچہ اسلام نے سونے سے پہلے اور سونے کے بعد، کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد، سواری پر چڑھتے وقت اور ان جیسی بے شمار مصروفیتوں اور ضرورتوں کے موقع پر ہمیں شرعی دعاؤں کی تعلیم دی ہے اور ان موقعوں پر ان دعاؤں کے ذریعہ سے خدا کو یاد کرنے کا انتظام کیا ہے، تاکہ بندے کے دل میں خدا کی یاد ہمہ وقت تازہ رہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی چھینک کے موقع پر الحمد لِلہ کہنا اور جواب میں یرحمك اللہ کہنا بھی ہے۔

چھینکنے والا الحمد لِلہ اس لئے کہتا ہے کہ چھینک انسان کے دماغ سے بعض کثافت اور بھاری پن کو دور کرتی ہے۔ اس کے نتیجے میں انسان کا دماغ ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے اور ذہن پہلے سے زیادہ متحرّک ہو جاتا ہے۔ اس کیفیت کے لئے بندے کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ سننے والا یرحمك اللہ اس لئے کہتا ہے کہ چھینکتے وقت چھینکنے والے کا انگ انگ چھینک کی وجہ سے بل کھا کر رہ جاتا ہے۔ اسی لئے اس کے لئے رحمت کی دعا کی جاتی ہے۔ ابن ابی جمرۃ اس موضوع پر لکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ خدا کا عظیم فضل و کرم

ہے کہ اس نے چھینک کے ذریعہ سے ایک تکلیف دور کی، اس پر الحمد لِلّٰہ کہنا واجب ہے' تاکہ تکلیف دور ہونے کے بعد بندے کو ثواب بھی ملے۔ پھر اس ثواب میں آس پاس کے لوگوں کو بھی شریک کیا' جب وہ یرحمك اللہ کہتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ ایک لمحہ میں ہوجاتا ہے۔ (۷)

۲- دینِ اسلام چاہتا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ اخوت ومحبت پروان چڑھے اور ہر اس عادت وخصلت کی اسلام نے نفی کی ہے جس میں انانیت، غرور اور حسد وغیرہ جیسے رذائلِ اخلاق پوشیدہ ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چھینک پر الحمد لِلّٰہ کہنا اور اس کے جواب میں یرحمك اللہ کہنا اس اخوت ومحبت کی عملی تربیت ہے اور ساتھ ہی ساتھ دونوں کے دلوں کو ایک دوسرے کے لئے غرور اور حسد سے پاک کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔

۳- اسلام نے چھینک کے آداب میں یا اس جیسے دوسرے موقعوں پر صرف وہ چیزیں فرض کی ہیں جو دورِ جاہلیت کے باطل عقیدوں کی نفی کرتی ہیں۔ ابنِ قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دورِ جاہلیت میں لوگ چھینک کو بدشگونی کی علامت سمجھتے تھے۔ جب اسلام آیا تو اس نے اس باطل عقیدے کی نفی کی اور بتایا کہ چھینک بدشگونی کی علامت ہرگز نہیں ہے۔ اس کے برعکس اسلام نے اس موقع پر اللہ کا شکر ادا کرنے اور رحمت وہدایت کی دعا کرنے کی تعلیم دی ہے۔

چھوت چھات کے ذریعے بیماری پھیلنے کا مسئلہ

سوال: کیا یہ صحیح ہے کہ اسلام چھوت چھات کے ذریعے بیماریوں کے پھیلنے پر یقین نہیں رکھتا۔ کیا نبی ﷺ نے ایسا فرمایا ہے کہ ''لَا عَدْوَیٰ'' یعنی چھوت چھات کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور یہ کہ تمام باتیں اللہ کے لکھے ہوئے فیصلہ اور تقدیر کے مطابق ہی ہوتی ہیں۔ اس لئے چھوت چھات سے نہیں ڈرنا چاہیے؟ اس طرح کی باتیں اگر عوام کے ذہن میں بیٹھ جائیں' تو انہیں یہ سمجھنا بہت مشکل ہوگا کہ متعدی امراض سے بچنے کی

کوشش کرنی چاہئے اور یہ کہ ایسے مواقع پر احتیاط لازم ہے۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں دینِ اسلام نے صحتِ عامہ پر کافی زور دیا ہے۔ بیماریوں سے قبل پرہیز اور احتیاط کی تاکید کی ہے اور بیماریوں کے بعد علاج کا حکم دیا ہے۔ مجھے اس بات پر بھی یقین ہے کہ اسلام نے متعدی امراض سے محتاط رہنے کی بھی تاکید کی ہے۔ امید ہے کہ اس مسئلے کا تسلی بخش جواب عنایت کریں گے۔

جواب: حقیقت یہ ہے کہ صحتِ عامہ، صفائی ستھرائی اور احتیاط سے متعلق اسلام کا جو موقف ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ دینِ اسلام میں صفائی ایک عبادت اور تقرب إلی اللہ کا درجہ رکھتی ہے۔ شریعت کی ساری کتابیں اپنی ابتدا طہارت کے باب ہی سے کرتی ہیں۔ کیوں کہ شریعت کی نظر میں عبادت سے قبل صفائی اور نظافت کا اختیار کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ یہ لازم ہے کہ نماز سے قبل وضو کیا جائے۔ وہ تمام اعضاء دھوئے جائیں جہاں گندگی، مٹی، دُھول اور پسینہ کا گمان ہوتا ہے۔ عبادت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ کپڑے اور بدن پاک صاف ہوں اور وہ جگہ بھی پاک صاف ہو جہاں عبادت کی جارہی ہو۔ صفائی اختیار کرنے والوں کے متعلق اللہ فرماتا ہے:

فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا ۚ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ ۝

(التوبہ: ۱۰۸)

اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں۔

دوسری جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ۝ (البقرۃ: ۲۲۲)

اللہ ان کو پسند کرتا ہے جو بدی سے باز رہیں اور پاکیزگی اختیار کریں۔

حدیثِ نبوی ﷺ ہے:

اَلطُّهُورُ شَطْرُ الْإِيمَانِ۔ (مسلم)

صفائی نصف ایمان ہے۔

ایک دوسری حدیث ہے:

اَلنَّظَافَةُ تَدْعُوْ اِلَى الْاِيْمَانِ وَالْاِيْمَانُ مَعَ صَاحِبِهٖ فِي الْجَنَّةِ. (طبرانی)

صفائی ایمان کی طرف بلاتی ہے اور ایمان مع اپنے مومن کے جنت میں جائے گا۔

ایک اور حدیث ہے:

تَنَظَّفُوْا فَاِنَّ الْاِسْلَامَ نَظِيْفٌ.

صفائی اختیار کرو کیوں کہ اسلام بھی صاف ستھرا ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نظافت کا بطورِ خاص اہتمام فرمایا اور اپنی اُمت کو بھی حکم دیا کہ ہفتہ میں کم از کم ایک دفعہ جمعہ کے دن غسل کرلیا کریں (بخاری، مسلم)۔ دانتوں کی صفائی کا اس قدر خیال تھا کہ ہمیشہ فرماتے تھے کہ اگر مجھے اس بات کا اندیشہ نہ ہوتا کہ میرا حکم اُمت کے لئے باعثِ مشقت بن جائے گا تو میں انہیں ہر نماز سے قبل مسواک کرنے کا حکم دیتا (بخاری)۔ بالوں کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ كَانَ لَهٗ شَعْرٌ فَلْيُكْرِمْهُ. (ابوداؤد)

جس کے پاس بال ہو اسے چاہئے کہ وہ اس کی عزت کرے۔

اسی طرح جسم کے فالتو بالوں اور ناخنوں کو کاٹنے کا حکم دیا۔ گھر کی صفائی کا خاص خیال رکھتے تھے اور لوگوں کو اس بات کا حکم بھی دیتے تھے۔ فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ طَيِّبٌ يُحِبُّ الطَّيِّبَ نَظِيْفٌ يُحِبُّ النَّظَافَةَ فَنَظِّفُوْا اَفْنِيَتَكُمْ. (مسلم)

بے شبہ اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ اچھا ہے اور اچھائی کو پسند کرتا ہے۔ صاف ستھرا ہے اور صفائی ستھرائی کو پسند کرتا ہے۔ تم لوگ اپنے گھروں کو صاف ستھرا رکھا کرو۔

اسی طرح راستوں اور سڑکوں کی صفائی کا حکم دیا ہے اور ان لوگوں کو وعید فرمائی جو سڑکوں پر غلاظت پھیلاتے پھرتے ہیں۔ اسی طرح ان لوگوں کو زبردست وعید فرمائی جو گندگیاں پھیلانے کا کام کرتے ہیں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ رکے ہوئے پانی میں یا حمام میں پیشاب کیا جائے' یا راستوں کے کنارے پر قضائے حاجت کیا جائے۔

اسی طرح حضور ﷺ نے جسم کو تندرست و توانا رکھنے کی خاطر ورزش، کھیل کود، گھوڑ سواری، تیراندازی اور تیراکی وغیرہ کی ترغیب دی ہے اور سستی و کاہلی سے حضور ﷺ نے پناہ مانگی ہے۔ اسی تندرستی و توانائی کی خاطر اسلام نے ہر قسم کی نشہ آور مشروبات اور منشیات کو حرام قرار دیا ہے اور اسی غرض سے اللہ نے ان لوگوں کی سخت سرزنش کی ہے جو اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ط (الاعراف:۳۲)

اے نبی ﷺ کہو! کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کر دیا ہے جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لئے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں؟

اسی تندرستی کی خاطر اللہ نے کھانے پینے کا حکم دیا ہے اور ساتھ ہی اس میں اسراف سے منع فرمایا ہے:

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ط (الاعراف:۳۱)

کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو۔

آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ مسلمان اپنی وسعت اور استطاعت سے زیادہ اپنے جسم کو کسی کام کا مکلّف کرے۔ آپ ﷺ نے ان صحابہ رضی اللہ عنہم کی سخت سرزنش کی جنہوں نے ارادہ کیا تھا کہ رات رات بھر عبادت کریں گے اور سوئیں گے

نہیں۔ یا سال کے تمام دنوں روزہ رکھیں گے۔ یا عورتوں سے مکمل کنارہ کشی اختیار کرلیں گے اور شادی نہیں کریں گے۔ آپ ﷺ نے ان صحابہ رضی اللہ عنہم کو ایسا کرنے سے منع فرمایا۔

اسلام انسانی جسم کا اس قدر خیال کرتا ہے کہ اس جسم کو اگر کوئی مرض یا آفت لاحق ہو جائے تو اسلامی شریعت حتیٰ الامکان اسے رخصت اور چھوٹ عطا کرتی ہے۔ چنانچہ کوئی شخص وضو نہیں کرسکتا تو تیمم کرلے۔ کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتا تو بیٹھ کر یا لیٹ کر پڑھ لے۔

اسلام نے جس طرح جسمانی صحت کا خیال رکھا ہے اسی طرح مرض کے وقت علاج کا بھی حکم دیا ہے۔ چاہے یہ علاج دواؤں کے ذریعہ سے ہو یا پھر پرہیز اور احتیاطی تدابیر کے ذریعہ سے۔ طبِ نبوی ﷺ سے متعلق احادیث کو مجموعہ کی شکل دے کر شائع کیا جاچکا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں علاج ومعالجہ کے لئے متعدد خرافاتی اور توہماتی طریقے اختیار کئے جاتے تھے جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ حضور ﷺ نے ان خرافات اور توہمات پر کاری ضرب لگائی اور علاج ومعالجہ کے لئے ان طریقوں کو اختیار کرنے کی تلقین کی جو علاج کے مروّجہ طریقے ہیں اور علم پر مبنی ہیں۔ ذیل میں طب نبوی کے چند اصول بیان کرتا ہوں۔

۱۔ حضور ﷺ نے لوگوں کو انسانی جسم کی قدر و قیمت سے روشناس کرایا۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

ان لبدنك عليك حقا۔

تم پر تمہارے بدن کا بھی حق ہے۔

وہ حق یہ ہے کہ بھوک کے وقت کھانا کھایا جائے۔ تھکاوٹ کے وقت اسے آرام دیا جائے۔ گندگی کی صورت میں اسے پاک وصاف کیا جائے۔ بیمار ہونے کی صورت میں اس کا علاج کرایا جائے وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ حق ہے کہ اسلام اس میں سستی وکاہلی کی

اجازت نہیں دیتا۔

۲۔ حضور ﷺ کی تعلیمات کی رُو سے یہ بات غلط ہے کہ بیماریوں کو تقدیر سمجھ کر آدمی بیٹھ رہے اور ان کا علاج نہ کرائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس طرح بیماری ایک تقدیر ہے اسی طرح اس کا علاج کرانا بھی تقدیر ہے۔ ایک بدّو نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ ''یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اَنَتَدَاوٰی ''یعنی اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا ہم علاج کرایا کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نَعَمْ، فَاِنَّ اللّٰہَ لَمْ یَضَعْ دَاءً اِلَّا وَضَعَ لَہٗ شِفَاءً'' یعنی ہاں! کیوں کہ اللہ نے ہر بیماری کا لازماً علاج بھی پیدا کیا ہے۔ یہ روایت مُسند احمد کی ہے۔

مُسند احمد اور ترمذی کی ایک اور روایت ہے کہ ابوخزامہ رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے علاج ومعالجہ کے متعلق دریافت کیا کہ کیا علاج اللہ کی تقدیر کو بدل سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ھِیَ مِنْ قَدَرِ اللّٰہِ'' یعنی یہ علاج بھی تو اللہ کی تقدیر میں سے ہے۔ یہی اسلام کا نظریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سبب اور مسبّب دونوں چیزیں تقدیر میں لکھ دی ہیں۔ اس لئے بیماریوں کو تقدیر سمجھ کر بیٹھ رہنا اور علاج نہ کرانا اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔

تاریخ میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ملکِ شام جارہے تھے۔ راستہ میں معلوم ہوا کہ وہاں طاعون پھیلا ہوا ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کرنے کے بعد وہاں جانے کا پروگرام ملتوی کردیا۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اعتراض کیا کہ امیر المؤمنین! آپ اللہ کی تقدیر سے بھاگ رہے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ہاں ہم اللہ کی ایک تقدیر سے دوسری تقدیر کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ یعنی اگر طاعون کا پھیلنا اللہ کی تقدیر ہے تو اس سے بھاگنا اور احتیاطی تدابیر اختیار کرنا بھی اللہ کی تقدیر میں سے ہے۔

۳۔ حضور ﷺ نے چھوت چھات کے ذریعہ سے پھیلنے والے امراض یعنی متعدّی امراض کا اعتراف کیا ہے اور ان سے احتیاط اور پرہیز کی تاکید کی ہے۔ اس سلسلے

میں متعدّد احادیث وارد ہیں۔

مسلم شریف کی روایت ہے کہ کوڑھی شخص آپ ﷺ کے پاس بیعت کی خاطر آیا۔ آپ ﷺ نے دور ہی سے اس سے کہا کہ میں نے تم سے بیعت کر لی ہے۔ تم واپس جا سکتے ہو۔ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے (۸) کہ کوڑھیوں کی طرف زیادہ دیر تک مت دیکھا کرو اوران سے اس طرح بات کیا کرو کہ تمہارے اوران کے درمیان ایک یا دو نیزے کا فاصلہ رہے۔ طاعون کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب کسی جگہ طاعون پھیل جائے تو وہاں ہرگز نہ جاؤ اور اگر تم اس جگہ ہو جہاں طاعون پھیل گیا ہے تو وہاں سے نہ نکلو۔ کیوں کہ اس طرح نکل بھاگنے سے دوسری جگہوں پر طاعون کے پھیلنے کا امکان قوی ہوتا ہے۔

صرف انسانوں میں ہی نہیں، بلکہ جانوروں میں بھی چھوت چھات سے بیماریاں پھیلتی ہیں۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

لَا یُوْرَدَنَّ مُمَرِّضٌ عَلٰی مُصِحٍّ۔ (بخاری)

یعنی مریض اونٹوں کو صحت مند اونٹوں کے ساتھ نہ باندھو۔

اب رہی وہ حدیث جس کے بارے میں آپ ﷺ نے دریافت کیا ہے یعنی ''لَا عَدْوٰی'' تو اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ یہ بخاری کی صحیح حدیث ہے۔ تاہم اس حدیث کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ حضور ﷺ نے متعدّی امراض کی نفی کی ہے، بلکہ حضور ﷺ کی اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ متعدّی مرض اپنی طبیعت اور مرضی سے نہیں پھیلتا بلکہ یہ وصف اللہ نے اس کے اندر رکھ دی ہے اور وہ اللہ کی لکھی ہوئی تقدیر کے مطابق پھیلتا ہے۔

۴- ان تمام خرافاتی اور توہّماتی طریقہ ہائے علاج کو حضور ﷺ نے باطل قرار دیا جو زمانہ جاہلیت میں عام تھے اور جن کی بنیاد علم اور تجربہ پر نہیں تھی، بلکہ بسا اوقات ان کی بنیاد شرک پر تھی۔ چنانچہ حضور ﷺ نے گنڈے، تعویذ اور ٹوٹکوں وغیرہ کو حرام قرار دیا اور علاج کے ان طریقوں کو اپنانے کی ہدایت کی جن کی بنیاد علم اور تجربہ پر ہوتی ہے اور جو

علاج کے مروّجہ اور حقیقی طریقے ہوتے ہیں۔

البتہ پھونک کے ذریعے سے علاج کرانا جائز ہے۔ بہ شرطے کہ پھونک قرآنی آیات کی ہو یا اللہ سے دعا کی ہو اور حقیقت یہ ہے کہ پھونک فی نفسہٖ کوئی طریقہ علاج نہیں ہے بلکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ سے دعا ہے کہ اللہ مریض کو شفا عطا کرے۔

۵- حضور ﷺ نے مریض کو مایوس ہونے سے منع فرمایا ہے چاہے مرض کتنا ہی مہلک اور طویل کیوں نہ ہو۔ مریض کو ہمیشہ پُرامید ہونا چاہئے کہ ایک نہ ایک دن وہ صحت یاب ہو جائے گا۔ حدیث شریف ہے:

لِكُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ فَإِذَا أَصَابَ دَوَاءُ الدَّاءَ بَرِئَ بِإِذْنِ اللّٰهِ۔ (مسند احمد)

ہر مرض کی دوا ہوتی ہے۔ جب کسی مرض میں صحیح دوامل جاتی ہے تو مریض اللہ کی مرضی سے اچھا ہو جاتا ہے۔

کوئی ایسا مرض نہیں جس کی دوا اللہ نے نہیں بنائی۔ جیسا کہ بخاری شریف کی ایک دوسری حدیث میں ہے۔ جب بھی مریض کو صحیح دوا ملتی ہے وہ اللہ کی مرضی سے صحت یاب ہو جاتا ہے۔ اس لئے اسے ہمیشہ پُرامید رہنا چاہئے۔

۶- اسلام نے جسمانی صحت کے ساتھ ساتھ نفسیاتی صحت پر بھی پورا زور دیا ہے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ نفسیات کا انسانی جسم پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ اگر انسان نفسیاتی طور پر صحت مند اور قوی ہو تو بہت ساری بیماریاں خود ہی بھاگ کھڑی ہوتی ہیں۔ جب کہ نفسیاتی مریض جسمانی طور پر بھی مریض ہوتا ہے۔ حضور ﷺ نے اسی نفسیاتی قوت کی طرف اس وقت اشارہ کیا جب مسجدِ نبوی ﷺ کی تعمیر ہو رہی تھی۔ سارے صحابہ رضی اللہ عنہم ایک ایک پتھر اٹھا رہے تھے لیکن حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ دو دو پتھر اٹھا رہے تھے۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ عَمَّارًا مُلِئَ إِيمَانًا مِّنْ قَرْنِهِ إِلَى قَدَمِهِ۔

بے شبہ عمار سر سے پیر تک ایمانی قوت سے بھرے ہوئے ہیں۔

یہ ایمانی اور روحانی یا نفسیاتی قوت تھی کہ جس کی وجہ سے عمار کی جسمانی قوت عروج پر تھی۔

یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے ان تمام عادتوں سے منع کیا ہے جو نفسیاتی طور پر انسان کو نقصان پہنچاتی ہیں مثلاً حسد، کینہ، غرور اور تکبّر وغیرہ۔اس کے برعکس مسلمانوں کو اس بات کی تاکید کی ہے کہ ان کا دل اللہ کے بندوں کے لئے محبت اور خلوص سے لبریز رہے۔اس میں کوئی شک نہیں حسد اور کینہ ایسی خصلتیں ہیں جو انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہیں جب کہ محبّت اور خلوص کی فضا انسانی جسم کے لئے اکسیر سے کم نہیں۔

یہ ہیں وہ قواعد اور اصول جن کی تعلیم نبی کریم ﷺ نے دی ہے اور بے شبہ ان اصولوں پر ایک ایسا صحت مند معاشرہ قائم ہو سکتا ہے جس سے باطل قوتیں ہمیشہ لرزہ بر اندام رہیں۔

نغمہ یا گانا سننا

سوال: علماءِ کرام کی ایک جماعت ہر قسم کا گانا سننے کو حرام قرار دیتی ہے خواہ وہ کیسا ہی گانا ہو۔ان کی دلیل ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ يَتَّخِذَهَا هُزُوًا (لقمان:۶)

اور کچھ لوگ ہیں جو لغو اور بے کار باتوں کو خریدتے ہیں تاکہ اللہ کی راہ سے لوگوں کو گمراہ کریں بغیر کسی علم کے اور اللہ کی راہ کو مذاق کی چیز بنالیں۔

اس آیت میں ان کی دلیل یہ ہے کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے لَهْوَ الْحَدِيْثِ سے مراد گانا بتایا ہے۔ان کی دلیل یہ آیت ہے:

وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ (القصص:۵۵)

اور جب لغو باتوں کو سنتے ہیں تو اس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔

گانا سننا اور بلاشبہ گانا بجانا لغو میں شامل ہے، کے سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

امید ہے کہ آپ تشفی بخش جواب عنایت کریں گے۔

جواب: گانا چاہے موسیقی کے ساتھ ہو یا بغیر موسیقی کے قرون اولیٰ سے فقہائے اسلام کے درمیان موضوع بحث رہا ہے۔ اس سلسلے میں بعض باتوں پر تمام فقہاء کا اتفاق پایا جاتا ہے جب کہ بعض نکتوں میں ان کے درمیان اختلاف ہے۔ جس بات پر تمام اہلِ علم وفقہ متفق ہیں وہ یہ ہے کہ ہر وہ گانا یا نغمہ جو فحش، فسق وفجور اور گناہ کی باتوں پر مشتمل ہو اس کا سننا حرام ہے۔ کیونکہ گانا چند الفاظ کے مجموعے کا نام ہے۔ اگر یہ الفاظ فحش اور بُرے ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کا سننا بھی فحش اور بُرا کام شمار کیا جائے گا۔ اگر ان الفاظ کو مرتّب کر کے شعر کی صورت دے دی جائے اور ان میں موسیقی شامل کر لی جائے تو ان کی تاثیر دوبالا ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی حرمت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

اسی طرح ان کے درمیان اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ شادی بیاہ یا عید اور خوشی کے موقعوں پر ایسے گانے جائز ہیں جو گندے، فحش اور نازیبا باتوں سے خالی ہوں۔ متعدّد احادیث سے اس قسم کے گانوں کے جواز کی دلیل دی جاسکتی ہے۔

اب میں اس موضوع سے متعلق جن باتوں میں علماءِ کرام کے درمیان اختلاف ہے ان کا تذکرہ کرتا ہوں۔ بعض علماء کے نزدیک ہر گانا چاہے موسیقی کے ساتھ ہو یا بغیر موسیقی کے جائز ہے، بلکہ وہ اسے مستحب قرار دیتے ہیں۔ بعض علماء کے نزدیک صرف وہی گانا جائز ہے جو بغیر موسیقی کے ہو اور بعض علماء کے نزدیک ہر قسم کا گانا حرام ہے چاہے موسیقی کے ساتھ ہو یا بغیر موسیقی کے۔

میری اپنی رائے یہ ہے کہ گانا یا نغمہ بذاتِ خود حلال ہے۔ کیونکہ ہر چیز کی اصلیت یہ ہے کہ وہ حلال ہے۔ اِلّا یہ کہ اس کی حرمت کے سلسلہ میں کوئی واضح دلیل ہو۔ گانے کی حرمت کے سلسلہ میں جتنی بھی دلیلیں دی جاتی ہیں یا تو وہ صحیح ہیں لیکن واضح اور قطعی دلیل نہیں ہیں یا پھر واضح ہیں لیکن صحیح نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر گانوں کی حرمت کے لئے آپ نے اپنے سوال میں جن دو آیتوں کا تذکرہ کیا ہے وہ گانوں کی حرمت کے سلسلہ

میں واضح دلیل نہیں ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے لهو الحدیث سے مراد گانا بتایا ہے' لیکن یہ ان کی اپنی رائے ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں فرمایا ہے۔ اسی طرح اس آیت میں لغو سے مراد گانا بجانا نہیں ہو سکتا کیونکہ اس آیت میں لغو سے مراد گالم گلوچ، طعن و تشنیع اور احمقانہ باتیں ہیں۔ آپ پوری آیت کو سیاق وسباق کے حوالہ سے پڑھیں تو یہی مفہوم آپ بھی اخذ کریں گے۔ اسی مفہوم کی ایک دوسری آیت ہے:

وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ○ (الفرقان:۶۳)

اور جب جاہل ان کے منہ آتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام۔

اگر مذکورہ آیت میں لغو سے مراد گانا لیا جائے تو آیت یوں نہ ہوتی کہ اسے سننے کے بعد وہ اس سے دامن بچاتے ہیں' بلکہ آیت یوں ہوتی کہ اس کے سننے سے دامن بچاتے ہیں۔ حالانکہ آیت میں ایسی کوئی بات نہیں کہ اللہ کے نیک بندے اسے سننے سے پرہیز کرتے ہوں یا دامن بچاتے ہوں۔

اگر لغو سے مراد وہ باتیں لی جائیں جن میں کوئی فائدہ نہ ہو اور یہ کہا جائے کہ گانا بھی بے فائدہ چیز ہے اس لئے اس آیت کی رُو سے اس سے پرہیز کرنا چاہئے تو اس اعتراض کے جواب میں' میں ابنِ جریج کا کلام نقل کروں گا۔ کسی نے ان سے دریافت کیا کہ گانا سننا آپ کی نیکیوں کے باب میں شمار کیا جائے گا یا برائیوں کے کھاتے میں لکھا جائے گا؟ ابنِ جریج نے جواب دیا کہ اس کا شمار نہ نیکیوں میں ہوگا اور نہ برائیوں میں' بلکہ یہ تو ان لغو چیزوں میں سے ہے جن پر اللہ گرفت نہیں کرتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ (المائدہ:۸۹)

تم لوگ جو مہمل اور لغو قسم کی قسمیں کھا لیتے ہو' ان پر اللہ گرفت نہیں کرتا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ بندے کا اس بات پر مؤاخذہ نہیں کرے گا کہ اس نے یوں ہی اللہ کا نام لے کر قسم کھائی تو شعر و نغمہ پر کیوں کر گرفت کرے گا۔

اس پر مستزاد یہ کہ ہر گانا یا نغمہ لغو باتوں پر مشتمل نہیں ہوتا۔ بعضے نغمے اچھے اور مفید

باتوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ بعض نغمے ایسے ہوتے ہیں جو نیک مقصد کے تحت گائے اور سنے جاتے ہیں۔ یہاں پر میں علامہ ابنِ حزم کا ایک قول نقل کروں گا جو ان کی کتاب "المحلّٰی" میں موجود ہے۔ انہوں نے گانے کو حرام قرار دینے والوں پر رد کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ لوگ سوال کرتے ہیں کہ گانا سننا حق میں شمار ہوگا یا باطل میں؟ حق اور باطل کے علاوہ کوئی تیسری چیز نہیں ہوسکتی۔ ان کے لئے میرا جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہر عمل کا دارومدار نیّت پر ہوتا ہے۔ چنانچہ جو شخص اللہ کی نافرمانی کی نیّت سے گانا سنے گا وہ گنہگار ہے اور جو شخص اس نیّت سے گانا سنتا ہے کہ اس سے بدن میں چستی اور پھرتی آئے گی اور یہ چستی اللہ کی عبادت میں معاون ثابت ہوگی تو یہ ایک نیک ارادہ ہے اور اس کا گانا سننا بھی نیک عمل میں شمار ہوگا۔ بہ شرطے کہ وہ گانا بذاتِ خود بری اور فحش باتوں پر مشتمل نہ ہو۔

رہیں وہ حدیثیں جنہیں علماءِ کرام گانوں کی حرمت کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں تو یہ ساری حدیثیں ضعیف ہیں۔ قاضی ابوبکر ابنِ عزل کہتے ہیں کہ نغموں اور گانوں کی حرمت کے سلسلہ میں کوئی صحیح حدیث موجود نہیں ہے۔ ابنِ حزم کہتے ہیں کہ گانوں کی حرمت کے سلسلہ میں جو احادیث پیش کی جاتی ہیں وہ سب موضوع یعنی گھڑی ہوئی احادیث ہیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی بات کہی ہے۔

جب یہ ثابت ہوگیا کہ اس کی حرمت کے سلسلہ میں کوئی صحیح حدیث موجود نہیں ہے تو اس کے جائز اور حلال ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کیونکہ ہر چیز کی اصل یہ ہے کہ وہ جائز ہوتی ہے۔ اس پر مزید یہ کہ اس کے جائز ہونے کے سلسلے میں متعدّد صحیح احادیث موجود ہیں۔ میں یہاں پر اس صحیح حدیث کا تذکرہ کافی سمجھتا ہوں جو بخاری اور مسلم دونوں میں موجود ہے۔ حدیث یہ ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں حضور ﷺ کے پاس تشریف لائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس دو لڑکیاں بیٹھی گانا گا رہی تھیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان لڑکیوں کی سرزنش کی اور کہا: "امزمور الشیطان

فی بیت رسول اللہ ؟" کیا شیطان کی بانسری اللہ کے رسول ﷺ کے گھر بجائی جا رہی ہے؟ اس پر حضور ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

دَعْهُمَا يَا اَبَا بَكْرٍ فَاِنَّهَا اَيَّامُ عِيْدٍ

چھوڑ دو انہیں اے ابوبکر (یعنی انہیں گانے دو) کیونکہ یہ خوشی کے دن ہیں

اور کوئی ایسی حدیث نہیں ہے جس میں آپ ﷺ نے خوشی کے علاوہ دنوں میں گانے سے منع فرمایا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خوشی کے دن ہوں یا نہ ہوں گانا گانا اپنی اصلیت یعنی جواز پر برقرار رہے گا۔

اس فتویٰ کے آخر میں' میں یہ بتانا چاہوں گا کہ اس جواز کے ساتھ چند شرطیں بھی ہیں جن کی رعایت ضروری ہے:

۱- یہ ضروری ہے کہ گانے میں کوئی ایسی بات نہ ہو جو اسلامی تعلیمات کے خلاف ہو۔ مثلاً شراب وشباب کا تذکرہ نہ ہو' یا اللہ کی شان میں گستاخی نہ ہو' یا عورتوں کی بے حیائی کا تذکرہ دل فریب انداز میں نہ ہو' کہ یہ ساری باتیں اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں۔

۲- بسا اوقات گانے کے بول تو اچھے ہوتے ہیں اور ان میں کوئی قابلِ مؤاخذہ بات نہیں ہوتی ہے' لیکن گانے کا انداز ہیجان انگیز اور اسلامی آداب کے خلاف ہوتا ہے۔ مثلاً ہاتھوں یا کمر کو دل فریب انداز میں حرکت دینا' یا ہو'ہا وغیرہ جیسی آوازیں نکالنا۔ اس لئے ضروری ہے کہ گانے کا انداز اسلامی آداب کے خلاف نہ ہو۔

۳- اسلام نے ہر بات میں اسراف کو ناپسند کیا ہے حتیٰ کہ عبادت میں بھی اسراف پسندیدہ نہیں ہے۔ چنانچہ گانے بجانے میں اسراف اور غلو بدرجۂ اولیٰ ناپسندیدہ فعل ہے۔ اگر گانے بجانے میں انہماک کچھ زیادہ ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ فرائض کی ادائی میں کوتاہی ہو رہی ہے اور زیادہ وقت غیر مفید کام میں صرف ہو رہا ہے۔ عبداللہ ابن المقفع کا ایک مشہور قول ہے:

ما رأيت اسرافا الا وبجانبه حق مضيع۔

میں نے جو بھی اسراف اور غلوّ دیکھا اس کے ساتھ ساتھ ایک ایسا حق بھی دیکھا جو ضائع کر دیا گیا۔

۴- ان سب توضیحات کے بعد ہر شخص خود اس بات کا فیصلہ کر سکتا ہے کہ گانا اگر فحش ہے اور ہیجان انگیزی پیدا کرتا ہے تو اس سے اسے پرہیز کرنا چاہئے' اور ایسے دروازہ کو بند کر دینا چاہئے جہاں سے گمراہی اور فتنے کی ہوائیں اس کے دل و دماغ کو متاثر کر رہی ہوں۔

اس دور میں جو گانے خاص و عام کی زبانوں پر رہتے ہیں' ان میں شاذ و نادر ہی ایسے گانے ہوں گے جو مذکورہ بالا شرطوں پر پورے اترتے ہوں۔ یہ گانے ان لوگوں کی طرف سے آتے ہیں، جو ہر زاویہ سے اسلامی زندگی سے دور ہیں۔ اس لئے بہتر یہی ہوگا کہ گانوں سے پرہیز کیا جائے۔ مبادا نادانستہ طور پر کسی ناجائز بات کا ارتکاب نہ ہو جائے۔

البتہ جو شخص اس بنیاد پر گانا سننے کا خواہش مند ہے کہ یہ شرعاً جائز ہے تو اسے چاہئے کہ وہ ان گانوں کا انتخاب کرے جن میں گناہ کی آمیزش نہ ہو۔ اگر یہ احتیاط محض گانا سننے میں لازمی ہے تو گانے کو پیشہ بنانے میں حد درجہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ بلکہ یہ پیشہ کسی صحت مند اسلامی معاشرے کے لئے کس قدر خطرناک ہے' اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اور کسی عورت کا یہ پیشہ اختیار کرنا تو کسی طور پر جائز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس پیشہ کی بنیاد پر اس کی عزت، شرافت اور شرم و حیا سب کچھ داؤ پر لگ جاتا ہے اور اجنبیوں سے اختلاط الگ حصے میں آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلامی شریعت کبھی اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی۔

ٹی وی دیکھنا

سوال: میں اٹھارہ سال کا نوجوان ہوں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بھائی بھی ہیں۔

وہ ہر روز پڑوسیوں کے گھر جا کر ٹی وی دیکھتے ہیں۔ میں نے اپنے والد سے فرمائش کی کہ وہ بھی ایک ٹی وی سیٹ خرید کر گھر لے آئیں تا کہ بچے اپنے گھر میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھ سکیں۔ میرے والد نے جواب دیا کہ ٹی وی دیکھنا حرام ہے اور حرام شے کو وہ اپنے گھر نہیں لا سکتے۔ کیا واقعی یہ حرام ہے؟ تسلی بخش جواب مطلوب ہے۔

جواب: میں اس سے قبل بھی مختلف موقعوں پر اس سوال کا جواب دے چکا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹیلی ویژن دیگر ذرائع ابلاغ مثلاً ریڈیو اور اخبارات کی طرح کچھ مقاصد کی تکمیل کے لئے بطورِ وسائل استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ بہ ذاتِ خود نہ بھلا ہے نہ برا۔ نہ حلال ہے نہ حرام۔ اس کے حلال یا حرام ہونے کا انحصار ان مقاصد پر ہے جن کی تکمیل کے لئے ٹی وی استعمال کیا جاتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر ٹی وی کی حلت و حرمت ان پروگراموں پر منحصر ہے جو اس پر نشر کئے جاتے ہیں۔ اگر پروگرام اچھی اور مفید باتوں پر مشتمل ہے اور مقصد بھی نیک ہے تو ٹی وی دیکھنا بے شبہ حلال ہے، بہ صورتِ دیگر حرام ہے۔ اس کی مثال تلوار کی ہے۔ تلوار جہاد جیسی عظیم نیکی کے لئے بھی استعمال کی جا سکتی ہے اور ڈکیتی اور قتل و خوں ریزی جیسی بھیانک برائیوں کے لئے بھی۔ تلوار بذاتِ خود نہ حرام ہے اور نہ حلال۔ اس کی حلت و حرمت کا انحصار اس مقصد پر ہے جس مقصد کے لئے اس کا استعمال کیا جائے۔

معاشرے کی تعمیر و ترقی اور لوگوں کی اخلاقی و فکری تربیت کے لئے ٹی وی کو ایک زبردست اور مؤثر وسیلے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اور اسی ٹی وی کو معاشرے کی اخلاقی و فکری تباہی کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ہر مسلمان کا ضمیر خود اس بات کا فیصلہ کر سکتا ہے کہ کون سے پروگرام اسے دیکھنے چاہئیں اور کون سے نہیں۔ مثلاً خبریں، تعلیمی پروگرام، ثقافتی پروگرام یا جائز قسم کے تفریحی پروگرام دیکھے جا سکتے ہیں یا بچے کارٹونی فلمیں دیکھ سکتے ہیں۔ رہے وہ پروگرام جو فحش ہیں، اخلاق کے لئے تباہ کن ہیں یا ان میں کوئی ایسی بات ہو جو اسلامی تعلیمات کے

خلاف ہے تو ان کا دیکھنا کسی صورت بھی جائز نہیں ہوسکتا۔ مثلاً فلمیں۔ ان فلموں کے مخرّب اخلاق ہونے میں کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

چونکہ آج کل ٹی وی پر نشر کیے جانے والے پروگرام زیادہ تر فلموں، ڈراموں اور دوسرے غیر اخلاقی مواد پر مشتمل ہوتے ہیں اس لئے بعض دین دار طبقے سرے سے ٹی وی دیکھنے کے خلاف ہیں اور اسے ناجائز قرار دیتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ احتیاط کا تقاضا بھی یہی ہے۔

تاہم اس زمانہ میں ٹی وی اس قدر عام ہو چکا ہے کہ اس سے مفر نہیں اور اس پر ایسے پروگرام بھی دکھائے جاتے ہیں جو مفید اور معلوماتی ہوتے ہیں۔ اس لئے میں یہی کہوں گا کہ ٹی وی پر صرف وہی پروگرام دیکھے جائیں جو مفید ہوں۔ جیسے ہی کوئی برا اور ناشائستہ پروگرام شروع ہو ٹی وی بند کر دیا جائے۔ بالکل اسی طرح جیسے میگزین پڑھتے وقت کوئی ننگی تصویر آجائے تو اس صفحے کو پلٹ دینا چاہئے۔ لیکن اگر کسی کو یہ اندیشہ ہے کہ اپنے گھر میں وہ یہ احتیاط قائم نہیں رکھ سکتا تو بہتر یہی ہے کہ وہ اپنے گھر میں ٹی وی نہ لائے۔

تصویریں کھنچوانا

سوال: میرے پاس ایک کیمرا ہے جس سے میں کسی پروگرام یا سیر وسیاحت کے موقع پر تصویر لیتا ہوں۔ کیا یہ ناجائز ہے؟ اسی طرح میں نے اپنے کمرے میں بعض فلمی اداکاروں کی تصویریں دیواروں پر لٹکا رکھی ہیں اور میرے پاس ایسے میگزین بھی ہوتے ہیں جن میں عورتوں کی تصویریں ہوتی ہیں۔ کیا ان تصویروں کا میرے کمرے میں ہونا اسلامی شریعت کے خلاف ہے؟

جواب: کیمرے سے تصویر لینے کے سلسلے میں مصر کے سابق مفتی علامہ الشیخ محمد نجیت المطیعی نے فتویٰ دیا ہے کہ یہ جائز ہے۔ اسی سلسلے میں انہوں نے ایک کتابچہ بعنوان ''الجواب الکافی فی اباحۃ التصویر والفوتو غرفی'' بھی تصنیف کی ہے

جس میں انہوں نے مدلل طریقے سے واضح کیا ہے کہ کیمرے سے تصویر لینا جائز اور مباح ہے۔ کیونکہ درحقیقت کسی کی تصویر لینا تخلیق نہیں ہوتا جس سے حدیث میں منع کیا گیا ہے' بلکہ یہ تو انسان کے عکس کو کاغذ کے ٹکڑے میں محفوظ کرنے کا عمل ہے۔ اس لئے عربی زبان میں اسے ''عکس'' بھی کہتے ہیں۔ اور تصویر لینے والے کو ''عکاس'' کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ انسان یا کسی بھی شئے کے عکس کو محفوظ کرتا ہے' ویسے ہی جیسے یہ کام آئینہ انجام دیتا ہے۔ یہ وہ کام نہیں ہے جیسا کہ فن کار پتھروں کو تراش کر اسٹیچو بناتے ہیں اور خدا کی تخلیق سے مشابہت اختیار کرتے ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے ''یَخْلُقُ کَخَلْقِي'' یعنی خدا اس فن کار کے بارے میں کہے گا کہ یہ تو میری تخلیق کی طرح تخلیق کرنے چلا ہے اور یہ عمل اس کے لئے باعثِ عذاب ہوگا۔ شیخ محمد نجیت کے اس فتوے سے متعدد علماءِ کرام متفق ہیں اور میرا رجحان بھی اسی فتوے کی طرف ہے۔ چنانچہ میری رائے یہ ہے کہ تصویر لینے میں کوئی حرمت نہیں ہے بہ شرطے کہ وہ تصویر بہ ذاتِ خود حلال ہو یعنی کسی برہنہ یا نیم برہنہ عورت کی تصویر نہ ہو یا ایسے مناظر کی تصویر نہ ہو جو شرعاً جائز نہیں ہیں۔ البتہ اگر کوئی شخص اپنی یا اپنی اولاد کی' دوستوں کی' فطری مناظر کی یا کسی تقریب کی تصویر لیتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بعض ایسے ناگزیر حالات ہیں جن میں متفقہ طور پر تمام علماء نے تصویر لینے کو جائز قرار دیا ہے۔ مثلاً پاسپورٹ وغیرہ کے لئے۔

رہی فنکاروں اور اداکاروں کی تصویریں لٹکانے کی بات تو یہ چیز کسی مسلمان شخص کو زیب نہیں دیتی۔ یہ ان لوگوں کا کام ہے جو ان اداکاروں کے گرویدہ ہیں اور ان کی دلچسپی انہیں چیزوں میں ہے۔ البتہ کسی میگزین میں عورتوں کی تصویریں ہوں اور کوئی شخص اس میگزین کو اپنے گھر علمی استفادے کی خاطر لاتا ہے' ان عورتوں کی تصویروں کی وجہ سے نہیں' تو ایسی صورت میں اس میگزین کو گھر لانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بہ شرطے کہ میگزین کو کچھ اس طرح رکھا جائے کہ تصویر کا صفحہ پوشیدہ رہے۔ بلکہ بہتر یہ ہوگا کہ تصویر کا صفحہ پھاڑ دیا جائے۔

رہا سوال تصویروں کے دیوار پر لٹکانے کا تو یہ کسی طور جائز نہیں ہے' کیونکہ ان کے لٹکانے کا مطلب ہے ان کو تعظیم و تکریم سے نوازنا' جو صرف اللہ کے لئے خاص ہے۔ اسلامی شریعت میں یہ بات ہرگز جائز نہیں کہ کسی بندے کو اس طرح کی تعظیم و تکریم سے نوازا جائے۔

گھر میں اسٹیچو رکھنا

سوال: اسلامی شریعت میں اسٹیچو بنانے اور رکھنے کا کیا حکم ہے؟ میرے پاس پرانے مصری لیڈروں کے کچھ اسٹیچو ہیں' جنہیں میں محض آرائش وزیبائش کی خاطر گھر میں رکھتا ہوں۔ بعض لوگوں نے اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ یہ حرام ہے۔ کیا ان کا اعتراض صحیح ہے؟

جواب: اسلامی شریعت میں کسی بھی جاندار، انسان ہو یا جانور کا اسٹیچو بنانا یا رکھنا حرام ہے۔ اس کی حرمت اس وقت اور بھی شدید ہو جاتی ہے جب یہ اسٹیچو کسی صاحبِ حیثیت و مرتبت شخصیت کا ہو۔ مثلاً کسی نبی کا ہو یا کسی لیڈر کا ہو یا کسی جھوٹے معبود کا ہو مثلاً کسی گائے کا اسٹیچو ہو جسے ہندو اپنا معبود تصوّر کرتے ہیں۔ ایسے موقع پر یہ حرمت بڑھ کر شرک اور کفر تک پہنچ جاتی ہے۔

اسلام' توحید کی تعلیم دیتا ہے اور ہر اس ذریعے کا سدِ باب کرتا ہے جہاں سے شرک یا کفر کا احتمال ہو۔ اسٹیچو کی حرمت میں یہی حکمت پوشیدہ ہے۔

اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ دورِ جدید میں اسٹیچو پوجنے کے لئے نہیں رکھے جاتے۔ یہ اس دور میں ہوتا تھا جب بتوں کا دور تھا۔ جدید دور میں انہیں گھر میں ڈیکوریشن کی خاطر رکھا جاتا ہے۔ تو میں کہوں گا کہ زمانہ چاہے کوئی سا بھی ہو' ہر زمانے میں بتوں کی پوجا ہوتی تھی اور ہوتی ہے۔ آج بھی یورپ اور امریکہ کی سرزمین پر ایسے لوگ آباد ہیں جو ان خرافات پر یقین رکھتے ہیں اور ان کا عقیدہ اتنا کمزور ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی باطل اور خرافات کو آسانی سے قبول کر لیتے ہیں۔ ہندوستان میں گائے کی پوجا ہوتی ہے اور اس

کے اسٹیچو بنائے جاتے ہیں۔ الغرض ہر دور میں اسٹیچو کے ذریعے شرک کے پھیلنے کا امکان ہوتا ہے۔ یہ امکان پہلے بھی تھا اور آج بھی بدستور قائم ہے۔

اسلامی شریعت نے اسٹیچو میں صرف ان اسٹیچوؤں کو جائز قرار دیا ہے جو بچوں کے کھیلنے کے لئے کھلونے کے طور پر بنائے جاتے ہیں مثلاً گڑیا یا روبوٹ وغیرہ۔ کھلونے کے علاوہ کسی اور مقصد کے لئے ان کا استعمال' اسلام کی نظر میں حرام ہے۔

اسلام میں آزادی کا تصور

سوال: آزادی کے سلسلے میں اسلام کا کیا موقف ہے؟ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام آزادی کے خلاف ہے۔ اگر اسلام آزادی کے حق میں ہے تو اسلام کس حد تک آزادی کا قائل ہے اور کس قسم کی آزادی کی حمایت کرتا ہے؟

جواب: دینِ اسلام کا آزادی کے سلسلے میں یہ موقف ہے کہ وہ آزادی کا حامی اور اس کا محافظ ہے۔ اس سلسلے میں امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا جا سکتا ہے:

متی استعبدتم النّاس وقد ولدتهم امهاتهم احرارا.

تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنا لیا' حالانکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا تھا۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ وصیّت کی تھی:

لا تكن عبد غيرك وقد خلقك الله حرا.

تم کسی اور کے بندے نہ ہو جاؤ' حالانکہ اللہ نے تمہیں آزاد پیدا کیا ہے۔

انسان کے سلسلے میں اسلام کا یہی موقف ہے کہ انسان پیدائشی طور پر آزاد ہے۔ یہ آزادی اللہ کی بخشی ہوئی ہے' جسے کوئی انسان اس سے چھیننے میں حق بجانب نہیں ہے۔ چنانچہ ہر انسان کو عقیدے کی آزادی ہے، دین کی آزادی ہے، فکر کی آزادی ہے، سیاسی واجتماعی آزادی ہے اور سب سے بڑھ کر قول اور تنقید کی آزادی ہے۔ یہ ساری آزادیاں

خدا کی عطا کردہ ہیں اور اسلام ان کی حمایت و مدافعت کرتا ہے۔

عقیدہ اور دین کی آزادی یہ ہے کہ ہر انسان اس بات کے لئے مکمل آزاد ہے کہ وہ جس دین کو چاہے اختیار کرے، جس عقیدے کو چاہے اپنائے۔ یہ آزادی خود حضور ﷺ بھی کسی شخص سے نہیں چھین سکتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ○ (یونس:۹۹)

تو کیا تم لوگوں کو مجبور کرو گے حتیٰ کہ وہ ایمان لے آئیں۔

اللہ تعالیٰ دوسری جگہ فرماتا ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرۃ:۲۵۶)

دین کے معاملہ میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔

اس آیت کا سببِ نزول ذہن میں رکھیں تو یہ بات مزید واضح ہو جائے گی۔ جاہلیت میں یہ ہوتا تھا کہ اوس وخزرج کی جو عورتیں اولاد سے مایوس ہو جایا کرتی تھیں۔ وہ منت مانتی تھیں کہ اگر ان کے یہاں اولاد ہوئی تو اسے یہودی بنائیں گی اور اسی پر ان کا عمل رہا۔ جب اسلام آیا اور اوس وخزرج کے لوگ بھی اسلام میں داخل ہوئے تو ان عورتوں کے شوہروں نے اپنی یہودی بچوں کو اسلام میں آنے کے لئے مجبور کیا۔ اسلام اور یہودیت میں معرکہ آرائی کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو اس بات سے منع کیا کہ وہ کسی کو زبردستی اسلام قبول کرنے پر مجبور کریں۔ یہ ہے عقیدہ اور دین کی آزادی' جس کا اسلام قائل ہے۔ دوسری طرف آپ تاریخ کی کتابوں میں عیسائیوں کے واقعات پڑھ لیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ یا تو مسیحیت قبول کرو یا مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ (۹)

یہ ہے عقیدہ کی آزادی' جو اسلام کی نظر میں ہر شخص کا پیدائشی حق ہے۔ لیکن یہ آزادی بھی چند شرائط کے ساتھ مشروط ہے' تاکہ یہ آزادی لوگوں کے ہاتھوں میں کھلواڑ نہ بن جائے۔ کہ جب چاہیں اسلام قبول کر لیں اور تھوڑے دنوں کے بعد جب منہ کا مزہ

بدلنا ہو تو مسیحیت اختیار کر لی اور پھر یہودی بن گئے یا پھر دوبارہ اسلام قبول کر لیا۔ یہ آزادی کا غلط استعمال ہے۔ آزادی یہ ہے کہ جو دین بھی اختیار کیا جائے' خوب سوچ سمجھ کر اختیار کیا جائے۔ اگر کوئی شخص اپنی مرضی سے اسلام قبول کرتا ہے تو اسے چاہئے کہ خوب غور و فکر کے بعد اسلام قبول کرے۔ اس کے بعد اس پر لازم ہے کہ وہ اسلام کو ترک نہ کرے ورنہ اسے ارتداد کی سزا بھگتنی ہوگی۔

دوسری آزادی' جس کا اسلام قائل ہے وہ ہے فکر کی آزادی۔ متعدّد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ مثلاً:

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ (یونس:۱۰۱)

ان سے کہو زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسے آنکھیں کھول کر دیکھو۔

دوسری آیت ہے:

اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۣ (سبا:۴۶)

اے نبی ﷺ ان سے کہو میں تمہیں بس ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔ خدا کے لئے تم اکیلے اکیلے اور دو دو مل کر اپنا دماغ لڑاؤ پھر غور کرو۔

اسلام نے لوگوں کو اس بات کی تعلیم دی کہ لوگ اوہام و خرافات پر یقین نہ کریں اور نہ باپ دادا ہی کے کہنے پر' بلکہ خود غور و فکر کریں، اپنی عقل استعمال کریں اور اس کے بعد فیصلہ کریں کہ کون سا دین حق پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے توحید و رسالت اور آخرت کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لئے عقلی دلائل دیئے ہیں' تا کہ عقل والے غور کریں اور غور کرنے کے بعد اسے حق سمجھ کر قبول کریں۔

اسی فکری آزادی کے نتیجہ میں علمی آزادی میسّر آئی۔ اسی علمی آزادی کی بنیاد پر علماءِ کرام متعدّد احکام میں ایک دوسرے سے مختلف رائے رکھتے ہیں۔ ہر عالم اس بات کے لئے آزاد ہے کہ دلیل کی بنیاد پر کوئی بھی رائے قائم کرے۔ اور یہ اختلاف اسلام کی نظر

میں ہرگز معیوب نہیں ہے۔ یہ علمی آزادی ہی ہے کہ جس کی وجہ سے علماء میں رایوں کا اختلاف ظاہر ہوا اور اس اختلاف کے باوجود ہر عالم دوسرے عالم سے استفادہ کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا۔ چنانچہ امام زمخشری جو کہ معتزلی تھے' اہلِ سنّت والجماعت ان کی تفسیر ''الکشاف'' سے ہمیشہ استفادہ کرتے آئے ہیں۔

اسی طرح اسلام کچھ کہنے اور تنقید کرنے کی آزادی عطا کرتا ہے۔ بلکہ بعض موقعوں پر جہاں معاملہ عوامی مصلحتوں سے متعلق ہو کچھ کہنا اور تنقید کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اسی لئے اسلام نے 'اُمر بالمعروف' اور 'نہی عن المنکر' کا فریضہ اُمت کے کاندھوں پر ڈالا ہے۔ چنانچہ جب کوئی برائی ظاہر ہو یا معاشرے میں عام فساد کا اندیشہ ہو تو تنقید کا حق استعمال کرتے ہوئے اس فساد کا سدِّ باب کرنا چاہئے اور اس سلسلے میں جو مصیبتیں پیش آئیں انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَآ أَصَابَكَ ط

(لقمان: ١٧)

بھلائی کا حکم دو۔ برائی سے روکو اور جو مصیبت آئے اس پر صبر کرو۔

یہ ہیں اسلام کی تعلیمات۔ ایک نظر ان تعلیمات پر ڈالئے اور ان کا مقابلہ غیر اسلامی حکومتوں سے کیجئے جہاں کچھ کہنے کی آزادی نہیں ہے۔ وہی کہنے کی اجازت ہے جو حکومت کہتی ہے۔ ورنہ قید و بند کی مصیبتیں جھیلنے کے لئے تیار ہو جائیے۔ اسلام اس نظریے کے خلاف ہے۔ اسلام نے ہر شخص کو مکمل آزادی دی ہے کہ وہ غور و فکر کرنے کے بعد اپنی مرضی سے جو دین چاہے، اختیار کرے اور اس راہ میں' اگر حکومت حائل ہوتی ہے، تو اس حکومت سے جہاد کیا جائے۔ (۱۰) جہاد کی فرضیت کے لئے جو سب سے پہلی آیت نازل ہوئی' اس میں جہاد کی یہی مصلحت بتائی گئی ہے۔

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ط (الحج: ٣٩)

اجازت دی گئی' ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے' کیونکہ وہ

مظلوم ہیں۔

یہ ہیں وہ آزادیاں، جن کا اسلام نہ صرف قائل ہے، بلکہ محافظ بھی ہے۔ یہ حقوق ومصالح کی آزادیاں ہیں۔ کفر ومعصیت کی نہیں۔ یہ وہ آزادیاں نہیں ہیں جن کا اہلِ مغرب دم بھرا کرتے ہیں اور ان آزادیوں کو شخصی آزادی یا Private Life سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ انسان شخصی طور پر مکمل آزاد ہے۔ چاہے زنا کرے، شراب پئے یا کوئی اور گناہ کا کام کرے۔ اسلام اس کفر وفسق کی آزادی کا قائل نہیں ہے۔ اسلام حقوق ومصالح کی آزادی کا قائل ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر واضح کیا۔ اسلام اس آزادی کا قائل نہیں ہے جس میں اپنا یا دوسروں کا نقصان پوشیدہ ہو یا جو آزادی تباہی وہلاکت کی طرف لے جاتی ہو۔ آپ کی آزادی وہاں ختم ہو جاتی ہے جہاں سے دوسروں کا نقصان شروع ہوتا ہے۔ آپ کو سڑک پر کار چلانے کی مکمل آزادی ہے، لیکن اس آزادی کا مطلب یہ نہیں کہ آپ ایکسیڈنٹ کرتے پھریں۔ آپ کو ٹریفک کے قوانین کی پابندی ہر حالت میں کرنی ہے۔

ماسونی تنظیموں میں شرکت

سوال: ماسونی تحریکوں اور تنظیموں میں حصہ لینے اور ان کا ممبر بننے کے سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ میں نے مختلف لوگوں سے اس موضوع پر گفتگو کی۔ بعض اس کے حق میں ہیں اور بعض شدید مخالف ہیں۔ جو اس کے حق میں ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ تنظیمیں آزادیٔ انسان، انسانیت اور اخوت کی علم بردار ہیں۔ اور جو مخالف ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ تحریکیں یہودی تحریکیں ہیں، جن کا مقصد خفیہ اور پوشیدہ طریقوں سے زمین میں فساد برپا کرنا ہے اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مختلف کارروائیاں کرنا ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ اپنی رائے سے مطلع کریں۔

جواب: میں بغیر کسی تردّد اور پس وپیش کے مسلمانوں کو ان تنظیموں کی تباہ کاریوں اور پوشیدہ سرگرمیوں سے لوگوں کو باخبر کرنا چاہتا ہوں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے میں

چند ایسے حقائق پیش کرنا چاہوں گا جن میں کسی شک کی گنجائش نہیں:

۱- مسلمان، واضح خیالات وحرکات کا حامل انسان ہوتا ہے۔ اس کی سرگرمیاں خفیہ اور مشکوک قسم کی نہیں ہوتی ہیں۔ اس کی سرگرمیاں روزِ روشن کی طرح واضح ہوتی ہیں جیسا کہ قرآن میں ہے:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۫ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ

(یوسف: ۱۰۸)

تم ان سے صاف کہہ دو کہ میرا راستہ تو یہ ہے کہ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے متبعین بھی۔

اس آیت میں ''عَلٰي بَصِيْرَةٍ'' کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ یا کسی بھی مسلمان کی دعوتی سرگرمیاں بالکل واضح اور حقائق پر مبنی ہوتی ہیں۔ اس لئے کسی مسلمان کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ ایسی تنظیم میں شامل ہو جس کی سرگرمیاں خفیہ اور جس کے اہداف ومقاصد مشکوک قسم کے ہوتے ہیں اور اکثر یہ سرگرمیاں دینِ اسلام کی نظر میں ممنوع اور تباہ کن ہوتی ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو اس بات کی تعلیم دی ہے کہ شک وشبہ والی چیزوں کو چھوڑ کر ان چیزوں کو اپنائیں جو شک وشبہ سے بالاتر ہوں۔ حدیثِ نبوی ﷺ ہے:

دَعْ مَا يُرِيْبُكَ اِلٰى مَا لَا يَرِيْبُكَ

جو چیز تمہارے لئے شک پیدا کرے اسے چھوڑ کر اس چیز کو اپناؤ جو تمہارے لئے شک پیدا نہ کرے۔

دوسری حدیث ہے:

مَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ فَقَدِ اسْتَبْرَأَ لِدِيْنِهٖ وَعِرْضِهٖ.

جس نے شک وشبہ والی چیزوں سے اجتناب کیا تو اس نے اپنے دین اور عزت کو محفوظ کیا۔

۲-اگر واقعی یہ تنظیمیں انسانیت اور اخوّت کی علم بردار ہیں جیسا کہ دعویٰ کیا جاتا ہے تو ہم مسلمان ان مقاصد کے لئے کسی غیر اسلامی تنظیم کے محتاج نہیں ہیں۔ ہمارا دین تو خود انسانیت اور اخوّت ومحبت کا سب سے بڑا علم بردار ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم ان مقاصد کے لئے دوسری تحریکوں میں شامل ہونے کے بجائے خود اپنے دین کی تحریکوں میں شامل ہوں۔

۳-ان ماسونی تنظیموں کی ابتدا اور پیدائش اس علاقہ میں ہوتی ہے جو نہ اسلام کی سرزمین ہے اور نہ مسلمانوں کی' بلکہ وہ سراسر اسلام دشمن علاقہ ہے اور ان تحریکوں کے بانی بھی اسلام دشمنی میں معروف ومشہور ہیں۔

۴-ان ماسونی تنظیموں میں جو کوئی شامل ہوتا ہے اس پر لازم ہوتا ہے کہ ہائی کمان کی طرف سے جو حکم ملے اسے بلا چوں وچرا بجا لائے۔ کسی بھی حکم کے سلسلے میں نہ وہ بحث کرسکتا ہے اور نہ اسے پسِ پشت ڈال سکتا ہے' بلکہ اس کے برعکس اگر اس حکم کی تعمیل میں اس کی جان بھی جاتی ہو تب بھی اس کے لئے اس حکم کی تعمیل ضروری ہوتی ہے۔ اس طرح کی اندھی اطاعت' اسلام کی نظر میں صرف اللہ کے لئے جائز ہے' کسی انسان کی اندھی اطاعت جائز نہیں ہے۔ کیونکہ انسان صحیح کام کا بھی حکم دے سکتا ہے اور غلط کام کا بھی۔ کسی انسان کی اندھی اطاعت کا مطلب یہ ہوا کہ اب اس کا حکم خدا کے حکم سے بھی برتر ہے اور خدا کے حکم کے مقابلہ میں اس کا حکم بجالانا زیادہ ضروری ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ ان تنظیموں کے ہائی کمان کی طرف سے جو احکام صادر ہوتے ہیں' اکثر ان کا مقصد معاشرے میں تخریب کاری اور فساد برپا کرنا ہوتا ہے۔ اسلام کی نظر میں ان احکام کی تعمیل جائز نہیں ہے۔ صحیح حدیث ہے:

فان امر بمعصية فلا سمع ولا طاعة.

یعنی اگر وہ کسی گناہ کا حکم دے تو اس کی بات نہ سننی ہے اور نہ اس کی اطاعت کرنی ہے۔

۵- ان تنظیموں کی بنیاد ہی سیکولرازم پر قائم ہے۔ یعنی ان کی نظر میں دین اور سیاست دو الگ الگ چیزیں ہیں اور سیاست کو دین سے علیحدہ رکھنا چاہئے۔ ان کی نظر میں فیصلہ کرنے اور قانون بنانے کا اختیار عوام کو ہے۔ یہ نظریہ اسلام کے عین قطعاً مخالف ہے۔ اسلام کی نظر میں قانون بنانا اور فیصلہ کرنا' اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ بندوں کا کام ان قوانین اور فیصلوں کے مطابق عمل کرنا ہے۔

۶- ان تنظیموں کی پالیسی کے مطابق' ایک ممبر کا دوسرے ممبر سے تعلّق محض تنظیمی بنیاد پر ہوتا ہے۔ دوسرے معنوں میں یہ تنظیمیں مسلمانوں کے دینی اور اسلامی تعلّق اور اخوّت کی سخت مخالف ہیں۔ جب کہ اسلام مسلمانوں کو عقیدے اور دین کی بنیاد پر ایک دوسرے سے جوڑتا ہے۔ اسلام کی نظر میں دینی تعلّق ہر قسم کے تعلّقات مثلاً رنگ و نسل یا قومیت و وطنیت کے تعلّق سے کہیں بالاتر ہے۔ قرآن کہتا ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (الحجرات:۱۰)

مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔

اس آیت کی رُو سے مسلمانوں میں تعلّق اور اخوّت کی بنیاد ان کا دین وایمان ہے۔

ان تمام باتوں کو مدّ نظر رکھتے ہوئے کوئی باغیرت و باحمیّت مسلمان یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس طرح کی تنظیموں میں شامل ہو اور اللہ کی نظر میں مبغوض قرار پائے۔

شہید کا اجر

سوال: کوئی مسلمان فلسطین کی پاک سرزمین میں جا کر یہودیوں کے خلاف جنگ کرتا ہے اور مارا جاتا ہے تو کیا اسے شہید شمار کیا جائے گا؟ اور کیا اس شہادت کی وجہ سے اس کے تمام چھوٹے بڑے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ خواہ اس نے فرائض کی ادائی میں کوتاہی کی ہو یا بعض حرام کام کیے ہوں؟

جواب: ہر وہ مسلمان جو کلمہ گو ہے اور توحید و رسالت پر اس کا ایمان کامل ہے اور وہ

اسلام کے متعلق کوئی ایسی بات بھی نہیں کہتا جو اسے دائرۂ اسلام سے خارج کر دے تو ایسا شخص اگر کفار و مشرکین یا یہود و نصاریٰ کے خلاف جہاد کرتا ہوا مارا جائے تو اسے شہید شمار کیا جائے گا۔ اس پر شہیدوں کا حکم نافذ ہوگا۔ چنانچہ اسے غسل نہیں دیا جائے گا اور نہ کفن ہی پہنایا جائے گا بلکہ انہی کپڑوں میں دفن کر دیا جائے گا جو بوقتِ شہادت اس کے بدن پر تھے۔ تاکہ قیامت کے دن اس کے خون اور زخم اس کی شہادت کی گواہی دیں۔

رہی یہ بات کہ اس کی جنگ اللہ کی راہ میں شمار ہوگی یا نہیں؟ تو اس کا تعلق اس کی نیّت سے ہے' کیونکہ دینِ اسلام میں ہر عمل کا دارومدار نیّت اور اس مقصد و غایت پر ہوتا ہے جس کے لئے یہ عمل کیا جائے۔ حدیثِ نبوی ﷺ ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ اِلٰى صُوَرِكُمْ وَلٰكِنْ يَنْظُرُ اِلٰى قُلُوْبِكُمْ۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہاری صورتیں نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمہارے دل دیکھتا ہے۔

بلاشبہ جہاد کوئی دُنیوی کام نہیں ہے' بلکہ یہ ایک عبادت اور تقرّب الی اللہ کا عظیم ذریعہ ہے۔ اس لئے تمام عبادتوں کی طرح اس میں بھی ضروری ہے کہ یہ عبادت خالصۃً اللہ کے لئے ادا کی جائے۔ کسی دنیاوی غرض و غایت مثلاً شہرت کی خواہش یا جوانمردی کے اظہار کے لئے یا کسی سے انتقام لینے کے لئے یہ کام انجام نہ دیا جائے۔ اگر کسی دُنیوی غرض کے لئے کسی نے جہاد کیا تو یہ جہاد اللہ کی راہ میں نہیں ہے' جس کا انعام جنت ہے' بلکہ یہ ریاکاری ہے جس کا انجام جہنم ہے۔ بخاری و مسلم کی صحیح حدیث ہے کہ ایک بدّو نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ ایک شخص مالِ غنیمت کے لئے لڑتا ہے۔ ایک شخص تعریف و توصیف کے لئے لڑتا ہے اور ایک شخص اپنی حیثیت ظاہر کرنے کے لئے لڑتا ہے۔ ان میں سے کون اللہ کی راہ میں شمار کیا جائے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔

جس نے اس مقصد کے لئے جنگ کی کہ اللہ کا دین غالب ہو، وہی جنگ اللہ کی راہ میں ہے۔

رہا یہ سوال کہ شہید کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ گناہ کی دو قسمیں ہیں۔

۱- ایک وہ گناہ جن کا تعلق بندوں کے حقوق سے ہوتا ہے مثلاً کسی کا مال چرا لیا یا چھین لیا۔ یا کسی کا قرض باقی ہے' تو اس قسم کے گناہ شہادت کی وجہ سے معاف نہیں ہوتے ہیں' کیونکہ ان کا تعلق حقوق العباد سے ہے۔ یہ حق جب تک متعلقہ بندے کو ادا نہیں کر دیا جاتا تب تک گناہ معاف نہیں ہوتا۔ مسلم شریف کی حدیث ہے:

يُغْفَرُ لِلشَّهِيْدِ كُلُّ ذَنْبٍ اِلَّا الدَّيْنَ.

شہید کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں سوائے قرض کے۔

۲- رہے وہ گناہ جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے مثلاً نماز ترک کرنا، شراب پینا وغیرہ' تو اس قسم کے گناہ بلا شبہ جہاد کی وجہ سے معاف ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے واضح حدیث یہ ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

اَلْقَتْلٰى ثَلَاثَةٌ مُؤْمِنٌ جَاهَدَ بِنَفْسِهٖ وَمَالِهٖ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ، فَاِذَا لَقِیَ الْعَدُوَّ قَاتَلَ حَتّٰى یُقْتَلَ فَذٰلِكَ الشَّهِیْدُ الْمُمْتَحَنُ. وَمُؤْمِنٌ خَلَطَ عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَیِّئًا، جَاهَدَ بِنَفْسِهٖ وَمَالِهٖ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اِذَا لَقِیَ الْعَدُوَّ قَاتَلَ حَتّٰى یُقْتَلَ قَالَ النَّبِیُّ ﷺ فِیْهِ "مُمَصْمَصَةٌ" وَمُنَافِقٌ جَاهَدَ بِنَفْسِهٖ وَمَالِهٖ فَاِذَا لَقِیَ الْعَدُوَّ قَاتَلَ حَتّٰى یُقْتَلَ فَذٰلِكَ فِی النَّارِ (۱۱)

(یعنی) مقتولین تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ مومن و متقی بندہ جو اپنے نفس اور مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہوتا ہے۔ جب دشمن سے مڈ بھیڑ ہوتی ہے تو جنگ کرتا ہے حتیٰ کہ مارا جاتا ہے تو وہ شہید ہے اور اس کا مقام انبیاء کے برابر ہے۔ دوسرا وہ مجاہد شخص ہے جس نے اچھے اور برے دونو طرح کے عمل کیے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے نفس اور مال سے اللہ کی

راہ میں جہاد کرنے والا ہوتا ہے۔ جب دشمن سے مڈبھیڑ ہوتی ہے تو جنگ کرتا ہے حتیٰ کہ مارا جاتا ہے تو یہ شہادت اس کے گناہوں کا کفارہ ہے (یعنی اس کے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور وہ جنتی ہوتا ہے)۔

تیسرا وہ مقتول ہے جو منافق ہے جو اپنے نفس و مال کے ذریعہ سے جہاد کرتے ہوئے مارا جاتا ہے۔ ایسا شخص جہنم میں جائے گا۔

حضور ﷺ کے اس بیان کے بعد اس بات میں کسی قسم کے شک شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ شہادت تمام گناہوں کے لئے کفارہ ہے' چاہے بعض فرائض میں کوتاہی ہو یا بعض حرام کام سرزد ہوئے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے۔ البتہ وہ لوگ جو اسلامی نام رکھتے ہیں اور مسلمان کہلائے جاتے ہیں۔ لیکن حقیقتاً اسلام سے ان کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ وقتاً فوقتاً اسلام کی شان میں گستاخیاں کرتے رہتے ہیں۔ تو شہادت ان کے گناہوں کا کفارہ نہیں بن سکتی' چاہے وہ یہودیوں کے خلاف جنگ کرتے ہوئے ہی کیوں نہ مارے جائیں۔ کیونکہ ایسے لوگ درحقیقت مرتد و ملحد ہو چکے ہیں اور دائرۂ اسلام سے خارج ہو چکے ہیں۔

مصیبت کی گھڑی میں فردِ مسلم کا رول

سوال: میں ایک طالب علم ہوں۔ میں نے اپنے گھر والوں کے ساتھ ایک اچھی زندگی گزاری ہے۔ چند سال قبل میرے والدِ محترم کا انتقال ہو گیا۔ میری والدہ نے عدت کے بعد دوسری شادی کر لی۔ شادی سے دو سال بعد میرے دوسرے والد نے مجھے گھر سے نکال باہر کیا۔ اب میرے پاس نہ گھر ہے اور نہ گھر والے۔ میں بالکل بے سہارا ہو گیا ہوں۔ کیا میں خودکشی کر لوں یا اپنی مصیبت پر صبر کروں؟

جواب: میرے بچے' تمہارے لئے صبر کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ وہ صبر جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے مشکل حالات میں مدد لینے کی تاکید فرمائی ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (البقرۃ:۱۵۳)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو صبر اور نماز سے مدد لو (کیونکہ بے شبہ صبر خوشیوں کی کنجی ہے)

ضروری ہے کہ مسلمان مشکل حالات اور پریشانیوں کے موقع پر اپنے فولادی ارادوں اور زبردست نفسیاتی طاقت کے ذریعہ سے ان حالات کا مقابلہ کرے اور اللہ پر توکل کرتے ہوئے ان حالات پر قابو پانے کی کوشش کرے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ حالات خود اس پر غالب ہو جائیں اور وہ ریزہ ریزہ ہو کر خودکشی کے بارے میں سوچنے لگے۔

ساری انسانی تاریخ ایسے واقعات اور تذکروں سے بھری پڑی ہے کہ بڑے بڑے لوگوں پر بے انتہا نامساعد حالات آئے، لیکن انہوں نے صبر اور مضبوط ارادہ کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور آخر میں سرخرو ہوئے۔ حتیٰ کہ انبیاء کرام بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہے۔ جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے کہ تمام انبیاء کرام نے بچپن ہی سے تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ ان میں سے کسی کا بچپن خوشحالی میں نہیں گزرا، بلکہ نہایت غربت وافلاس میں ان کی نشوونما ہوئی ہے۔ مثلاً آپ موسیٰ علیہ السلام کا قصہ پڑھ لیں یا یوسف علیہ السلام کا۔ موسیٰ علیہ السلام پیدائش کے فوراً بعد سمندر میں پھینک دیئے جاتے ہیں اور ان کی تربیت اس گھرانے میں ہوتی ہے جو بنی اسرائیل کا جانی دشمن تھا، لیکن بالآخر کامیابی آپ علیہ السلام کا مقدر بنی۔ یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے کنویں میں پھینک دیا۔ انہیں بازار میں غلام بنا کر فروخت کیا گیا۔ ان پر زنا کا الزام لگایا گیا۔ انہوں نے جیل میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں لیکن آخرکار منصبِ وزارت پر فائز ہوئے۔ اسی سورہ یوسف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ○ (یوسف:۹۰)

حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی تقویٰ اور صبر سے کام لے تو اللہ ایسے نیک بندوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

خودکشی کسی طور پر جائز نہیں ہے، بلکہ یہ تو کفر کے مشابہ ہے۔ کیوں کہ جان اللہ تعالیٰ

کی بخشی ہوئی نعمت ہے اور اسے واپس لینے کا حق صرف اللہ کو ہے۔ اور خودکشی کا مطلب ہے کہ بندہ اللہ کی رحمت سے بالکل مایوس ہوگیا ہے۔ اور اللہ کی رحمت سے مایوس مومن نہیں ہوتا' بلکہ کافر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے:

اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ۝ (یوسف:۸۷)

اللہ کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں۔

اس لئے میں آپ کو یہی وصیّت کرتا ہوں کہ آپ صبر سے کام لیں۔ ایک نہ ایک دن آپ کی مصیبت ضرور دور ہوگی۔ ان شاء اللہ۔

گناہِ کبیرہ سے توبہ

سوال: اس شخص کے سلسلہ میں آپ کی کیا رائے ہے جس نے زنا جیسا فعل کیا ہو یا پاک دامن عورت پر زنا کا جھوٹا الزام لگایا ہو یا لوگوں کا مال ناحق طریقے سے کھایا ہو۔ اس نے کبائر میں سے کسی ایک گناہ کا ارتکاب کیا ہو یا سارے گناہ کئے ہوں اور اب اس نے اللہ کے حضور اپنے ان گناہوں سے توبہ بھی کر لی ہو۔ جہاں تک لوگوں کا مال ناحق طریقے سے کھانے کا تعلق ہے تو اب اس کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ وہ ان کا حق واپس کر سکے۔ تب اسے کیا کرنا چاہئے؟

جواب: آپ نے جن تین گناہوں کا تذکرہ کیا ہے ان میں سے بعض کا تعلق حقوق اللہ سے ہے اور بعض کا حقوق العباد سے۔

زنا کے بارے میں جمہور علمائے کرام کی رائے یہ ہے کہ اس کا تعلق حقوق اللہ سے ہے۔ چنانچہ جب کسی بندے سے یہ غلطی ہو جائے تو اسے چاہئے کہ اپنے کئے پر نادم ہو اور اللہ سے مغفرت کی دعا کرے اور عزمِ مصمم کرے کہ اب آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔ اس توبہ کے بعد اللہ کی رحمت سے قوی امید ہے کہ اللہ اس بندے کی توبہ قبول کر لے گا اور اس کا گناہ معاف کر دے گا۔

بعض سخت گیر قسم کے علماء کہتے ہیں کہ زنا کا تعلق حقوق العباد سے بھی ہے اور زنا

کرنے والے کو چاہئے کہ جس لڑکی کے ساتھ اس نے یہ جرم کیا ہے، اس کے اہلِ خانہ کے پاس جائے اور اپنے کیئے کی معافی مانگے' تب خدا بھی اسے معاف فرمائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے جس جرم پر پردہ ڈال رکھا تھا' وہ خود ہی لڑکی کے گھر والوں کے پاس جا کر یہ بتائے کہ میں نے تمہاری لڑکی کے ساتھ زنا کیا ہے اور تم مجھے معاف کر دو۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ بات اور بڑھے گی اور معاملہ جنگ وجدال تک پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے یہ رائے صحیح نہیں معلوم ہوتی۔

جہاں تک پاک دامن عورت پر زنا کا الزام لگانے کا معاملہ ہے تو یہ ان سات بھیانک گناہوں میں سے ہے جن کے بارے میں حضور ﷺ نے ''اَلسَّبْعُ الْمُوْبِقَاتُ'' (یعنی سات تباہ کن چیزیں) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ قرآن نے ایسا کرنے والوں پر لعنت بھیجی ہے اور دردناک عذاب کی وعید سنائی ہے۔ آیت یوں ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ (النور: ۲۳)

جو لوگ پاک دامن بھولی بھالی مومن عورتوں پر تہمتیں لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔

دنیا میں اس جرم کی سزا اسّی کوڑے ہیں اور دوبارہ کبھی اس شخص کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی' لیکن ایسے شخص کے لئے توبہ کی کیا شکل ہوگی' اس سلسلہ میں علماء کا اختلاف ہے۔ کیوں کہ اس کا تعلّق حقوق اللہ سے بھی ہے اور حقوق العباد سے بھی۔

اس سلسلہ میں میری رائے یہ ہے کہ جس طرح اس شخص نے لوگوں کے سامنے اس پاک دامن عورت پر الزام تراشی کی ہے۔ اسی طرح اسے چاہئے کہ وہ لوگوں کے سامنے جا کر اپنے جھوٹا ہونے کا اعتراف کرے تاکہ تمام لوگ جان لیں کہ اس نے غلط الزام لگایا تھا۔ اس کے بعد اس عورت سے معافی مانگے جس پر الزام لگایا تھا اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے۔ تب جا کر امید ہے کہ اللہ اسے معاف فرمائے گا۔ صرف اللہ سے

معافی مانگ لینا کافی نہیں ہے۔

جہاں تک ناحق طریقہ سے دوسروں کا مال کھانے کا تعلّق ہے تو اس کی توبہ اس وقت قبول ہوگی جب حق والے کو اس کا حق واپس کر دیا جائے۔ جیسا کہ پچھلے اسی باب میں بتایا جاچکا ہے کہ ایک شہید کے سارے گناہ شہادت کی وجہ سے معاف ہو جاتے ہیں سوائے اس گناہ کے جس کا تعلّق حقوق العباد سے ہو۔ جب ایک شہید کی معافی کے لئے ضروری ہے کہ وہ حق والے کا حق لوٹا دے تو دوسروں کے لئے یہ بات بدرجۂ اولیٰ ضروری ہے۔

البتہ اگر وہ صاحبِ حق کو انتہائی مفلسی کی وجہ سے مال واپس نہیں کر سکتا تو اسے چاہئے کہ وہ صاحبِ حق کے پاس جائے اور اسے اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کرے کہ وہ اسے معاف کر دے۔ اگر وہ معاف نہیں کرتا تو اس بات کا پکا ارادہ کرنا چاہئے کہ جوں ہی اس کے پاس پیسے آئیں گے، پہلی فرصت میں صاحبِ حق کو اس کا حق واپس کر دے گا۔ اگر پیسے مہیّا نہ ہو سکے اور وہ مر گیا تو اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی نیّت کو دیکھتے ہوئے اسے معاف کر دے گا۔

یہودیوں کی معافی

سوال: ویٹیکن سٹی میں مسیحیوں کی طرف سے یہ سرکاری اعلان ہوا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر لٹکانے اور ان کا خون کرنے کے جرم سے یہودیوں کو معاف کرتے ہیں۔ اس اعلان پر عرب دنیا میں ہلچل مچ گئی ہے، کیوں کہ اسلام کی نظر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سولی پر نہیں لٹکائے گئے بلکہ اللہ نے انہیں زندہ اٹھالیا۔ عیسائیوں کا یہ فیصلہ کیا اسلامی نقطہ نظر کے منافی نہیں ہے؟ اور کیا آج کے یہودی اپنے اسلاف کے جرم کے ذمہ دار ہیں؟

جواب: مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ سولی پر چڑھائے گئے اور نہ قتل کئے گئے بلکہ اللہ نے انہیں اپنے پاس زندہ اوپر اٹھالیا۔ لیکن مسلمانوں کے اس

عقیدہ سے اس بات کی نفی نہیں ہوتی کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی سازش کی تھی اور وہ اس جرم کے ذمہ دار ہیں۔ وہ اگرچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہ کر سکے تاہم انہیں یہی یقین ہوا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا ہے۔ ان کے اسی غلط یقین کی طرف قرآن یوں اشارہ کرتا ہے۔

وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ط (النساء:۱۵۷)

بلکہ معاملہ ان کے لئے مشتبہ کر دیا گیا۔

اس لئے اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی پوری کوشش کی اور اپنی دانست میں انہوں نے قتل بھی کر ڈالا۔ یہ جرم ان پر سے ساقط نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے یہ جرم صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نہیں کیا بلکہ انہوں نے کئی انبیاء کو بالفعل قتل کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت زکریا علیہ السلام' ان کے بیٹے حضرت یحییٰ علیہ السلام اور ان کے علاوہ متعدد انبیاء کو قتل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں مخاطب کرتا ہے۔

أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ ۝ (البقرہ:۸۷)

پھر یہ تمہارا کیا ڈھنگ ہے کہ جب بھی کوئی رسول تمہاری خواہشاتِ نفس کے خلاف کوئی چیز تمہارے پاس لے کر آیا تو تم نے اس کے مقابلہ میں سرکشی کی۔ کسی کو جھٹلایا اور کسی کو قتل کر ڈالا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی سازش اگرچہ دو ہزار سال قبل کے یہودیوں نے کی تھی تاہم اس کی ذمہ داری ہر دور کے یہودیوں پر عائد ہوگی' کیوں کہ ہر دور میں یہودی اپنے اسلاف کے اس فعل پر خوش ہوتے ہیں اور ان کی تعریفیں کرتے ہیں۔ جب تک وہ اس جرم کی مذمت نہیں کرتے' تب تک عملاً وہ بھی اس جرم میں شریک ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں رہنے والے یہودیوں کو اللہ تعالیٰ

مخاطب کر کے متعدد مقامات پر فرماتا ہے کہ تم نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔ تم نے یہ کیا اور تم نے وہ کیا۔ حالانکہ یہ سارے کام انہوں نے نہیں بلکہ ان کے اسلاف نے کیے تھے۔ لیکن چوں کہ یہ یہودی اپنے اسلاف کے ان کاموں پر راضی تھے اور ان کی مدح سرائی کرتے تھے' اس لئے عملی طور پر وہ بھی ان کاموں میں شریک تصور کیے گئے۔

یہودیوں نے ہمیشہ اپنے اسلاف کی روایت برقرار رکھی ہے اور ہمیشہ جرم وفساد کا بازار گرم رکھا ہے۔ موجودہ زمانہ میں فلسطین کی سرزمین پر جو کچھ وہ بوڑھے مردوں عورتوں اور بچوں کے ساتھ کر رہے ہیں' ان کے وحشیانہ جرائم کی زندہ مثالیں ہیں۔

چاند پر جانے کا مسئلہ دین کی نظر میں

سوال: امریکہ، روس اور ان کے علاوہ کچھ دوسرے مغربی ممالک اس بات کا دعویٰ کر رہے ہیں کہ انسان خلائی گاڑیوں کی مدد سے چاند پر جا سکتا ہے۔ دوسری طرف بعض علماء اسلام اس دعویٰ کو غلط قرار دیتے ہیں اور اسے محض خرافات سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ قرآن میں اللہ نے آسمان کو ''سقفِ محفوظ'' یعنی محفوظ چھت قرار دیا ہے۔ اب اس محفوظ چھت کو کوئی کیسے عبور کر سکتا ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

نوٹ: یہ سوال ان دنوں کیا گیا تھا جب انسان کے قدم چاند پر نہیں پہنچے تھے اور ترقی یافتہ ممالک چاند پر پہنچنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔

جواب: میں سوال کرنے والے بھائی سے کہوں گا کہ قرآن میں ایسی کوئی آیت یا واضح نص نہیں ہے جو اس بات کی نفی کرے کہ انسان چاند پر جا سکتا ہے یا اس بات کی تائید کرے کہ انسان وہاں جا سکتا ہے۔ قرآن میں آسمان کے سلسلہ میں جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ اللہ نے آسمان کو مزین کیا اور شیطانِ رجیم کی پہنچ سے محفوظ رکھا ہے۔ اللہ فرماتا ہے۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ٥ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ٥ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ

مُّبِيْنٌ○ (الحجر:۱۶،۱۸)

یہ ہماری کارفرمائی ہے کہ آسمان میں ہم نے بہت سے مضبوط قلعے بنائے ان کو دیکھنے والوں کے لئے آراستہ کیا اور ہر شیطان مردود سے ان کو محفوظ کر دیا۔کوئی شیطان ان میں راہ نہیں پاسکتا، اِلّا یہ کہ کچھ سن گن لے لے اور جب وہ سن گن لینے کی کوشش کرتا ہے تو ایک شعلۂ روشن اس کا پیچھا کرتا ہے۔

آسمان کو شیطان رجیم کی پہنچ سے محفوظ رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ شیطان نہ اس تک پہنچ سکتا ہے اور نہ اپنے ناپاک قدم وہاں رکھ سکتا ہے۔شیطان کا دائرۂ کار زمین کی حد تک محدود ہے اور اس کا کام زمین پر بسنے والے انسانوں کو بہکانا ہے۔رہا آسمان تو وہ ایک مقدس اور پاک علاقہ ہے جہاں اللہ کے فرشتے بستے ہیں اور جس کی طرف رُخ کر کے مؤمنین دعائیں کرتے ہیں۔شیطان کی پہنچ اس پاک علاقہ تک نہیں ہے۔جب بھی وہ یہاں پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اور اللہ اور فرشتوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کی سن گن لینے کی جدوجہد کرتا ہے' شہاب ثاقب کے ذریعہ سے مار بھگایا جاتا ہے۔

حضور ﷺ کی بعثت سے قبل بدمعاش قسم کے جن ملأ اعلیٰ کی طرف پرواز کر کے غیب کی باتوں کی سن گن لینے کی کوشش کرتے تھے۔بعض کو تھوڑی کامیابی مل جاتی تھی اور غیب کی بعض باتیں سن لیا کرتے تھے' جنہیں نیچے آکر وہ اپنے مؤکلین کے گوش گزار کیا کرتے تھے۔حضور ﷺ کی بعثت کے بعد جنّوں کو پتہ چلا کہ اب تو آسمان محفوظ چھت کی مانند بنا دیا گیا ہے اور سن گن لینے کی خاطر ملأ اعلیٰ کی طرف پرواز کرنا ممکن نہیں رہا اور نہ ہی غیب کی باتوں کو جاننے کی کوئی سبیل رہی ہے۔اس بات کا اعتراف جنّوں نے یوں کیا ہے۔

وَاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا○ وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا○ (الجن:۷،۹)

اور یہ کہ ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو دیکھا کہ وہ پہریداروں سے پٹا پڑا ہے اور شہابوں کی بارش ہو رہی ہے اور یہ کہ پہلے ہم سن گن لینے کے لئے آسمان میں بیٹھنے کی جگہ پا لیتے تھے مگر اب جو چوری چھپے سننے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنے لئے گھات میں ایک شہاب ثاقب لگا ہوا پاتا ہے۔

اس حفاظت کی کیا شکل ہے؟ حفاظت کا انتظام کس مقام پر کیا گیا ہے؟ پہریدار کہاں متعیّن کئے گئے ہیں؟ ان تفاصیل کے بارے میں نہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کچھ بتایا ہے۔ نہ انہیں جاننے کی کوئی ضرورت ہے اور نہ انسانی عقل ان کا پتہ لگا سکتی ہے۔ ہمارے لئے اتنا جاننا کافی ہے جتنا قرآن وحدیث نے بتایا ہے۔ اس سے زیادہ جاننے کی کوشش کرنا وقت کی بربادی ہے اور حق بات تک رسائی کی کوئی ضمانت بھی نہیں ہے۔

یہ ہے آسمان کو محفوظ چھت بنانے کا مطلب جس کا قرآن میں متعدّد جگہ تذکرہ موجود ہے۔ قرآن وحدیث میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو انسان کے چاند پر پہنچنے کی نفی یا تائید کرے۔ یہ تو ان دنیاوی معاملات میں سے ہے جنہیں خدا نے بندوں کی عقل پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنی عقل اور مصلحت کے مطابق جو چاہیں کریں۔

یہ کوئی دانشمندی کی بات نہ ہوگی کہ ہم بالکل یقین کے ساتھ اس بات کا دعویٰ کریں جس کا تذکرہ قرآن وحدیث میں قطعیّت کے ساتھ نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے مستقبل قریب یا بعید میں چاند پر پہنچنے کی کوشش کامیاب ہو جائے۔ ایسی صورت میں وہ حضرات کیا جواب دیں گے جو چاند پر پہنچنے کی کوشش کو خرافات سے تعبیر کرتے ہیں؟

کسی مصلحت کی خاطر پرانی قبر کو کھولنے کا جواز

سوال: دبئی میونسپلٹی کے چیئرمین کی طرف سے یہ سوال موصول ہوا ہے۔ اختصار کے ساتھ ان کا سوال پیش کر رہا ہوں۔

ان کے سامنے پریشانی یہ ہے کہ دبئی شہر میں زمین کے اندر پانی کے پائپ لائنوں کے بچھانے کا کام زور وشور سے جاری ہے۔ پائپ لائن کو اس مقام سے بھی گزرنا ناگزیر

ہے جہاں پہلے قبرستان ہوا کرتی تھی۔ اب وہاں کوئی قبرستان نہیں ہے اور نہ کوئی ایسی قبر ہے جس کی عمر پچیس سال سے کم ہو۔ بعض فنی مجبوریوں کی بنا پر اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ اس پرانی قبرستان میں پائپ لائن بچھانے کا کام ہو اور اس مقصد کے لئے زمین کھودی جائے۔ اس کام کی خاطر وہاں کی پرانی قبریں کھولنی پڑیں گی۔ سوال یہ ہے کہ عوامی مصلحت کی خاطر اور مجبوری کی حالت میں قبروں کا کھولنا جائز ہے؟

جواب: آپ کا خط ملا، مزید اطمینان کے لئے میں نے انجینئروں کی وہ رپورٹ بھی پڑھی جس میں لکھا تھا کہ بعض فنی مجبوریوں اور عوامی مصلحتوں کے پیشِ نظر پائپ لائن کو قبرستان سے گزارنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ ایسا نہ کیا گیا تو دوسری صورتیں شہر والوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ آپ کا خط، انجینئروں کی رپورٹ اور اس معاملہ میں فقہ کی کتابوں کی طرف رجوع کرنے کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ:

اسلامی شریعت کی رُو سے کسی قبر کو کھولنا اور میت کو وہاں سے نکالنا اور اس زمین سے منفعت حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔ اِلّا یہ کہ ایسا کرنے کے لئے کوئی شرعی عذر موجود ہو۔ شرعی عذر کیا ہو سکتے ہیں۔ مختصراً ان کے بارے میں بتاتا چلوں۔

۱- قبر اتنی قدیم ہو چکی ہو کہ اس بات کا یقین کامل ہو کہ اب اس کے اندر سب کچھ بوسیدہ ہو کر مٹی بن چکا ہے۔ اور اس بات کا تعین کہ سب کچھ مٹی بن چکا ہوگا' تجربہ کار حضرات ہی کر سکتے ہیں۔

۲- قبر کے اندر میّت کو اس قبر کی وجہ سے تکلیف پہنچ رہی ہو مثلاً یہ کہ قبر کی جگہ پر بہت گندگی ہو یا پانی سے بھر گئی ہو یا بہت خستہ حالت میں ہو۔ ایسی حالت میں میّت کو قبر سے نکالنا جائز ہے' تاکہ اسے کسی دوسری بہتر جگہ دفن کیا جاسکے۔

۳- کسی زندہ آدمی کا کوئی حق قبر کے اندر رہ جائے۔ مثلاً قبر کے اندر زندہ شخص کا مال وغیرہ رہ جائے تو دوبارہ اس قبر کو کھولنا جائز ہے' تاکہ اس مال کو برآمد کیا جاسکے۔ فقہاء

نے تو اس بات کو بھی جائز قرار دیا ہے کہ میّت کا پیٹ چاک کیا جا سکتا ہے۔ اس مال کو نکالنے کے لئے جو اس نے نگل لیا تھا۔ (۱۲) اگر کسی ایک زندہ آدمی کے حق کی خاطر قبر کھولی جا سکتی ہے تو عوام کے فائدے کے لئے بدرجۂ اولیٰ کھولی جا سکتی ہے۔

احناف کے نزدیک قبر دوبارہ صرف اسی حالت میں کھولی جا سکتی ہے جب اس کے اندر کسی شخص کا مال رہ جائے چاہے اس کی مالیت ایک درہم ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح کسی نے حق شفعہ میں ایسی زمین خریدی جس میں قبر موجود ہے تو صاحبِ زمین کو اختیار ہے چاہے تو قبر کو برقرار رکھے اور چاہے قبر کھول کر میّت کو دوسری جگہ منتقل کر دے۔ (۱۳)

۴۔ مسلمانوں کی اجتماعی مصلحت کے پیشِ نظر اگر قبر کھولنا اور میّت کو وہاں سے منتقل کرنا ضروری ہو جائے تو اجتماعی مصلحت کی خاطر ایسا کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ اسلامی شریعت کا یہ اصول ہے کہ اجتماعی مصلحت کسی ایک شخص کی مصلحت پر مقدّم ہے۔

اس توضیح کے بعد میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے جس قبرستان کا تذکرہ کیا ہے وہاں قبروں کا کھولنا اور اموات کا دوسری جگہ منتقل کرنا دو اسباب کی وجہ سے جائز ہے۔

۱۔ پہلا سبب یہ ہے کہ آس پاس کی زمینوں پر عمارتوں کی تعمیر کی وجہ سے وہاں کا بہت سارا گندا پانی قبرستان کی زمین کو متاثر کر رہا ہے جس سے گندگی اور بدبو پھیلنے کا قوی امکان ہے۔ مُردوں کو اس سے تکلیف ہو سکتی ہے۔ ابنِ قدامہ اپنی کتاب ''المغنی'' میں لکھتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے قبر کھولنے اور میّت کو وہاں سے منتقل کرنے کے بارے میں سوال کیا گیا تو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ اگر میّت کو وہاں تکلیف ہو رہی ہو تو ایسا کیا جا سکتا ہے۔ مزید فرمایا کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایسا کیا تھا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھا گیا جو گندی جگہ دفن کر دیئے گئے تھے۔ آپ نے انہیں منتقل کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ (۱۴)

بخاری شریف کی روایت ہے کہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اپنے والد کو اُحد کی جنگ کے بعد کسی دوسرے صحابی کے ساتھ ایک ہی قبر میں دفن کر دیا۔ لیکن انہیں یہ بات اچھی

نہیں لگی۔ چنانچہ چند مہینہ کے بعد حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے وہ قبر کھولی تا کہ اپنے والد کو دوسری جگہ دفن کرسکیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ وہ میّت اسی حالت میں تھی جیسے آج ہی اسے دفن کیا گیا ہو۔ اسی طرح طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ جو کہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں ان کی بیٹی عائشہ رضی اللہ عنہا نے خواب میں دیکھا کہ ان کے والد کو قبر میں تکلیف ہو رہی ہے۔ چنانچہ تیس سال کے بعد انہوں نے اپنے والد کی قبر کھولی اور انہیں دوسری جگہ دفن کر دیا۔(۱۵)

۲- دوسرا سبب یہ ہے کہ اجتماعی مصلحت اور عوام کو کسی نقصان سے محفوظ رکھنے کی خاطر قبروں کا کھولنا اور اموات کو منتقل کرنا ضروری ہو گیا ہے اور شرعی اعتبار سے اجتماعی مصلحت بہرحال مقدم ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں مدینہ منوّرہ میں نہر کھودنے کے لئے بعض شہداء کی قبریں کھلوائی تھیں اور انہیں دوسرے مقام پر منتقل کر دیا تھا۔ شہداء کے جسم بالکل تروتازہ تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس عمل پر کسی صحابی نے تنقید نہیں کی۔(۱۶)

ان دو اسباب کی بنا پر آپ کا ان قبروں کو کھولنا اور مردوں کو وہاں سے منتقل کرنا جائز ہے۔ تاہم چند باتوں کا خیال رہے۔

۱- صرف وہی قبریں کھولی جائیں جن کی عمر ۲۵ سال سے زائد ہو۔ اِلّا یہ کہ ان سے کم عمر قبروں کا کھولنا ضروری ہو۔

۲- کام کرنے والے اس بات کا پورا خیال رکھیں کہ کوئی ہڈی نہ ٹوٹے۔ کیونکہ ابوداؤد کی روایت ہے:

کَسْرُ عَظْمِ الْمَیِّتِ کَکَسْرِ عَظْمِ الْحَیِّ

میت کی ہڈی توڑنا زندہ شخص کی ہڈی توڑنے کی طرح ہے۔

۳- جو ہڈیاں جمع ہوں انہیں پوری عزت واحترام کے ساتھ علماء ومشائخ کی زیرنگرانی کسی دوسری جگہ منتقل کر کے دفن کر دیا جائے۔

تصوّف اور صوفیوں کی حقیقت

سوال: (۱۷) تصوّف کی حقیقت کیا ہے؟ اسلام کا تصوّف کے متعلق کیا موقف ہے! لوگ کہتے ہیں کہ صوفیوں میں سے بعض نے اپنے علم وعمل سے اسلام کی خدمت کی ہے اور بعض نے بدعات وگمراہیوں کے ذریعہ سے اسلام کو نقصان پہنچایا ہے۔ ان دونوں قسم کے صوفیوں میں کیا فرق ہے؟ ہمارے بعض دوست تصوّف اور صوفیوں کے سخت مخالف ہیں جبکہ بعض ان کے زبردست مدّاح ہیں۔ امید ہے کہ آپ تصوّف اور صوفیوں کی حقیقت پر تشفی بخش روشنی ڈالیں گے۔

جواب: تصوّف ایک ایسا نظریۂ زندگی ہے جس کا وجود تقریباً سارے مذاہب میں ہے۔ ہندوستان میں ہندوؤں میں جوگی پائے جاتے ہیں جو روحانیت کی تربیت کا بہت زیادہ اہتمام کرتے ہیں اور اسی تربیت کی خاطر اپنے جسموں کو مختلف طریقے سے عذاب واذیت دیتے ہیں، عیسائیوں میں بھی رہبانیّت نے جنم لیا جس کا تذکرہ سورہ حدید کے آخر میں ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی مذمّت کی ہے اس طرح یونان وفارس میں بھی اس قسم کے رجحانات پائے جاتے تھے۔

تصوّف درحقیقت روحانیت کے اہتمام کا نام ہے۔ اس تصوّف کی بنیاد یہ ہے کہ روحانیت کے ذریعہ سے انسان کی تربیت ہوتی ہے۔ اس میں مادی اور جسمانی ضرورتوں کا زیادہ اہتمام نہیں کیا جاتا۔ روحانیت کے اس اہتمام میں کبھی اتنا غلوّ ہو جاتا ہے کہ صاحبِ تصوّف اپنی جسمانی اور مادی ضرورتوں کو یکسر فراموش کر دیتا ہے۔

جب اسلام آیا تو اس نے لوگوں کو روحانی زندگی اور مادی زندگی کے درمیان توازن (Balance) کی تعلیم دی۔ اسلام کی نظر میں انسان روح، جسم اور عقل کا مجموعہ ہے۔ اور یہ ضروری ہے کہ ان میں سے ہر ایک پہلو پر کما حقہٗ توجہ دی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ نے جب دیکھا کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کسی ایک پہلو سے غفلت برت رہے ہیں تو آپ ﷺ نے ان کی سرزنش کی۔ روایت ہے کہ جب حضور ﷺ کو خبر ملی کہ

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ رات رات بھر نمازیں پڑھتے ہیں اور سوتے نہیں ہیں۔ ہر دن روزہ رکھتے ہیں اور بیویوں کے پاس جانا چھوڑ دیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی سرزنش کی اور فرمایا:

یَا عَبْدَ اللّٰهِ! اِنَّ لِعَیْنِكَ عَلَیْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِاَهْلِكَ عَلَیْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَیْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِبَدَنِكَ عَلَیْكَ حَقًّا فَاَعْطِ كُلَّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّهٗ

اے عبداللہ! تم پر تمہاری آنکھوں کا حق ہے۔ تمہارے گھر والوں کا حق ہے۔ تمہاری بیویوں کا حق ہے۔ تم پر تمہارے بدن کا حق ہے۔ تمہیں چاہیے کہ ہر صاحبِ حق کو اس کا حق ادا کرو۔

بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے بارے میں دریافت کیا اور اس کے بعد ان میں سے ایک نے عہد کیا کہ وہ تازیست روزہ رکھیں گے، دوسرے نے عہد کیا کہ وہ تمام راتیں نماز پڑھیں گے اور سوئیں گے نہیں، تیسرے نے عہد کیا کہ وہ کبھی شادی نہیں کریں گے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کر کے خطبہ دیا اور فرمایا:

اَمَا اِنِّیْ اَعْلَمُكُمْ بِاللّٰهِ وَاَخْشَاكُمْ لَهٗ. وَلٰكِنِّیْ اَقُوْمُ وَاَنَامُ وَاَصُوْمُ وَاُفْطِرُ وَاَتَزَوَّجُ النِّسَآءَ فَمَنْ رَّغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ.

میں تم سے زیادہ اللہ کو جانتا ہوں اور تم سے زیادہ اس سے ڈرتا ہوں۔ پھر بھی میں رات کی تنہائی میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور روزہ بھی رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔ اور عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں۔ جو بھی میری سنّت سے روگردانی کرے گا' وہ مجھ سے نہیں ہے۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اسلام زندگی کے تمام پہلوؤں میں توازن اور اعتدال کا حکم دیتا ہے۔ اس توازن اور اعتدال کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی قائم رکھا اور آپ کے بعد سلفِ صالحین نے بھی یہی روش اختیار کی۔ اس کے بعد وہ دور آیا جب اللہ نے

مسلمانوں کو خوشحالی سے نوازا۔ ان میں دولت عام ہوئی۔ مال و دولت کی فراوانی کے ساتھ ساتھ علم و ہنر کا بازار بھی گرم ہوا اور لوگوں کا رجحان علم و عقل کی باتوں کی طرف مائل ہوا۔ ان تبدیلیوں کے نتیجہ میں مسلمانوں کے اندر مختلف فرقے وجود میں آئے۔ ایک وہ فرقہ تھا جس نے مال و دولت کو خاص اہمیت دی اور زندگی کے مادی پہلوؤں میں گم ہو گیا۔ دوسرا فرقہ علم و عقل کے کارناموں میں اتنا محو ہوا کہ ان کی عقلوں نے بعض ایسے علوم کی اختراع کی جو اصل اسلامی تعلیمات سے دور تھے مثلاً علمِ کلام وغیرہ۔ اسی طرح فقہاءِ کرام فقہِ شریعت کی بحثوں میں ایسے اُلجھے کہ انہوں نے دین کے روحانی اور باطنی پہلو کو فراموش کر کے ساری محنت ظاہری اور جسمانی پہلوؤں کی نذر کر دی۔

اس معاشرہ میں ایسا کوئی نہیں تھا جو روحانی اور باطنی پہلوؤں کی طرف توجّہ کرتا اور روحانیت کی تعلیم دیتا۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے علماءِ کرام کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آیا جنہوں نے دین کے روحانی پہلوؤں پر توجّہ مرکوز کی اور روحانیت کا طریقہ اپنایا۔ اسی طریقے پر چل کر اپنی اصلاح کی اور لوگوں کو بھی اس کی طرف دعوت دی۔ یہ طبقہ صوفیائے کرام کا طبقہ تھا۔ ان کی تعلیم یہ تھی کہ زُہد کے ذریعہ سے مادیت سے دامن بچا کر اور اپنے نفس کے ساتھ مجاہدہ کر کے اپنے آپ کو اللہ کی ناراضی اور جہنم کی آگ سے بچایا جائے۔ ان کی تعلیم یہ تھی کہ سب سے پہلے انسان اپنے باطن کی اصلاح کرے۔ اپنے اندر سے نفسیاتی بیماریوں اور آلائشوں کو دور کرے اور دل کی دنیا کو روحانیت سے آباد کرے۔ چنانچہ اس طبقہ کی ساری دوڑ بھاگ روحانیت کی تربیت کے لئے تھی۔ ان میں سے بعض نے اللہ کے خوف کو مستحضر کرنے کے لئے اسے جسمانی شباہت بخشی، مثلاً حسن بصری جو کہ ایک معروف تابعی ہیں۔ بعض نے اپنے تمام اعمال کی بنیاد اللہ کی محبت کو قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم اللہ کے دیوانے ہیں۔ ہم نیک اعمال جنت پانے یا جہنم سے بچنے کے لئے نہیں کر رہے ہیں، بلکہ اللہ کی محبت میں کر رہے ہیں مثلاً رابعہ العدویۃ اور ذوالنون مصری۔

شروع دور کے صوفیائے کرام نیک و صالح اور قرآن وسنّت کی اتباع کرنے

والے تھے۔ چنانچہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ جو کہ زبردست صوفی تھے کہا کرتے تھے کہ انسان کے لئے ہر راستہ بند ہے سوائے اس کے جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی۔ ابو یزید کہا کرتے تھے کہ اگر تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ اپنی کرامات کی وجہ سے ہوا میں اڑ رہا ہے تو تم اس سے اس وقت تک متاثر نہ ہونا جب تک تم یہ یقین نہ کرلو کہ وہ شریعتِ اسلامیہ کا کس قدر محافظ......اور اس پر عمل پیرا ہے۔

ایسے تھے شروع دور کے صوفیائے کرام' لیکن ان کے بعد ان صُوفیہ کا وجود ہوا جنہوں نے روحانیت اور روحانی تربیت میں غلو کا راستہ اختیار کیا۔ ان میں روحانیت کے حوالہ سے اور اس کے نام پر مختلف قسم کی خرافات اور بدعات در آئیں۔ ان میں سب سے بڑا خرافاتی فلسفہ تھا وحدۃ الوجود کا جس کا موجد محی الدّین ابنِ عربی تھا۔ اس فلسفہ میں اس نے یہ عقیدہ پیش کیا کہ اللہ تعالیٰ دنیا کی ساری چیزوں میں جلوہ فگن ہے۔ ہر چیز میں اللہ موجود ہے۔ یہاں تک کہ اسے بتوں اور پتھروں میں بھی خدا نظر آتا تھا۔

ان میں سے بعض نے اپنے ذوق، اپنی وجدانی کیفیت اور اپنے تخیلات کو شارع کا درجہ دیا۔ یعنی ان کی وجدانی کیفیت اور ان کے تخیّلات نے جو بات کہہ دی وہ گویا شریعت بن گئی' جس پر عمل ضروری ہے۔ وہ کہتے تھے کہ میرے دل نے میرے رب سے بات کی اور میرے رب نے میرے دل کو فلاں بات بتائی۔

ان میں ایسے پیر ظاہر ہوئے جنہوں نے اپنے مریدوں کو اتنا کمتر بنا دیا گویا ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ پیر نے جو کہا مرید کو اس پر لازماً عمل کرنا ہے۔ اسے یہ حق حاصل نہیں کہ پیر سے کیوں اور کیسے سوالات کرے۔

ان غلط نظریات نے مسلمانوں میں ایک ایسے طبقہ کو جنم دیا جو عملی طور سے بالکل ہی مفلوج طبقہ تھا۔ زہد اور فقیری میں اس طبقہ نے اتنا غلوّ کیا کہ دنیا کو ترک کر دیا۔ صوفیوں کے اس طبقہ کو ہم گمراہ قرار دیتے ہیں۔

مختصراً یہ کہ ان صوفیہ میں ایسے بھی تھے جنہوں نے کتاب وسنّت پر سختی سے عمل کیا

اور کچھ دوسرے ایسے بھی تھے جو راہِ راست سے منحرف ہو گئے۔ ہمارے لئے قابلِ تقلید وہ تصوّف ہے جو راہِ راست سے منحرف نہیں ہے اور جس کی طرف صالح صوفیائے کرام نے دعوت دی' یعنی قرآن سنّت پر سختی سے عمل کرنا۔ دنیاوی زندگی کے فتنوں سے حتی الامکان اجتناب کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی محبت کو دل میں جاگزیں کرنا اور دل کو نفسیاتی آلائشوں سے پاک کرنا' تاکہ شیطان اس طرف رُخ نہ کرے۔ یہ ہے تصوّف کا روشن پہلو جو قابلِ تقلید ہے۔ رہا تصوّف کا وہ رُخ جو راہِ راست سے منحرف ہے تو وہ یقیناً قابلِ مذمت ہے اور کسی قیمت پر لائق عمل نہیں ہے۔

اہلِ تصوّف کے سلسلہ میں ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت عمدہ بات کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اہلِ تصوّف کے سلسلہ میں لوگ مختلف رائے رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اہلِ تصوّف کے طبقہ سے وہ لوگ تعلّق رکھتے ہیں جن کی ہر سعی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لئے ہے اور جن کا مقصد اللہ کا تقرّب حاصل کرنا ہے۔ تاہم کچھ ایسے بھی ہیں جن کی نسبت اہلِ تصوّف کی طرف کی جاتی ہے' حالانکہ وہ اللہ کے نافرمان ہیں۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

حواشی وحوالہ جات

(۱) طبرانی کی روایت ہے۔ حافظ ابن حجر نے اسے حسن قرار دیا ہے۔

(۲) علامہ یوسف القرضاوی اور دوسرے اکابرینِ ملت کی نگرانی میں قطر میں دو ایسے بینک موجود ہیں جن میں اسلامی معاشی نظام قائم ہے اور سودی کاروبار بالکل نہیں ہوتا ہے۔ جب سے یہ بینک وجود میں آئے ہیں الحمدللہ ہر سال حیرت انگیز ترقی کررہے ہیں۔

(۳) احیاء علوم الدّین، ج ۳ص ۱۳۷-۱۳۹

(۴) بخاری شریف کی روایت ہے۔

(۵) مطالب اولی ج ۶ص ۲۱۸

(۶) مفتاح دار السعادۃ۔ ج ۲ص ۲۴

(۷) فتح الباری ج ۱۳ص ۲۲۲

(۸) ابنِ ماجہ کی روایت ہے۔

(۹) آج کے مہذب دور میں بھی عملاً یہی ہو رہا ہے۔ یورپ اور امریکہ کی تمام سرگرمیاں چیخ چیخ کر کہہ رہی ہیں کہ اے مسلمانو! اپنے دین سے نکل کر مسیحیت قبول کرلو ورنہ تباہ و برباد ہونے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

(۱۰) اور حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں جہاد کی یہی حکمت و مصلحت ہے جسے علماءِ کفار نے ایک ہوّا بنا کر رکھ دیا ہے۔

(۱۱) دارمی کی روایت ہے۔ مشکوٰۃ المصابیح میں یہ حدیث درج ہے۔ شیخ البانی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ امام احمد نے بھی اسی معنیٰ میں دوسری حدیث بیان کی ہے اور اس کی سند کو جید قرار دیا ہے۔

(۱۲) الدرّ المختار ج ۱ص ۸۳۹

(۱۳) ایضاً

(۱۴) المغنی ج ۲ص ۴۲۵

(۱۵) المجموع للنووی۔ ج ۲ص ۲۰۳

(۱۶) فتاویٰ ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ۔ ج ۱ص ۱۴

(۱۷) اصل کتاب میں اگلا سوال بھی تصوّف اور صوفیوں سے متعلق ہے۔ سوال یکساں ہونے کی وجہ سے اس کا جواب بھی تقریباً یکساں ہے۔ اختصار کی خاطر میں نے دونوں سوالوں اور ان کے جوابات کو یکجا کر دیا ہے۔

ہماری مقبول مطبوعات

فتاویٰ یوسف القرضاوی (جلد دوئم)	ڈاکٹر یوسف القرضاوی
اسلامی نظام (ایک فریضہ۔ایک ضرورت)	ڈاکٹر یوسف القرضاوی
امت مسلمہ کیلئے سلامتی کی راہ	ڈاکٹر یوسف القرضاوی
فقہ الزکوٰۃ	ڈاکٹر یوسف القرضاوی
اسلامی زندگی	ڈاکٹر محمد علی ہاشمی
الروح والریحان	محمد وقاص
خلیفۃ الرسولؐ	طالب ہاشمی
تیس پروانےؓ	طالب ہاشمی
چالیس جاں نثارؓ	طالب ہاشمی
ہمارے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم	طالب ہاشمی
تذکارِ صحابیات	طالب ہاشمی
سو شیدائی	طالب ہاشمی
ستر ستارےؓ	طالب ہاشمی
پچاس صحابہؓ	طالب ہاشمی
سیرتِ فاطمہؓ	طالب ہاشمی

ISBN: 978-969-8419-40-7

البدر پبلی کیشنز

23۔ راحت مارکیٹ اردو بازار لاہور

Ph: 042-37225030 37245030

Mob: 0300-8485030